

”آج جو دنیا داری کی آخری رسم تھی۔ سو وہ بھی پوری ہو گئی آج چہلم بھی ہو گیا اور مرے ہوؤں کے ساتھ بھلا کوئی کب مرا ہے۔ دنیا کے سب سلسلے یونہی چلتے رہتے ہیں بس جانے والوں کا ہی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ سکندر جیسا بھائی اور شہلا جیسی بھابھی بھلا بھلائے جانے والے لوگ ہیں، اتنے ملنسار، اتنی محبت کرنے والے، سب کا سب موقعوں پر خیال کرنے والے، اتنی جلدی ہم سے منہ موڑ گئے کہ یقین نہیں آتا ابھی تک یوں تو ہماری ساری زندگی کو جیسے ویران کر گئے ہیں اور اگر سانس لینے کا نام ہی زندگی ہے تو ہم واقعی زندہ ہیں۔“

تیا جی کی ڈوبتی ابھرتی آواز ان کے دلی غم اور دکھ کی غمازی کر رہی تھی۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر چپ کر گئے۔

”صحیح کہتے ہیں بھائی صاحب آپ! نہ ان کی زندگی بھلائی جاسکتی ہے نہ موت۔ اتنی خوش باش خوشگوار محبت بھری زندگی انہوں نے گزاری اور ایسی جواں مرگی میں اٹھ گئے کہ پھر بھی ایشک بار تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت خاص میں جگہ دے ہم تو اب یہی کر سکتے ہیں۔“ انکل جمال کی آواز غم آلود تھی۔

”آمین، ہم سب کی تو اب یہی دعا ہے۔ ان کے فانی وجود تو اس دنیا سے ختم ہو گئے، لیکن جو نشانیاں وہ دونوں چھوڑ گئے ہیں۔ ایک طرح سے خدا کے بعد ہماری امان میں ہیں۔ خدا ہمیں روز قیامت ان کے سامنے سرخرو ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔“

## رُخسانہ نگار عدنان



تیا جی کی آواز خاصی مدہم تھی، مگر کمرے میں اس قدر خاموشی تھی کہ دو سرے کمرے کی کھڑکی سے چپکی ایمن بھی ان کی آواز بخوبی سن سکتی تھی۔

”اگر دونوں میں سے ایک بھی زندہ رہتا تو یہ مسئلہ کبھی نہ اٹھتا۔ ماں یا باپ خود ہی بچوں کو اپنے پروں میں سمیٹ کر بیٹھ جاتا، ہمیں یہ فکریں نہ ہوتیں۔“

”ہوں تو یہی تو سارا مسئلہ ہے۔“ تیا جی کی ”ہوں“ خاصی طویل معنی خیز اور دردناک تھی۔ سفینہ پھوپھو نے ایک ناگوار سی نظر ان پر ڈال کر ذرا سا رخ پھیر لیا۔

”اب یہ تو ظاہر ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس قدر خوشحال نہیں کہ سب بچوں کی ذمہ داری اٹھا سکے اگر اٹھا بھی لے تو اس سے عمدہ بر آہونا کوئی آسان کام ہے، سب ہی ماشا اللہ سے فیملی والے ہیں۔ میرے حالات بھی آپ لوگوں کے سامنے ہیں ورنہ میں ہی سب کو سمیٹ لیتا۔“ انہوں نے ایک لمحے کو سب کی طرف دیکھا۔

”مہنگائی آسان سے باتیں کر رہی ہے بھائی صاحب! اور بچے بھی ماشا اللہ ایک دو نہیں اکٹھے چار ہیں، جانے والے تو چلے گئے اصل امتحان تو اب ہمارا شروع ہوا ہے یہاں تو اپنے گھروں کے اخراجات سر اٹھانے نہیں دیتے



اوپر سے یہ ذمہ داریاں۔ عاکف چچا کا لہجہ کچھ بیزار سا تھا۔

”ہوں“ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ ہم یہ ذمہ داریاں بانٹ لیتے ہیں ویسے بھی سفینہ کی پرسوں صبح کی فلائٹ ہے۔ اس لیے سب کچھ آج ہی طے ہو جانا چاہیے، ٹھیک ہے سکندر بڑا اچھا گھر چھوڑ کر گیا ہے اور بینک میں بھی کچھ رقم موجود ہے، پھر کچھ حساب اس کے بینک والوں کی طرف سے بھی نکلتا ہے، اتنا ہے کہ مل ملا کر بچوں کی اچھی پرورش ہو سکتی ہے لیکن سب کچھ پیسہ ہی نہیں ہوتا اصل ضرورت تو اچھے سرپرست کی ہے جو ان بچوں کی اچھی تربیت کر سکے، اب انہیں فی الحال اس گھر میں بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔ بچے چھوٹے ہیں ابھی اور پھر اگر کچھ بڑے بھی ہوتے تو بھی بڑی تینوں تو بچیاں ہی ہیں ماموں تو ابھی بہت چھوٹا ہے اور آج کل کون سا زمانہ ہے یوں بچیوں کے تنہا رہنے کا اس لیے میں نے سوچا ہے۔“

انہوں نے ذرا رک کر سب کے چہروں کے تاثرات دیکھے سب ہی ان کی طرف متوجہ تھے۔

”ہم چاروں ایک ایک بچے کی ذمہ داری اٹھا لیتے ہیں۔“ اور کھڑکی سے چپکی ایمن لرز کر رہ گئی ”گھر کرائے پر اٹھا دیتے ہیں۔ ان کے بڑے ہونے پر جتنا کرایہ اکٹھا ہو گا بینک میں وہ ان کی شادیوں پر لگا دیں گے کیا خیال ہے آپ لوگوں کا۔؟“ انہوں نے بات مکمل کر کے از سر نو سب کا جائزہ لیا۔

”ہوں خیال تو اچھا ہے مجھے پسند آیا ہے۔ اس طرح سب بچوں کو انفرادی توجہ اور محبت بھی مل جائے گی اور ان کی جائیداد بھی محفوظ رہے گی کل کو ان کے کام آئے گی اور ہم میں سے کسی پر کوئی بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔“ سفینہ پھوپھو سب سے پہلے بولیں۔

”لیکن کیا اس طرح بچوں کے ذہن ڈسٹرب نہیں ہوں گے، کہاں تو ماں باپ کے ساتھ سب اکٹھے رہتے تھے اور کہاں اس طرح سے انہیں ایک دوسرے سے اور دور کر دینا جبکہ ابھی ان کے زخم بھی ہرے ہیں۔ ایک تو ماں باپ کی جدائی اوپر سے ایک دوسرے سے دوری اور بچے تو پھول کی طرح تازک ہوتے ہیں۔ دونوں میں ملنا جانیں گے پھر سکندر اور شملہ کے بچے، جنہوں نے اپنے بچوں کو بھی لہجے کی گرم ہوا بھی نہیں لگائی تھی، اب ایک دم ان کو ایک دم سے دوریوں کی دونوں طرف میں جھونک دیا جائے میرا تو خیال ہے یہ مناسب نہیں۔“ انکل جمال کچھ ناگواری سے بولے۔

”ہاں تو بچے اب اتنے بھی بچے نہیں ہیں کہ موت کا مفہوم نہ سمجھ سکیں، یہ تو انہیں بھی پتا ہے کہ جو ایک بار چلا جاتا ہے دوبارہ نہیں آسکتا، اب ان کے ماں باپ تو آنے سے رہے اور یہ زخم انہیں قدرت نے لگایا ہے، ہم نے نہیں، ہم تو ظاہر ہے ان کی بھلائی کے لیے سب کچھ کر رہے ہیں اب چاروں کو اکٹھا رکھنے کا مطلب ہے کہ ہم میں سے کسی ایک پر ساری ذمہ داری ڈال دی جائے اور بھی صاف بات ہے کم از کم میں اکیلا تو اتنی بھاری ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔“

عاکف چچا کا لہجہ اور انداز بہت کچھ سمجھا دینے والا تھا۔

”خیر، اگر اٹھانا چاہو تو اٹھا بھی سکتے ہو، سرائکس کی فیکٹری ہے، مل ہے کپڑے کی، اور کئی کنال کا اتنا بڑا گھر ہے اور ایک ہی تو بیٹی ہے تمہاری، اور ایسا کرنا میرے خیال میں تمہارے لیے زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔“ انکل جمال نے جتاتے ہوئے کہا۔

”سرائکس کی فیکٹری اور مل میری نہیں میری بیوی کی ہے، یہ سب آپ کو بھی پتا ہے اور فیکٹریوں والے بھی محنت کرتے ہیں، اسمگلنگ نہیں کرتے نہ ان کی فیکٹریوں میں نوٹ بنتے ہیں، کپڑے کو فیکٹری آئے ہیں مگر ہاتھ ایک تنخواہ دار ملازم سے زیادہ کچھ نہیں آتا، آئے دن مزدوروں کے مطالبات اور ہڑتالیں، اوپر سے گورنمنٹ کے نئے نئے ٹیکس ہمارے پاس بچتا ہی کیا ہے، جیسے ہم لوگ زندگی گزارتے ہیں یہ ہم ہی جانتے ہیں آپ کو تو چاہے گورنمنٹ ڈوبے

چاہے تیرے، پہلی کی پہلی تنخواہ مل ہی جانی ہوتی ہے۔ یہ عذاب تو ہم جیسوں کے لیے ہے خود چاہے مر مر کر جیو، در کر ز کو تنخواہیں دینا ہی پڑتی ہیں اور ٹیکس سے بھلا کون بھاگ سکتا ہے، اوپر سے اس وقت جو بزنس کا حال ہے سب کے سامنے ہے بین الاقوامی بحران آیا ہوا ہے بزنس ورلڈ میں۔“

عاکف چچا کی دکھتی ہوئی رگ پر جیسے کسی نے ہاتھ رکھ دیا، وہ ہر بزنس مین کی طرح اپنے دکھڑے بلا ٹکان سنانے لگے۔

”اگر ایسی ہی ہماری قوم ٹیکس دینے والی ہوتی تو آج ملک کی ترقی کا یہ عالم نہ ہوتا، اور مزدور طبقہ اتنا ہی آپ لوگوں کی اعلا ظنی سے فیض یاب ہو رہا ہوتا تو بھوک اور تنگ کا یہ عالم نہ ہوتا۔“ جمال انکل بھی بچہ تھے وہ کہاں ہارنے والے تھے۔

”اس ملک کی حکومتوں کو تو عادت پڑی ہوئی ہے، ہر وقت دیوالیہ ہونے کا وادیا کرنے کی اور عوام اس سے زیادہ ڈھونگی۔ جتنا دے دو ان کی جھولیاں بھرتی ہیں نہ نیتیں۔“ عاکف چچا نخوت بھرے لہجے میں بولے۔

”یہ کیا فضول کی بحث لے کر بیٹھ گئے تم لوگ۔ اس وقت یہ موضوع شروع کرنے کی کیا تکلف بنتی ہے۔ بھلا فضول میں ہونہ۔“ تایا جی غصے میں آگئے۔ ”بات کچھ ہو رہی تھی۔ یہ دونوں پتا نہیں کون سی رائی چھیڑ کر بیٹھ گئے۔“ ان کی بات پر لاؤنچ میں پھر خاموشی چھا گئی۔

”اسی لیے تو کہتا ہوں کہ نہ کسی ایک پر یہ ذمہ داری پڑے نہ کوئی اس قدر تنگ دل ہو کہ بچوں کی زندگی بھی اجین ہو جائے اور اس کی اپنی بھی۔ ہم سب مل بانٹ کر ان ذمہ داریوں کو اٹھا لیتے ہیں اور بظاہر میرے خیال میں اس میں کوئی برائی بھی نہیں، گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے گی۔“ تایا جی نے دھیرے دھیرے اپنا پرسکون لہجہ بحال کرتے ہوئے کہا۔ ”ہر بچوں کے ڈسٹرب ہونے کا سوال آہستہ آہستہ انہیں محبت اور توجہ ملے گی تو خود ہی سب کچھ بھول بھال جائیں گے، اس کے علاوہ کم از کم سال میں ایک دو دفعہ ان کو آپس میں ملوایا جائے تو ان کے ذہن سیٹ ہو جائیں گے۔“

”بھائی جان صحیح کہتے ہیں، میں تو ایگری ہوں ان کی بات سے۔ اس طرح ہر بچے کو انفرادی طور پر توجہ اور محبت مل جائے گی، آخر سب کا ان سے خون کا رشتہ ہے اور کسی پر بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔“

سفینہ پھوپھو نے تایا جی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”بڑا رکھیں بچوں کا۔ ہاں یہ دن بھی آنے تھے میری بہن کے پھولوں جیسے بچوں کی تقسیم ہوگی۔ جائیداد کا بڑا وارہ تو سنا تھا آج ان معصوموں کا بھی۔“ غزالہ آنٹی رونے لگیں۔

”بہت تکلیف دہ حقیقت ہے غزالہ! بلکہ دل پر کاری چوٹ لگتی ہے۔ پر کیا کریں اور کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ سب صورتحال تمہارے سامنے ہے یا ہم لوگ جان بوجھ کر کر رہے ہیں اور پھر ان کو اس گھر میں اکیلا بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا، ساتھ کون رہے گا سب اپنی زندگیوں میں مصروف ہیں اور اس کے علاوہ آج کل کوئی بھروسے کا آدمی ملتا کہاں ہے پھر بچوں کا معاملہ ہے۔ مان لو یہی طریقہ صحیح ہے ان کے حق میں بہتر ہے۔“ تایا جی نے غزالہ کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے غمگین لہجے میں کہا۔

”ظاہر ہے۔ اب اور کوئی صورت بھی تو نہیں۔ بھائی جان میری تو پرسوں صبح کی فلائٹ ہے، زیر کاشارجہ سے تین بار فون آچکا ہے کہ اب ایک دن بھی اور نہ لگانا، پورے ڈیڑھ ماہ سے دونوں بچیوں اور گھر بار کو چھوڑا ہوا ہے میں نے مون کو اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔ میرے بھائی کی نشانی ہے مجھے اپنی جان سے بڑھ کر پیارا ہو گا مون اور پھر میری بچیوں کی محرومی دور ہو جائے گی۔ دونوں کو ہی بھائی کا بڑا ارمان تھا، اللہ نے کسی صورت میں ان کی دعا قبول



سفینہ پھوپھو نے جلدی جلدی اپنا مدعا بیان کیا۔  
 ”اور جو ایمن اور عبیدہ نے اللہ سے دعا میں کر کے مون کو مانگا تھا سفینہ وہ بھول گئیں تم۔“ غزالہ روتے روتے بولیں۔ ”وہ یہ جدائی سہہ لیں گی؟“

سفینہ پھوپھو ایک پل کو چپ رہ گئیں۔  
 ”اب اس کا کیا کیا جاسکتا ہے غزالہ! حکم ربی کو تو کوئی نہیں ٹال سکتا“ اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں ہے یہ سب تو۔“ تایا جی کہتے کہتے چپ ہو گئے۔ ”اب جتنی گہرائی سے اس مسئلے پر سوچو گی اتنا ہی دشوار ہو جائے گا جینا۔“  
 ”تنی دور چلا جائے گا مون۔ بہنیں تو بھائی کی صورت کو ترس جائیں گی۔“

غزالہ نے چہرہ دوڑے سے رگڑا ”آپ عبیدہ کو لے جائیں یا فضہ کو نمون کو بھائی صاحب کے پاس رہنے دیں۔“  
 ”نہیں۔ میں مون کو ہی لے کر جاؤں گی۔ میں نے زبیر سے بات کر لی تھی۔ انہوں نے بھی یہی کہا تھا اور شارچہ کون سا دور ہے میں لے آیا کروں گی مون کو ملوانے یہاں۔ مون تو بنا بنایا سکندر بھائی ہے۔ مجھے بھائی کی صورت نظر آتی رہے گی۔ اسے کسی قسم کی کمی نہیں آنے دوں گی نہ محبت میں نہ توجہ میں اور نہ ضروریات میں۔“ سفینہ نے اپنی بات کو باورزن کیا۔

”ٹھیک ہے پھر مون کو تم لے جاؤ۔ ایمن کے تو اس سال ٹڈل کے ایگزام ہونے والے ہیں ویسے بھی وہ سمجھ دار ہے وہ میرے پاس رہ لے گی فضہ چھوٹی ہے وہ کھلونوں سے اور اچھی چیزوں سے بہل جائے گی۔ عاکف اسے تم لے جاؤ۔ اسے بہت پار و بناوہ سکندر کو بہت پیاری تھی اور بہن بھائیوں میں بھی سب سے زیادہ معصوم اور پیاری ہے۔ اسے خوش نما کھلونوں اور کپڑوں سے بہلاؤ گے تو بہل جائے گی۔“

کہتے کہتے تایا جی کی آواز بھیک گئی لاؤنج میں موجود سب لوگ مزید افسردہ ہو گئے اور کھڑکی سے چکی ایمن کو توہتا بھی نہیں تھا کہ آنسوؤں کی قطاروں نے اس کی قمیص کا سار اگرایا بھگودیا ہے۔

”اور عبیدہ کو غزالہ لے جاتی ہے وہ ذرا شوخ اور شرارتی ہے تمہاری بچیوں کے ساتھ مل کر سلجھ جائے گی آگے جو اللہ کو منظور۔ انسان تو اچھا ہی سوچتا ہے یہ تو آپ کو معلوم ہے نا کیا اچھا ہے یا برا۔ میرا خیال ہے اب تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“ انہوں نے سب کی طرف دیکھا۔

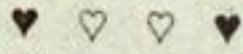
”آپ نے خود ہی کہا کہ ایمن سمجھ دار ہے تو میرے خیال میں اس موقع پر اگر اسے سمجھا کر ساتھ بٹھالیا جاتا تو زیادہ مناسب نہیں تھا۔“ نکل جمال سنجیدگی سے بولے۔

”ایمن سمجھ دار ہے لیکن اب اتنی بھی نہیں۔ تمہیں معلوم ہے جمال وہ اس بات پر پریشان ہو کر یا الجھ کر ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔ میرا خیال ہے وہ یہ سب کبھی برداشت نہیں کرے گی اب یہ سب کچھ خاموشی سے کرنا ہے خود ہی آہستہ آہستہ صبر آجائے گا اور زندگی تو خود سب سے بڑا سمجھوتہ ہے۔ ایمن کو میں سمجھاؤں گا اور باقی تو ابھی چھوٹے ہیں۔ مون اور فضہ تو دوسرے شہروں میں جانے کے خیال ہی سے خوش ہو جائیں گے اب میرا خیال ہے سب کچھ طے ہے سفینہ تو پرسوں جانے لگی اور عاکف کو کل جانا ہے عاکف تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟“

”نہیں بھائی جان جیسی سارا ایسی فضہ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“  
 ”چلو پھر اب سونا چاہیے کافی رات ہو گئی ہے اور سردی بھی زیادہ ہو گئی ہے انیسہ! تم نے سب کے بسترو وغیرہ لگوا دیے ہیں۔“ وہ مڑ کر تائی جی سے بولے۔

”ہاں وہ تو کافی دیر سے لگوا دیے ہیں اب واقعی کافی ٹائم ہو گیا ہے سردیوں کے دس بھی تو دھی رات کے برابر ہوتے ہیں میرا خیال ہے اب اٹھتے ہیں۔“

وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں تو سب ان کی تقلید میں سست روی سے باہر نکل گئے۔



وہ شام ان کی زندگیوں کی یادگار شام بن گئی اگر اس حسین شام کا اختتام اتنی بھیا تک شکل میں نہ ہوتا تو بھی وہ شام ان کی یادوں کا ایک خوبصورت حصہ ہوتی جیسی اب تک کی زندگی کا ہر دن اور ہر شام خوبصورت اور یادگار تھی۔  
 فضہ کی آنکھیں سالگرہ تھی جس کی تیاریاں کتنے دنوں سے جاری تھیں کچھ تو پچھلے ماہ پایا کی پر موشن ہوئی تھی۔ دوسرے ماما نے اسی ماہ سارے گھر میں از سر نو پینٹ کروایا تھا۔ ڈرائنگ روم سمیت سب کمروں کے پردے بدلے تھے۔ سارے گھر کی سیٹنگ نئے انداز میں کی تھی۔ کاریڈور میں کاریٹ ڈلوایا تھا۔ سارے فرنیچر کو پولش کروایا تھا۔ ٹی وی لاؤنج کالی وی ماما نے اپنے بیڈ روم میں رکھ لیا تھا اور ٹی وی لاؤنج کے لیے نیا خوبصورت چوبیس انچ کالی وی خرید ا تھا۔ چھوٹے سے لان میں بہت خوبصورت پودوں اور پھولوں کے گملوں کا اضافہ ہوا تھا۔ سارے گھر کا جیسے نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کے ایک ایک انچ سے ماما پایا کی محبت اور اس محبت کی خوشبو مہک رہی تھی۔

سالگرہ کے لیے سب بچوں کے کپڑے بھی تو نئے نئے تھے خود ماما نے اپنے لیے رائل بلو کلر کی ساڑھی بنوائی تھی جس کے بارڈر پر گولڈن کام تھا اور پیانے بھی نیا بلو کلر کا نوپیس بنوایا تھا دونوں ہی ان ڈریسز میں بہت اسماٹھ اور ہینڈ سم لگ رہے تھے۔ ان کا پیل یوں بھی پورے خاندان میں سب سے زیادہ خوش باش اور اسماٹھ پیل سمجھا جاتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کبھی معمولی سی لڑائی جھگڑا تو کیا ذرا سی تو تکرار بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایک دوسرے کا احترام ان کی عائلی زندگیوں کا سب سے پہلا اور ٹھوس اصول تھا پایا کہتے تھے۔

”محبت تو ہر میاں بیوی میں قدرتی طور پر ہونی چاہی ہے اگر باہمی احترام نہ ہو تو یہ محبت بھی پانی کے بلبلے کی طرح ہوتی ہے جس کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ یہ باہمی احترام ہی دونوں کو ایک دوسرے کے احساسات کا خیال رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ جس سے محبت بڑھتی ہے۔ اسی لیے وہ ماما کا ان کی ہر بات کا بہت احترام کرتے بہت خیال رکھتے تھے اگرچہ اس بات کو ان کے اپنے بہن بھائی ستائش کی نظر سے نہ دیکھتے تھے وہ اس بات کو ”زن مریدی“ میں شمار کرتے تھے مگر پایا نے کبھی پروا نہیں کی تھی وہ دونوں ایک دوسرے میں مگن اپنے گھر اور بچوں کے ساتھ بہت خوشحال اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔

انہوں نے یہ گھر بھی بہت سالوں کی محنت سے بنایا تھا جب تایا جی نے انہیں ان کا حصہ دے کر آبائی گھر سے الگ کیا تھا۔ اس وقت ایمن فقط دو سال کی تھی پایا نے اسی پیسے سے پلاٹ خریدا اور خود نو سال تک کرائے کے گھر میں رہ کر اس پلاٹ پر یہ خوبصورت خوابوں کا محل تعمیر کیا تھا اور اس جدوجہد میں ماما نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ انہوں نے کئی سال ایک انگلش میڈیم اسکول میں پڑھایا تھا۔ ٹیوشنز بھی کی تھیں۔ گھر میں کئی کئی دن گوشت نہیں پکاتا تھا۔ بچوں کے بہت اچھے کپڑے نہیں بنتے تھے۔ رشتہ داروں سے ملنا ملنا بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ رشتہ داروں سے میل ملاپ یونہی تو نہیں برہمایا جاتا۔ لیکن دین رشتہ داری کا پہلا تقاضا ہوتا ہے اور وہ دونوں اس تقاضے کو نبھانے سے قاصر تھے۔ اس لیے انہوں نے تقریباً ”سب سے کنارہ کر لیا تھا صرف قریبی عزیزوں سے خاص خاص موقعوں پر ملنے تھے پایا بینک میں جاب کرتے تھے اور پھر شام کو ایک پرائیوٹ فرم میں پارٹ ٹائم جاب بھی کرتے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے آٹھ نو سالوں کی طویل اور کٹھن جدوجہد کے بعد ان کا گھر مکمل ہو گیا تھا۔ وہ ادھر شفٹ ہو گئے ادھر شفٹ ہونے کے بعد بھی گھر میں کافی کام ہوتا رہا تھا۔

اگرچہ مشکل سے مشکل وقت میں بھی ماما پایا نے ان بچوں میں سے کسی کی سالگرہ نظر انداز نہیں کی تھی خواہ ایک پونڈ کا کیک خرید کر کیوں نہ اس موقع کو سیلیبریٹ کیا جا نا وہ ان مواقع کا خاص خیال رکھتے تھے اور اب تو قدرت



نے فراغت اور خوشحالی دونوں سے نوازا تھا تو وہ کیوں اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے خوشی نہ مناتے۔  
سب کو بلایا تھا پیانے حتیٰ کہ لاہور سے عاکف چچا کو بھی بلایا تھا اور تو اور سفینہ پھوپھو کو تین چار بار فون کر کے  
انوائٹ کیا تھا اور غزالہ آئی تو خیر ہر دفعہ ہی آیا کرتی تھیں۔ حیدر آباد کون سا کراچی سے بہت دور تھا اور سب نے  
آنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

اور حیرت انگیز طور پر سب نے وعدہ ایفا بھی کیا۔ اس شام واقعی سب ایک مدت بعد اکٹھے ہوئے تھے سب سے  
بڑھ کر سفینہ پھوپھو آگئی تھیں۔ عاکف چچا جو پورے خاندان میں مشہور تھے کہ وہ اپنی بیوی کی اجازت کے بغیر شہر نہ گیا  
گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔ وہ بھی لاہور سے کراچی آگئے سب تیاریاں مکمل تھیں۔ پیانے شہر کے بہترین  
ہوٹل کا کک ہائر کیا تھا اس کے علاوہ گھر کے دونوں ملازم بھی تھے کچن کا کام تو شام سے پہلے ہی مکمل ہو گیا تھا۔ مہمان  
آنا شروع ہو چکے تھے۔ ایمن اور عبیدہ کب سے تیار ہو کر مومن کو بھی تیار کر کے اپنے ساتھ لیے پھر رہی تھیں۔  
صرف فضلہ کے ہی خرے پورے نہ ہو رہے تھے۔ ماما کب سے اسے تیار کرنے میں لگی ہوئی تھیں جب ماما نے اس  
کے گولڈن بالوں میں آخری بار برش پھیرتے ہوئے اسے جوتے پہن کر سختی سے باہر آنے کا کہا تو اس نے ایک دم  
سے شور مچا دیا کہ گولڈن جوتی اسے ٹائٹ ہے اس کے پاؤں کو کاٹ رہی ہے ماما نے جھک کر اس کے جوتے کا جائزہ لیا  
جوتی واقعی اسے تنگ تھی پاؤں اس میں بری طرح سے گھٹا ہوا تھا اس صورتحال پر انہیں غصہ بھی آیا اور پریشانی بھی  
ہوئی کہ سب مہمان آرہے ہیں اور اب عین وقت پر۔

”تمہیں پہلے کہا تھا میں نے اچھی طرح سے پہن کر چیک کر لو ٹائٹ یا لوز تو نہیں ہے۔ تم نے ہی کہا تھا کہ ٹھیک  
ہے۔ اب نئی مصیبت کھڑی کر رہی ہو۔“ ماما نے جھنجھلا کر اسے ڈانٹا۔

”تو اس روز آپ نے کون سا ساکس کے ساتھ پہنا کر دیکھی تھی اس کے بغیر تو ٹھیک تھی اب۔۔۔!“ وہ اپنی  
گولڈن براؤن آنکھوں میں فوراً آنسو بھر لائی۔ گولڈن جھلمل کرتے فراک میں وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ ماما کو  
غصے کے باوجود اس پر پیار آگیا۔

”اچھا اب فضول میں روؤ نہیں۔ سارا منہ خراب ہو جائے گا۔ میں تمہارے پیپا سے بات کرتی ہوں اتارو  
جوتے۔“ انہوں نے امٹیپ کھولتے ہوئے ذرا پیار سے کہا۔

پھر پیپا کتنی مشکل سے راضی ہوئے طارق روڈ جانے کے لیے (کاش وہ نہ مانتے) انہیں بھی بہت غصہ آیا تھا کہ  
عین وقت پر اس طرح بازار جانا اچھا نہیں لگتا، لیکن پھر فضلہ کے آنسو اور ماما کی منت نے انہیں مجبور کر دیا۔ دونوں  
مہمانوں سے معذرت کرتے ہوئے تھوڑی دیر کا کہہ کر گاڑی میں جا بیٹھے اگرچہ ایمن نے اس وقت ضد کی کہ وہ بھی  
ساتھ جائے گی مگر ماما نے اسے ڈانٹ دیا۔

”تم بڑی ہو تمہیں خیال کرنا چاہیے۔ چھوٹے بچوں کی طرح ضد کر رہی ہو اگر تم بھی ساتھ چل پڑیں تو گھر کا اور  
چھوٹے بہن بھائی کا کون خیال کرے گا اور تمہارے جانے سے یہ بھی ضد کریں گے جانے کی ہم ابھی آرہے ہیں تم  
فون کا خیال رکھو اور دیکھنا فضلہ کہیں ننگے پاؤں باہر نہ آجائے سارے ساکس خراب کر لے گی۔ چلو اب اندر۔“ تو وہ  
منہ بسورتی ہوئی اندر کی طرف چلی گئی۔

انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ تھوڑی دیر اب کبھی نہیں آئے گی۔ ان کا وہ خوبصورت سجا سجا یا روپ ہمیشہ کے لیے اس  
کی نظروں میں جامد ہو کر رہ جائے گا۔ بلو ساڑھی میں ان کا چمکتا دکھتا چہرہ اور صراحی دار گردن میں پڑا خوبصورت  
نیکلس اسے کبھی نہیں بھولے گا اور پیپا؟



پاپا کو تو وہ کبھی بھی نہیں بھلا سکے کی جب ماما کے ڈانٹنے پر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر چکارا تھا۔  
 ”ایمی جان! ہم ابھی آرہے ہیں بس آدھے گھنٹے میں آپ اندر جاؤ۔“

اور پاپا نے تو اس سے کبھی ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولا تھا پھر اب اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول گئے۔ آدھے گھنٹے کا کہہ کر وہ ساری زندگی کو انتظار بنا گئے۔ پھر جب دو تین گھنٹے گزر گئے اور وہ دونوں نہ لوٹے مہمان انتظار کر کر کے تھک گئے آخر تایا جی نے ابرار بھائی کو موٹر بائیک پر بھیجا کہ جا کر ان کا پتا کرے۔ ابرار بھائی کو بھی گئے گھنٹہ گزر گیا سب کو بے چینی ہونے لگی۔ فضا اپنی جوتی کو رو دھو کر چپ ہو گئی۔ مون نے ماما کے لیے رونا شروع کر دیا۔ خاندان کے لوگوں کے علاوہ باقی لوگوں نے جانا شروع کر دیا وہ بھی اپنی جگہ جمع تھے۔

رات کے نو بج رہے تھے جبکہ سالگرہ کا ٹائم پانچ بجے کا تھا، مہمان آہستہ آہستہ جانا شروع ہو گئے گھر میں بہت سے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی عجیب سا سناٹا پھیل رہا تھا مون کو تو اس نے بہلا پھسلا کر سلا دیا تھا۔ فضا بھی نیند میں ہو چکی تھی۔ سالگرہ کی خوشی میں وہ صبح پانچ بجے کی اٹھی ہوئی تھی۔ ماما کے ساتھ نماز پڑھنے۔ اس کی ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی وہ اب باقاعدہ ماما پاپا سے روٹھ گئی تھی اور وہ خود بھی تو دل ہی دل میں ان سے خفا ہو گئی تھی جو آدھے گھنٹے کا جھوٹا وعدہ کر کے گئے تھے۔

سفینہ پھوپھو اور عاکف پچا کا غصہ اب پریشانی میں بدل چکا تھا، سوا دس بجے کا ٹائم تھا جب اچانک لائٹ چلی گئی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ فضا تو اونچا اونچا رونے لگی۔

”مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔“ ایمن نے اسے ڈانٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا کہ ”ماما ابھی آنے والی ہیں“ عین اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی، سنائے میں اس کی آواز کسی بھیانک چیخ کی طرح سنائی دی تھی پتا نہیں کون اندھیرے میں ٹوٹتا ہوا فون تک پہنچا تھا۔ فون کے دوسری طرف کون تھا۔ یہ تو اسے پتا نہ چل سکا ہاں چند لمحوں بعد تایا جی کا چہنٹا ہوا۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“

اسے دہلایا گیا۔ اندھیرے میں جب وہ ریسیور رکھ کر پلٹے تو اسے پہلی بار لائٹ پر اس قدر غصہ آیا تھا وہ تایا جی کا چہنٹا دیکھنا چاہتی تھی مگر اندھیرے میں تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

عین اسی وقت لائٹ آگئی اور کاش وہ کبھی نہ آئی ہوتی بلکہ اب اس کا آنا یا نہ آنا ایک برابر تھا۔ تایا جی کے سوتے ہوئے چہرے کا جیسے کسی نے لہو نچوڑ لیا تھا اور ان کا وجود ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔

”بہت بڑا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ سکندر کی گاڑی کا لوکل بس سے۔ ہاسپٹل جا کر ان دونوں نے چند سانس بھی نہیں لیں اور۔۔۔“ ان کی آواز کسی گڑھے میں سے آرہی تھی۔ کتے کتے وہ ہچکیوں سے رونے لگے۔

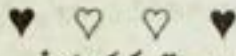
تائی جی نے ”ہائے میرے اللہ“ کہہ کر سینے پر دو ہتھ مارے تھے اور سفینہ پھوپھو ”نہیں بھائی جان ایسے نہیں ہو سکتا۔ نہیں نہیں۔“ وہ چیخنے لگی تھیں اور غزالہ انہی پانچلوں کی طرح ایک ایک کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

اور ایمن نے فضا کو اتنی زور سے اپنے ساتھ چٹنایا تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی جس کی آواز سے مون کو سلائی، عبیدہ بھاگ کر باہر آگئی تھی پھوپھو اور تائی جی تو اب باقاعدہ رو رہی تھیں۔ عبیدہ کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے تھے۔ وہ کچھ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ ایمن سب کچھ سمجھنے سے قاصر تھی وہ تو پھر اس سے دو سال چھوٹی تھی۔

”عبیدہ میری بچی! تمہارے پاپا ماما چلے گئے تمہیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے۔ میری بچی ادھر آ۔ دیکھ کیا ظلم ہو گیا تمہارے ساتھ۔“ تائی کی دردناک پکار نے اسے جیسے سب کچھ سمجھا دیا۔

”وہ نہیں نہیں“ کہہ کر ایمن کی طرف بڑھی۔

”ایمی! ایمی! ماما پاپا کہیں نہیں جاسکتے ہمیں چھوڑ کر۔ ایمی! ماما! ماما!“ وہ پتھری ایمن کے گلے سے جھول گئی وہ تو پہلے ہی فضا کے سہارے کھڑی تھی تینوں دھڑام سے نیچے گر گئیں۔ عاکف پچا اور جمال انکل انہیں اٹھانے آگے بڑھے ایمن بے ہوش ہو چکی تھی۔



اور ہوش میں آنے کے بعد اس کے دل نے پارہا تمنا کی کہ کاش وہ ہوش میں کبھی نہ آئی ہوتی اور اگر آئی بھی تھی تو اسے ارد گرد کی کچھ خبر نہ ہوتی اور اگر خبر بھی ہوتی تو اس میں کم از کم وہ دل خراش منظر نہ ہوتا جس کو اس کی آنکھیں شاید تا عمر نہ بھول پائیں گی۔ اس کے سچے سنورے پاپا اور ماما سفید بے داغ کفنوں اور پیوں میں جکڑے ان کی طرف سے آنکھیں بند کیے پہلو پہلو لیٹے تھے۔ ماما کی پانچ ہزار کی وہ قیمتی ساڑھی ان ہی کے لمبو میں رنگی کتے دن اسٹور میں پڑی رہی، اور پاپا کا خون میں ڈوبا ٹوپس جسے اس نے تائی جی کو ان کے ڈرائیور کو دیتے دیکھا تھا تو کمرے میں آکر اسے اپنی چیخوں پر قابو نہ رہا تھا اور ان کے پہلو پہلو اس طرح بے خبر بے نیاز لیٹے دیکھنے کا منظر تو فقط چند لمحے ہی اس کی بینائی کے سامنے رہا تھا کہ وہ پھر بے ہوش ہو چکی تھی اور جب دوبارہ اسے ہوش آیا تو گھر کے مالکان گھر خالی دیران کر کے ہمیشہ کے لیے خاک میں سامنے جا چکے تھے۔ وہ تو انہیں آخری بار جاتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکی تھی اور آنسو تو جیسے کہیں آنکھوں کے پیچھے ہی جم کر رہ گئے تھے۔

مون اور فضا تو بے تحاشا رو رہے تھے۔ ان کی ماما پاپا کی پکار تو پتھروں کو بھی رلا رہی تھی۔ عبیدہ البتہ اس کی طرح گم صم تھی، دونوں بڑی اور باشعور ہونے کی سزا جھیل رہی تھیں اور وہ دونوں بے شعور ہونے کی وجہ سے رو رو کر اپنے ساتھ ہونے والے اتنے بڑے نقصان کا اعلان کر رہے تھے۔ سب لوگ ان دونوں کو ہی بہلانے میں لگے ہوئے تھے۔ مون تو مستقل سفینہ پھوپھو کے پاس تھا اور فضا کبھی تائی جی کی گود میں ہوتی اور کبھی غزالہ انہی کے پاس اور ایمن کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ سب لوگ چلے جائیں۔ ہر طرف خاموشی ہو جائے۔ سکون جیسا پہلے ہوتا تھا پھر ماما اور پاپا بھی آجائیں گے۔ وہ دونوں تو شور شراب سے بہت بھاگتے تھے اسی لیے تو وہ دونوں آ نہیں رہے تھے۔ اسے ابھی کبھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ دونوں ہمیشہ کے لیے جا چکے ہیں جب سے ہوش سنبھالا تھا یہ تو اسے پتا ہی تھا کہ جو ایک بار مر جاتا ہے۔ اس دنیا سے چلا جاتا ہے وہ پھر دوبارہ نہیں آسکتا زمین آسمان ایک ہو سکتے ہیں مگر مرنے والا نہیں لوٹ سکتا لیکن اسے اب اسی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے والدین دوبارہ نہیں آسکتے۔

ماما کہتی تھیں کہ اللہ سب سے زیادہ بچوں کی دعائیں قبول کرتا ہے، اس نے دل میں طے کر لیا تھا کہ جب سب لوگ چلے جائیں گے تو وہ چاروں بہن بھائی مل کر خوب زور زور سے رو کر اللہ سے دعا کریں گے تو اللہ ضرور ماما اور پاپا کو واپس بھیج دیں گے۔ اس خیال سے جیسے اس کا دل اندر سے مطمئن ہو گیا اور رات کو جب عبیدہ اس کے ساتھ لپٹ کر بہت رونے لگی تو اس نے آہستہ سے یہ راز کی بات اسے بھی بتائی۔

”عبیدہ! سب لوگوں کو جانے دو، پھر ہم اللہ میاں سے خود ہی ماما اور پاپا کو مانگ لیں گے، اللہ میاں ہماری بات ضرور مانیں گے۔“ تو روتی روتی عبیدہ ایک دم سے چپ ہو گئی اس کی بات پر جیسے غور کرنے لگی۔

”نہیں ایمی! ایسے نہیں ہو سکتا۔ مرے ہوئے لوگ اس دنیا میں واپس نہیں آسکتے۔“ اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

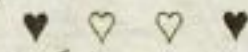
”جی نہیں آسکتے ہیں اللہ میاں سب سے زیادہ بچوں کی دعا قبول کرتے ہیں، اگر ہم اللہ میاں پر زور دیں گے تو وہ ضرور ہماری بات مان لیں گے۔“ اگرچہ اسے خود بھی اپنی بات کے بودے پن کا احساس تھا مگر پھر بھی وہ اسے عبیدہ



سے منوانا چاہ رہی تھی۔

”نہیں امی! ایسے نہیں ہو سکتا۔ تمہیں یاد نہیں ماما! جو ہمیں حدیث سنایا کرتی تھیں کہ جب شدائے بدر کو جنت میں اعلا مقامات اور درجات پر پہنچا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے شداء سے کسی اور خواہش کی فرمائش کرنے کو کہا تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کچھ اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے اصرار کیا انہوں نے پھر انکار کیا جب اصرار زیادہ بڑھا تو انہوں نے کہا کہ اللہ میاں ہمیں ایک بار پھر دنیا میں بھیج دیں ہم پھر جا کر کفار سے لڑیں اور شہید ہو کر آئیں تو اس فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے خاموشی اختیار کر لی تھی کہ جو ایک بار اس دنیا سے چلا گیا وہ دوبارہ نہیں آ سکتا۔“

عبیدہ کی بات اس قدر جاندار تھی اور یہ بات تو ماننے ان کے سامنے کسی تھی وہ اکثر انہیں احادیث کی روشنی میں اچھی اچھی باتیں بتایا کرتی تھیں اور وہ یہ بات بھول گئی تھی۔ عبیدہ کو یاد تھی وہ اسے کیسے جھٹلا سکتی تھی اس نے بے بسی سے سر اٹھا کر عبیدہ کو دیکھا، آنسو اس کے گالوں پر اٹکے ہوئے تھے۔ ایمین کو دوسری بار لگا کہ اس کے ماں باپ واقعی ہمیشہ کے لیے ان سے روٹھ چکے ہیں اور اب کوئی مناجات کوئی اسم اعظم انہیں واپس نہیں لاسکتا۔ دعا کی آخری آس بھی ٹوٹ گئی۔ وہ ایک دم سے بے قابو ہو کر عبیدہ کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔



پھر دوسری بار وہ اس روز روئی جب تائی جی نے ان چاروں کے کپڑے اور چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں سمیٹ کر انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہا۔ عبیدہ اور ایمین دونوں جانا نہیں چاہ رہی تھیں۔ مگر ان کی ضد کی اب کسے روکتی ان کے لاڈ اٹھانے والے اور ان کی ذرا ذرا سی ضد کی پروا کرنے والے تو پوند خاک بن چکے تھے۔ تائی جی کا آفس ان کے گھر سے دور بڑا تھا پھر تائی جی کو دنیا میں صرف اپنے گھر سے پار تھا۔ پتا نہیں وہ اتنے دن گھر سے دور کیسے رہی تھیں۔ عاکف چچا تو قیل کرنے کے اگلے روز ہی چلے گئے تھے۔ ان کی فیکٹری اور بیوی ان کی اتنی لمبی غیر حاضری کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ غزالہ آنٹی اور انکل جمال کو بھی اپنے اسکول سے اتنی لمبی چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ غزالہ آنٹی ایک ہفتے بعد ہی چلی گئیں۔ سفینہ پھوپھو البتہ ان کی وجہ سے رک گئی تھیں اور پھر ڈیڑھ ہفتے بعد ہی تائی جی ان سب کو اپنے گھر لے آئے گاڑی تو ایک سیمنٹ میں ہی چکنا چور ہو گئی تھی اور دھانچہ تائی جی نے اونے پونے بیچ دیا تھا۔ ان کے گھر کو تالا لگا دیا گیا تھا۔

عبیدہ تو چل چل کر رو رہی تھی کہ وہ گھر چھوڑ کر نہیں جائے گی۔

”ماما! پاپا آجائیں گے“ آپ لوگ چلے جائیں ہم نہیں جائیں گے۔“ وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی تھی ابراہ بھائی نے اسی طرح اسے اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھی تائی جی کی گود میں ڈال دیا تھا۔ ایمین کے رونے پر تائی جی نے اسے بری طرح سے جھڑک کر ایک پھڑکایا تھا۔

”ایمین! تم بچی نہیں ہو سمجھ دار ہو، خبردار جواب روئیں تو۔ فضول میں داغ خراب کر دیا ہے چپ کر کے گاڑی میں بیٹھو ورنہ تم کو بیس چھوڑ جاؤں گا پھر اکیلی بیٹھی روو گی۔“

اس کے تواتر سے بتے آنسو وہیں ٹھم گئے تھے۔ ہاں اندر بہت کچھ تڑخ گیا تھا۔ مستقبل کی دھندلی سی تصویر واضح ہونے لگی تھی۔ جوں جوں گاڑی گھر سے دور ہو رہی تھی وہ روٹیوں کے تانے پانے جوڑ کر اپنا اور بہن بھائیوں کے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس نے پلٹ کر نہ تو ہوش میں آتی عبیدہ کو دیکھنے کی کوشش کی اور نہ پھوپھو کی گود میں بخار میں پھٹکتے مون پر ایک نگاہ ڈالی وہ بس کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے منظر میں گم تھی۔

تائی جی کے گھر آئے ہی جیسے سب لوگ بے تحاشا مصروف ہو گئے تھے۔ تائی جی صبح کے نکلے شام گئے پلٹتے تھے اور اگر بھی انہیں کم از کم ان چاروں میں سے کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا اگر دیکھ بھی لیتے تو قصداً ”بے نیاز سے“ بن جاتے۔

ثابہ ان کا وجود بھی انہوں نے گھر کی دیواروں یا ساز و سامان کی طرح تصور کر لیا تھا جو وجود تو رکھتے ہیں مگر ہر وقت نظروں کے سامنے ہونے کی وجہ سے روئین کا حصہ لگتے ہیں۔ بے وقعت اور بے مصرف۔ تائی جی کا گھر ان کے گھر جتنا ہی بڑا تھا مگر رانے فیشن کا بنا ہوا تھا۔ بہت اونچی اونچی چھتیں اور بڑے بڑے کمرے اور تائی جی تو آتے ہی اپنی راجدھانی کی صفائی ستھرائی میں لگ گئی تھیں۔ باقی ہر چیز ہر موضوع ان کے لیے بے معنی تھا اور سفینہ پھوپھو وہ دن بعد ہی اپنے سسرال والوں سے ملنے راولپنڈی چلی گئی تھیں۔ مون کا بخار نہیں اتر رہا تھا۔ پہلے دن ہی ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ اس کے بعد ایمین اور عبیدہ کے کہنے کے باوجود کسی کو ٹائم ہی نہیں مل سکا تھا۔ اسے دوبارہ ڈاکٹر کو دکھانے کا۔

مون بہت کمزور ہو گیا تھا اور بے حد چڑچڑاہی۔ ہر وقت اس کا بدن بخار کی حدت سے تپتا رہتا تھا اس کا کھانا پینا نہ ہونے کے برابر ہو گیا تھا، ہر بات میں ضد کرتا تھا جب بھی ذرا اس کی طبیعت بہتر ہوتی وہ ”ماما ماما“ پکارنا شروع کر دیتا اسے سنبھالتے سنبھالتے ایمین اور عبیدہ بکھر بکھر جاتیں۔ فضلہ تو ویسے ہی کم صم ہو کر رہ گئی تھی۔

تائی جی اب ایمین سے کہہ رہے تھے کہ وہ اسکول جانا شروع کرے اتنی لمبی چھٹی کرنا ٹھیک نہیں اس کی کلاس سینئر ہے۔ عبیدہ اور فضلہ کو تو انہوں نے ایک دفعہ بھی نہ کہا اسکول جانے کو۔

”ان کو کیوں نہیں کہتے یہ بھی اسکول جائیں اب۔“ ان کے دن رات کے اصرار پر وہ بھی چمک کر بولی۔ ”تمہاری کلاس بڑی ہے نا اس لیے۔“ اس کے اعتراض پر انہوں نے اسے سمجھایا مگر اس نے ان کی بات نہ مانی نہ پیار سے نہ غصے سے۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل منتظر تھا کہ کچھ ہونے والا ہے وہ ہونے چکے تو پھر وہ کچھ کرے گی۔

ابراہ بھائی تو بہت اچھے تھے۔ ان چاروں کا خیال بھی رکھتے تھے۔ کالج اور کرکٹ کی مصروف روئین میں سے وقت نکال کر ان کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ولید بہت بے حس اور ظالم تھا۔ وہ آتے جاتے ان چاروں کو خوب تنگ کرتا تھا۔ کبھی کہتا۔

”امی ابو مظلوموں کا چوکڑا پتا نہیں کہاں سے اٹھالائے ہیں بھلا شہر میں اتنے یتیم خانے بھی تو ہیں وہاں چھوڑ آتے۔ لا کر یہ مظلوم صورتیں ہمارے اوپر طاری کر دیں ہر وقت کا رونا دھونا۔“ اسے ولید سے نفرت ہو چکی تھی۔

”نہ تمہارے پاپا ماما کو ہم نے مارا ہے جو ہر وقت یہ محسوس پھیلائے رکھتے ہو تم لوگ۔“ ان میں سے کوئی بھی روتا تو وہ دھاڑنے لگتا۔ اگرچہ تائی جی اسے ڈانٹتے تھے لیکن تائی جی اس کی اتنی بکواس پر بھی اسے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ وہ ان کا بہت لاڈلا تھا اور پھر لاڈلوں کو کون کچھ کہتا ہے۔

ان کے پاپا ماما نے انہیں کبھی کچھ کہا تھا جو تائی جی ولید کو کچھ کہتیں، لیکن انہوں نے کبھی اس طرح کسی کی دل آزاری بھی تو نہیں کی تھی۔

وہ دل ہی دل میں دعا مانگتی کہ تائی جی انہیں ان کے گھر چھوڑ آئیں پھر اسے ولید سے بھی کوئی شکایت نہیں رہے گی۔ بھلے ماما پاپا بھی نہ آئیں لیکن وہ اپنے گھر چلے جائیں۔

مگر ایسا کوئی اشارہ انہیں سے نہیں مل رہا تھا کہ ان لوگوں کا ارادہ انہیں واپس بھیجنے کا ہے۔ پھوپھو پندرہ دن بعد واپس آئیں اور آج ہونے والی بات ہو بھی گئی۔ ان کی تقدیروں کا فیصلہ انہیں بتائے بغیر کر دیا گیا تھا اس طرح سے انہیں تڑپ کر کے۔

”نہیں نہیں میں کبھی ایسے نہیں ہونے دوں گی پھوپھو کو اگر بیٹے کی ضرورت ہے تو اللہ میاں سے مانگیں۔ ہمارا مون کوئی فالتو تو نہیں ہے میں کبھی بھی اسے اپنے سے دور نہیں کروں گی۔ وہ تو بالکل پاپا جیسا ہے ان کے جیسی آنکھیں ان کے جیسے بال۔ نہیں کبھی نہیں۔“



اور فضا کو اتنی دور بھیج دوں۔ لاہور بھی نہیں۔ عاکف پچانے تو کبھی ہمیں جھوٹے سے بھی پیار نہیں کیا وہ کیا فضا کا خیال رکھیں گے اور وہ تو اتنی بزدل اور ڈرپوک ہے کہ رات کو سوتے میں بھی اتنی دفعہ ڈرتی تھی کہ ماما لایا اسے اپنے ساتھ سلاتے تھے۔ وہ اکیلی کیسے رہے گی اور عبیدہ غزالہ آنٹی کے گھر کبھی نہیں۔ جہاں ہر وقت ہلاک ہوتا رہتا ہے اور غزالہ آنٹی کی پانچ بیٹیوں میں عبیدہ کی بھلا کیا گنجائش۔ اسے تو ذرا سی بھی توجہ نہیں ملے گی اور ان کے گھر تو کھانا بھی ایک وقت پلتا ہے اور تین ٹائم چلتا ہے اور ہر وقت ہر ڈش میں ڈچ قوم کی طرح آلو پکتے ہیں اور عبیدہ کو آلو کتنے ناپسند ہیں وہ کسی کھانے میں بھی آلو نہیں کھاتی۔ سپا اس کے لیے علیحدہ ماما سے کہہ کر کچھ نہ کچھ بھواتے تھے اور غزالہ آنٹی کا گھر کس قدر چھوٹا ہے صرف دو کمرے۔ ایک میں ان کی پانچ بیٹیاں سوتی ہیں عبیدہ اتنے Congested ماحول میں کیسے رہے گی۔ اسے تو گرمی بھی بہت لگتی ہے اور غزالہ آنٹی کے گھر تو اسے سی بھی نہیں ہے اور شام کو جب سارے محلے کے بچے ان کے گھر ٹیوشن پڑھنے آتے ہیں تو کتنا شور ہوتا ہے ہر طرف آوازیں ہی آوازیں۔ غزالہ آنٹی عبیدہ کو اپنے سرکاری اسکول میں داخل کرادیں گی۔ نہیں کبھی نہیں۔

اور میں ادھر رہ جاؤں تایا جی کے گھر کبھی نہیں۔ تایا جی اتنے سخت ہیں غصیلے اور نجوس اور تائی جی ان سے دو گنی نجوس اور جھگڑالو۔ بچوں کے ساتھ ناپ کر تو وہ دودھ دیتی ہیں ہمیں اور مجھے تو دودھ کے بغیر ساری رات نیند نہیں آتی۔ پھر مجھے تایا جی سے بھی بہت ڈر لگتا ہے وہ بولتے بھی ہیں تو یوں لگتا ہے ابھی مارنے لگیں گے ان کی آواز اتنی گرج دار ہے اور خوفناک بھی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہاں وہ ولید کا بچہ ہے۔ جو اتنا بد تمیز ہے کہ اسے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں جب وہ ہمیں منحوس کہتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کا منہ نوچ لوں۔

میں یہاں کبھی نہیں رہوں گی چاہے کچھ ہو جائے۔ یہ کوئی ہمیں زبردستی تو نہیں رکھ سکتے۔ ہمارا گھر ہے ہم وہاں اکٹھے بھی رہ سکتے ہیں اور کھانے پینے کا انتظام پاپا کے بینک میں موجود پیسوں سے ہو سکتا ہے۔ دو چار سالوں کی بات ہے پھر میں کہیں چاب کر لوں گی پھر مون بھی تو بڑا ہو جائے گا۔ جن کے ماں باپ مر جاتے ہیں کیا انہیں اس طرح رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے کبھی نہیں۔ ہم چاروں اکٹھے رہیں گے اپنے گھر میں چاہے کچھ ہو جائے۔ ایک پارا اگر ہم یہاں سے نکل جائیں پھر یہ لوگ ہمیں زبردستی تو نہیں لاسکتے۔ ٹھیک ہے مجھے ہمت کرنی ہوگی۔ ماما نے کہا تھا کہ تم بڑی ہو تمہیں سب بہن بھائیوں کا اور گھر کا خیال رکھنا چاہیے ہاں مجھے یاد ہے ماما نے جاتے جاتے یہی کہا تھا اور میں یہی کروں گی میں اپنے بہن بھائیوں کو بکھرے نہیں دوں گی کبھی نہیں۔

وہ ایک عزم لیے سوچ کر کھڑکی سے ہٹ گئی اپنا چہرہ اس نے قمیص کی آستینوں سے رگڑ کر صاف کیا۔ "مجھے عبیدہ سے بات کرنی چاہیے۔ آج کی رات تو ہے بس۔ صبح تو عاکف پچا فضا کو لے جائیں گے اور غزالہ آنٹی عبیدہ کو۔ بس جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرنا ہے ابھی۔ وہ سوئی ہوئی عبیدہ کی طرف بڑھی۔



پہلے تو عبیدہ کو نیند کی وجہ سے اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ "مجھے عاکف پچا لے جائیں گے جی نہیں میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی ان کی مسز اتنی فضول ہیں اور عاکف پچا نے تو کبھی مجھے اتنا سا بھی پیار نہیں کیا میں تو نہیں جاؤں گی ان کے ساتھ۔" وہ گہری نیند کے آٹھے کی وجہ سے سرخ آنکھوں کے ساتھ ذرا غصے سے بولی۔ "بے وقوف! عاکف پچا تمہیں نہیں فضا کو لے کر جائیں گے تمہیں تو غزالہ آنٹی لے کر جائیں گی حیدر آباد۔"

ایمن کو اس کی کم عقلی پر غصہ آیا۔ ذرا اٹھ کر بولی۔ "غزالہ آنٹی اتوبہ کرو۔" اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "وہ تو اتنی غریب ہیں ہر وقت آلو پکاتی ہیں۔ وہ مجھے آلو کھا کر ماریں گی اور تمہیں پتا ہے مجھے آلو کھاتے ہی اتنی آجاتی ہے میں تو نہیں جاؤں گی اور ان کی وہ ایک نہ دو

اٹھی پانچ بیٹیاں اتوبہ کرو اور سب کی سب ایک ڈر بے میں بند۔" وہ اب ذرا ہوشیار ہو بیٹھی تھی۔ "اور پتا ہے مون کو پھوپھو لے جائیں گی اتنی دور۔ شارجہ۔" اس نے "آئی" کو کھینچ کر خوب لمبا کیا "پھر ہم اسے کیسے دیکھیں گے، ہیں نا۔" اس کی آنکھیں اس سوچ پر ہی بھر آئیں۔ "کیوں ہماری کوئی سیل لگی ہے جو کوئی بھی آکر ہمیں لے جائے۔" عبیدہ چمک کر بولی۔ "میں پھوپھو کو بھی سیدھا کر سکتی ہوں۔ ہمارا بھائی کوئی فالتو ہے میں تو اسے کبھی نہیں جانے دوں گی۔" اس نے تڑپ کر سوئے ہوئے مون کا ہاتھ چوم لیا۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے ورنہ یہ لوگ ہمارے ساتھ زبردستی کریں گے پھوپھو برسوں صبح چلی جائیں گی اور عاکف پچا صبح ہی فضا کو لے جائیں گے وہ تو اتنی ڈرپوک ہے کچھ کہے گی نہیں بس رورو کر مر جائے گی۔" ایمن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ تینوں بہن بھائیوں کو سلیمانی ٹوپی پہنا کر غائب کر دیتی۔ "ہاں تم ٹھیک کہتی ہو اگر ہم اپنے گھر چلے جائیں تو یہ لوگ زبردستی تو نہیں کر سکیں گے۔ پاپا کے بینک میں اتنے سارے پیسے ہیں ہم گزار کر لیں گے اگر ان لوگوں نے زبردستی کی تو ہم پاپا کے دوستوں سے کہیں گے۔ انکل آصف اور انکل وحید تو روز آتے ہیں ہم سے ملنے۔" عبیدہ نے بھی اسے حوصلہ دیا۔

"تو چلو پھر فضا اور مون کو اٹھاؤ ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔" ایمن فوراً بولی۔ "ابھی۔" عبیدہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اس نے پلٹ کر وال کلاک کی طرف دیکھا جہاں گیارہ بج رہے تھے۔

"ایمی! بہت رات ہو گئی ہے اور اب تو سردی بھی اتنی زیادہ ہے ہم کیسے جائیں گے گھر بھی تو اتنا دور ہے یہاں سے بس کا کرایہ بھی تو نہیں ہے ہمارے پاس۔ پھر راستے میں کوئی ہمیں پکڑ نہ لے۔ مون کو تو ابھی بھی بخار ہے اسے ہم کیسے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔" اس نے ڈر ڈر کر سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

"کرایہ تو میرے پاس ہے مجھے ابراہیم بھائی نے مون کو چاکلیٹ لینے کے لیے دیے تھے۔ وہ میرے پاس ہیں اور رات تو یہاں لگ رہی ہے سڑکوں پر تو خوب رونق ہوتی ہے اور ہمیں بھلا کوئی کیسے اغوا کر سکتا ہے ہم چار ہیں کم از کم تین بندے تو ہونے چاہئیں ہمیں اغوا کرنے کے لیے۔ تم فضول میں نہ ڈراؤ۔ بس آج ہی کی رات ہے کل ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے یہاں سے نکلنے کا ہے مون کو میں خود سنبھال لوں گی۔" ایمن پوری طرح ٹھان کر بیٹھی ہوئی تھی کہ کچھ لو تمہیں پتا ہے نا، تایا جی کو کتنا غصہ آتا ہے اگر پکڑے گئے تو وہ پٹائی کر دیں گے اب تو پاپا بھی نہیں ہیں بھانے والے۔ پھر ہمارا قدر اندھیرا ہے اور مین گیٹ پر تو تالا لگا ہوتا ہے رات کو۔" عبیدہ نہیں مان رہی تھی۔ "مجھے تو ڈر لگ رہا ہے اتنا اندھیرا ہے اور سردی بھی۔" وہ کانپ کر بولی۔

"بس یو نہی فضول میں ڈرتی رہنا یہ ہمیں ادھر ادھر کر دیں گے پھر نہ رونا۔" ایمن ذرا غصے سے بولی۔ "ہم صحن والے پچھلے دروازے سے نکلیں گے ادھر سے اسٹاپ بھی نزدیک ہے اور ادھر تو تالا بھی نہیں ہوتا۔ بس تم فضا اور مون کو اٹھاؤ ان کو گرم کپڑے پہنا دو پھر چلتے ہیں میں نے کہہ دیا ہے کہ بس ابھی چلنا ہے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ مالک ہے ہمیں صرف اسی سے ڈرنا چاہیے۔ بندوں سے نہیں یہ ماما کہتی تھیں نایا ہے نا تمہیں۔" اس نے اسے یاد دلایا۔ "اور ہم کوئی گناہ تو نہیں کر رہے آٹھے ہی تو رہنا چاہ رہے ہیں اور وہ بھی اپنے گھر میں۔ پھر ڈر کس بات کا۔ تم بس اٹھو جلدی کرو۔"

وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور الماری سے فضا اور مون کے گرم کپڑے نکالنے لگی۔ عبیدہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی



پھر مڑ کر بے خبر سوئے مون اور فضلہ کو اٹھانے لگی۔ دونوں ہی گہری نیند سوئے ہوئے تھے اس کے ہلانے پر ذرا سا کسمسا کر پھر بے خبر ہو گئے۔  
 ”ایمی! یہ نہیں اٹھیں گے۔ بہت گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔“ اس نے کچھ دیر کی کوشش کے بعد بے بسی سے کہا۔

”میں اٹھاتی ہوں۔ تم تو یہ جرسی اور جرابیں پہنوا تنی دیر۔“ اس نے جرسی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور خود ان دونوں کو اٹھانے لگی۔



باہر واقعی گہرا اندھیرا تھا اور پچھلے صحن میں تو یوں بھی کم ہی آنا جانا ہوتا تھا۔ اجڑی ہوئی گھاس پھوس اور ٹنڈ منڈ سے پودے تھے۔ ایک چالیس واٹ کا مرل سا بلب برآمدے میں جل رہا تھا۔ جس کی ٹیلی روشنی میں ماحول اور بھی خوفناک اور پر اسرار لگ رہا تھا۔ تائی جان کے کبوتروں کے خالی ڈربے ایک کونے میں تھے آج کل اس میں کوئی کبوتر نہیں تھا دوسرے کونے میں ہاتھ والا پانی کا ٹکا تھا باہر گھپ اندھیری رات تھی۔

چاند بھی نہیں نکلا ہوا تھا اور آسمان پر بادل تیر رہے تھے ایمن اور عبیدہ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایمن نے مون کو کندھے سے لگا رکھا تھا۔ وہ ابھی بھی سو رہا تھا جبکہ فضلہ ڈر اور نیند کی ملی جلی کیفیت میں عبیدہ کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی ایمن نے اسے خوب ڈانٹ ڈپٹ کر اٹھایا۔

”کہیں بارش نہ ہو جائے جاتے جاتے۔“ عبیدہ نے خدشہ ظاہر کیا۔  
 ”ہم نے اتنی دور نہیں جانا۔ بس ابھی بس میں بیٹھیں گے اور گھر کے آگے ہی اتر جائیں گے اور اب تم بولو نہیں کوئی سن لے گا۔“ ایمن نے اسے کچھ ڈانٹتے ہوئے تنبیہ کی۔  
 ”ابھی سب سو رہے تھے۔ تم نے اچھی طرح دیکھا تھا نا؟“ ان کے چلنے سے فرش کی خود رو گھاس اور پتے چرچر رہے تھے۔

”پھر بولیں تم؟“ ایمی نے دھیمی آواز میں اسے گھر کا ”کہا جو ہے سب سو رہے تھے اب نہیں بولنا۔ کوئی نہیں آئے گا۔ مون کے بچے تم اٹھ کر چل نہیں سکتے۔“ اس نے جھنجھلا کر مون کے بھاری بوجھ کو دوسرے کندھے پر شفٹ کیا۔

عبیدہ اس کے بعد کچھ نہ بولی۔  
 ”آپی! ہم کہاں جا رہے ہیں! ماما پاپا کے پاس؟“ کچھ دیر بعد فضلہ کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

”کاش ہم ان کے پاس جاسکتے۔“ ایمن کے لہجے میں بے بسی تھی اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔  
 ”نہیں فضا! ہم گھر جا رہے ہیں۔ بس ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں گے، تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا نا؟“ ایمن نے اسے ذرا پیار سے چمکارا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے آپی! اتنا اندھیرا ہے اور سردی بھی۔ ہم گھر کیسے جائیں گے اکیلے۔ ابراہیم بھائی سے کہیں وہ ہمیں چھوڑ آئیں۔“ فضلہ رگ کر کھڑی ہو گئی۔

”نہیں ہم خود ہی جائیں گے۔ ہمیں دوسروں کے سہارے تلاش نہیں کرنے چاہیں بس تم تیزی سے قدم اٹھاؤ۔“ ایمن نے ذرا سختی سے کہا۔

وہ دونوں پھر خاموشی سے چلنے لگیں اور گیٹ کون سا دور تھا ایمن دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔



”شکر ہے۔ تالا نہیں لگا ہوا۔ عبیرہ تم کنڈی کھولو۔ میں نے مون کو اٹھا رکھا ہے۔“ ایمن دروازے سے ذرا ہٹ کر بولی۔

عبیرہ فضہ کا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھی۔  
کنڈی کھولنے کے لیے اس نے کنڈی کے ہینڈل کو ذرا سا اوپر اٹھایا۔  
دروازہ لوہے کا بنا ہوا تھا اور کنڈی نامعلوم گب کی بند تھی۔ زنگ آلود ہینڈل چیخ اٹھا اور وہ سخت بھی بہت تھا۔  
عبیرہ نے ذرا ڈر کر ایمن کی طرف دیکھا۔

”یہ نہیں کھلے گا۔“ وہ بچنی بچنی آواز میں بولی۔  
”کھل جائے گا ذرا دو چار بار اوپر نیچے کرو۔ جلدی کرو۔ کوئی اٹھ کر نہ آجائے۔“ ایمن نے پھر سختی سے کہا۔  
عبیرہ نے ہینڈل کو نیچے کیا۔ اس نے پھر زوردار آواز نکالی عبیرہ نے ایمن کو دیکھا۔  
”اچھا۔ تم مون کو پکڑو۔ میں کھولتی ہوں تمہارے ہاتھوں میں تو جان ہی نہیں ہے۔“  
جتنا وقت گزرتا جا رہا تھا ایمن کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ تینوں تو بالکل ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔  
عبیرہ نے جلدی سے مون کو اس سے لے لیا، مون اب گہری نیند کے غلبے سے نکل آیا تھا اور اب گردن اٹھا کر عبیرہ اور ایمن کو دیکھ رہا تھا۔

ایمن نے آگے بڑھ کر چٹختی کے ہینڈل کو زور سے دو تین بار اوپر نیچے کیا مگر زنگ آلود کنڈی کھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”آپی! سردی لگ رہی ہے۔“ فضہ کپکپا کر بولی۔ اس کے ہاتھ برف ہو رہے تھے۔  
”چپ کرو تم میں بھی یہاں کھیل نہیں رہی ہوں، دروازہ کھول رہی ہوں۔“ وہ جھڑک کر بولی۔  
”ماما۔ ماما کے پاس جانا ہے عبیرہ۔ ماما کے پاس ہوں ہوں۔“ مون نے ایمن کی ڈانٹ سے گھبرا کر ایک دم سے رونا شروع کر دیا ایمن گھبرا کر کنڈی چھوڑ کر اس کی طرف بڑھی۔

”مون! ہم ماما کے پاس ہی جا رہے ہیں۔ شاباش مانی روتے نہیں۔ چپ کر جاؤ۔ بس تھوڑی دیر اور۔“ اس نے آگے بڑھ کر مون کو گلے سے لگایا اور اس کا منہ چوم کر اسے تسلی دی۔  
”ننیں نئیں۔ مجھے ماما کے پاس جانا ہے ابھی۔“ وہ پھر رونے لگا۔

”جا رہے ہیں نامون ماما کے پاس ہی جا رہے ہیں۔ اب چپ کر جاؤ۔“ عبیرہ نے بھی اسے پیار کیا۔  
”بس ابھی دروازہ کھل جائے گا پھر ہم اپنے کمرے میں سوئے گا جہاں اس کے کھلونے ہیں اور کئی ماؤں بھی تو ہے نامانی۔ اب نہیں رونا۔“ ایمن نے اسے چکارا تو وہ خلاف توقع خاموش ہو ہی گیا۔

وہ پھر ہٹ کر زور زور سے کنڈی کھولنے لگی، تین چار بار زور سے اوپر نیچے کیا ہینڈل اب کھسکنے لگا تھا۔ اس پر جوش طاری ہو گیا۔ اس نے دو تین جھٹکے اور دیے۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ ہیں؟“ ایک دم سے پیچھے سے ولید کی زوردار آواز آئی، چاروں اچھل پڑے مون اور فضہ تو ڈر کر اور زور زور سے رونے لگے عبیرہ بھاگ کر ایمن سے چمٹ گئی۔

”ہم اپنے کمرے میں ہیں۔“ ایمن نے عبیرہ کا بازو تھام کر بے خوفی سے ولید کو دیکھا۔  
”اس وقت آدھی رات کو۔ تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔“ ولید حیرانی سے بولا۔

”ہاں اس وقت آدھی رات کو تمہیں کیا تکلیف ہے؟“ ایمن بد لحاظی سے بولی۔



”اور گھر کا راستہ آتا ہے مار کو پولو صاحبہ!“ وہ طنز سے بولا۔

”آتا ہے ہم خود بھی جاسکتے ہیں۔ تمہیں نہیں کہہ رہے کہ ہمیں چھوڑ کر آؤ۔“

”عبیرہ! چلو دروازہ کھل گیا ہے۔“ وہ پلٹ کر پھر کنڈی کھولنے لگی۔

”ایمن! تم بالکل پاگل ہو گئی ہو اور ساتھ میں ان تینوں کو مارنا چاہ رہی ہو اتنی سردی میں۔ میں بلاتا ہوں ابو کو۔“ اس نے آگے بڑھ کر ایمن کو دروازے سے برے دھکیلتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیا تکلف ہے اگر میں پاگل ہو گئی ہوں۔ یہ میرے بہن بھائی ہیں، تمہیں تو کچھ نہیں کہہ رہی ہوں ہمارے راستے سے۔“ وہ چیخ کر بولی اور اسے اپنے آگے سے دھکیلنے لگی۔

”پاگل!“ ولید نے گھور کر آواز بلند کیا۔

”ابو! امی! چاچو! جلدی آئیں یہ دیکھیں یہ کیا کر رہی ہے مس ہانگ کانگ۔ ان کو ٹھنڈ میں مارے گی۔“ گھر کی طرف منہ کر کے وہ زور سے چلایا۔

”ولید میں کہہ رہی ہوں ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ ہمیں یہاں نہیں رہنا۔ اپنے گھر جانا ہے پیچھے ہٹو اور جسے مرضی بلا لو میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔“ وہ نڈر ہو کر بولی اور اسے دھکیل کر پھر کنڈی کھولنے لگی۔

”تم ایسے نہیں مانو گی؟“ ولید نے اسے دھمکایا۔

”چلو عبیرہ فضہ اور مون کو مجھے دو۔ اس دیوانی کو اکیلی جانے دو۔ خود ہی داغ ٹھکانے آجائے گا۔“ اس نے عبیرہ اور فضہ کو اندر کی طرف دھکیلا اور مون کو عبیرہ کی گود سے جھپٹ لیا۔

”چھوڑو مون! عبیرہ! چلو تم۔ دروازہ کھل گیا ہے۔“ وہ زخمی شیرینی کی طرح ولید پر جھپٹی اور مون کو کھینچنے لگی۔

”امی! ابو! چاچو! جلدی آئیں اس ایمن کی بچی کو پوچھیں اگر۔“ وہ اسے دھکا دے کر مون کو لیے برآمدے کی طرف بڑھا اور یہ تو اسے پتا تھا کہ وہ مون کے بغیر وہاں سے مل بھی نہیں سکتی وہی ہوا وہ دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگی عبیرہ اور فضہ بھی ان دونوں کے پیچھے چل پڑیں۔

”ولید! چھوڑو مون کو۔ میں کہتی ہوں۔ چھوڑو اسے۔“ اس نے پیچھے سے ولید کی جرسی زور سے کھینچی۔

”کیا ہو رہا ہے تم لوگوں کو آدھی رات کو۔ کیا او دم مچایا ہوا ہے اس سردی میں۔“ تائی جی برآمدے میں سردی سے کپکپاتے ہوئے آکر بولیں۔

”امی دیکھیں اس پاگل کو۔ یہ تینوں کو اس وقت لیے اپنے گھر جا رہی ہے دیکھیں، مون کا بخار کتنا تیز ہو گیا ہے۔“ ولید نے جلدی سے مون کو ماں کی طرف بڑھایا۔

”اوئی اللہ بچے کا رنگ تو دیکھو نیلا پیلا ہو رہا ہے۔“ انہوں نے جھپٹ کر مون کو اپنے ساتھ چٹنایا۔ ”اے ایمن کیا کیرا نا چاہے آدھی رات کو تیرے بیٹھے میں۔“ وہ پلٹ کر ایمن پر برسیں۔

”امی! اس کو ذرا ابو کے پاس لے کر چلیں پھر اسے پتا چلے اس حرکت کا مطلب۔“ ولید نے اسے ڈرانا چاہا۔

”ہاں تو لے جائیں مرضی جس کے پاس میں کسی سے نہیں ڈرتی ہوں ہمیں اپنے گھر جانا ہے بس۔“ اس کا لہجہ از حد گستاخ تھا۔

”میں یہ اسے کیا ہوا ہے؟“ تائی جی اس کے لیے پر حیرت زدہ رہ گئیں۔

”اسے کوئی جن چٹ گیا ہے امی! اتنے اندھیرے میں باہر جو کھڑی دروازے سے زور آزمائی کر رہی تھی عین درخت کے پیچھے۔“ ولید فوراً بولا۔

”کیسا شور ہے یہ؟ کیا ہو رہا ہے ادھر؟“ تائی جی بھی آوازیں سن کر آنکھیں ملتے باہر آگئے۔

”میں یہ کیا ہو رہا ہے تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو آدھی رات کو۔“ وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

”یہ ذرا اپنی بیٹی کے کرتوت سنیں۔ آدھی رات کو بہن بھائی کو لے کر اپنے گھر جا رہی تھی۔ ٹارزن کی اولاد۔“ ولید نے آتے ہی باپ کو بھڑکایا۔

”منہ سنبھال کر بات کرو ولید! میں تم جیسوں کے منہ نہیں لگنا چاہتی۔“ اس بات پر اس کا جی چاہا کہ وہ ولید کا منہ نوچ لے۔

”کیا معاملہ ہے یہ؟ انیسہ! تم بتاؤ۔“ تائی جی کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ گرجدار آواز میں بولے۔

”معاملہ کیا ہونا ہے بے چارے بچوں کو اتنی ٹھنڈ میں خدا جانے کہاں لے کر جا رہی تھی۔ میں تو خود شور سن کر آئی ہوں باہر۔ یہ مون کو تو دیکھیں کیسے نیلے کالج جیسا ہو رہا ہے۔ میں اسے تو اندر لے کر جاؤں۔“ وہ اندر کی طرف بڑھیں۔

”یہ کیا سن رہا ہوں میں؟ ایمن کہاں جا رہی تھیں تم اس وقت۔“ تائی جی گرج کر ایمن سے بولے۔

”سنا نہیں آپ نے۔ ہم اپنے گھر جا رہے تھے ہمیں اپنے گھر جانا ہے۔ ادھر ادھر تقسیم نہیں ہونا۔“ وہ باغی لہجے میں بے خونی سے بولی۔

”تم۔۔۔ تمہاری اتنی جرات۔“ وہ غصے سے آگے بڑھے اور کھینچ کر اس گل پر اوپر تلے دو تھپڑ جڑ دیے۔ وہ برآمدے کے ستون سے جا لگی۔

”ہاں ہمیں تقسیم ہونا۔ ہمیں اپنے گھر جانا ہے۔“ وہ اسی دیدہ دلیری سے بولی آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔

”گھر جانا ہے، تمہارا باپ خزانے چھوڑ گیا ہے نا جو گھر جا کر کھاؤ گے۔ چلو دفع ہو جاؤ اپنے کمرے میں۔ اب میں نے کوئی بات سنی تو تمہارا گلا گھونٹ دوں گا گستاخ لڑکی!“ انہوں نے بازو پکڑ کر اسے اندر دھکیلا عبیرہ اور فضہ پہلے ہی ڈر کر تائی جی کے ساتھ ہولی تھیں۔

”میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ ادھر نہیں رہنا ہے۔“ وہ ان ہی قدموں پر اڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”جانی ہو کہ میں دوں ایک اور ہاتھ۔ اور کہاں ہے یہ سفینہ کہاں بھی تھا۔ آج رات ان کے پاس سو جانا۔“ انہوں نے زور سے اس کا بازو پکڑ کر اندر کی طرف کھینچا وہ گھسنے لگی۔

”ایمن! چلو اندر! کیا بکواس کر رہا ہوں میں۔“ اس کی ہٹ دھرمی انہیں اور تپا گئی پلٹ کر گرجے وہ بے آنسوؤں کے ساتھ پوری دھڑائی سے کھڑی رہی۔

”تم ایسے نہیں مانو گی۔“ انہوں نے ایک زوردار تھپڑ اور اس کے منہ پر لگا دیا۔

”دفع ہو اندر!“ اور اسے زور سے کھینچتے ہوئے اندر کمرے میں لے آئے۔ اس تھپڑ نے تو اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا تھا۔ عبیرہ اور فضہ پہلے ہی اندر پہنچ چکی تھیں۔ اندر جا کر انہوں نے زور سے اسے پلنگ کی طرف دھکا دیا اس کا سر زور سے پلنگ کی پشت سے ٹکرایا۔ مارے تکلیف کے اس کی چیخ نکل گئی۔

”کیا کرتے ہیں کہیں چوٹ دوٹ لگ جائے گی۔ جائیں آپ میں سمجھاتی ہوں اسے پیار سے۔“ تائی جی نے مون کو پلنگ پر لٹا کر اسے پکڑنا چاہا مگر وہ تڑپ کر پرے ہو گئی۔

”چھوڑیں مجھے ہاتھ نہ لگائیں۔ آپ لوگ ظالم ہیں۔ ہمارا سارا کچھ ہڑپ کر کے ہمیں بانٹ دینا چاہتے ہیں نا کہ کل کوئی آپ کو پوچھنے والا نہ رہے مگر اللہ تو سب دیکھ رہا ہے نا وہ یہ ظلم نہیں ہونے دے گا اور اگر اللہ بھی ظالموں کا



ساتھ دے گا تو بھی میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ میں پیپا کے دوستوں سے کہوں گی۔ وہ آپ لوگوں پر کیس کر دیں گے۔ آپ لوگوں نے ہمیں قید کر لیا ہے۔ آپ ظالم ہیں۔“ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی، بے ربط جملے اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ اس کی آوازیں سن کر ساتھ والے کمروں سے سفینہ اور عاکف بھی اٹھ کر آگئے۔

”کیا ہوا؟ کیا ہوا بھابھی؟“ سفینہ گھبرا کر آگے بڑھی۔

”ہونا کیا ہے بے وقوف لڑکی اس وقت تینوں بہن بھائی کو لے کر گھر جا رہی تھی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے ولید نے دیکھ لیا اور اب یہ چیخ چیخ کر سارا محلہ اکٹھا کر رہی ہے۔“ تائی جی نے پھر اسے اپنے پاس کھینچنا چاہا وہ اور زور سے بدک گئی۔

”ہاں چیخوں گی اور زور سے چیخوں گی شور مچاؤں گی۔ آپ لوگ ظالم ہیں ہم بہن بھائیوں کو جدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں مارنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پیپا کے گھر پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہاں نہیں رہنا اپنے گھر جانا ہے۔ میں مون کو فضلہ کو کہیں نہیں جانے دوں گی، چاہے آپ لوگ مجھے جان سے مار دیں۔“ چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”دیکھی ہے زبان اس کی، بالشت بھر کی لڑکی کی اور عزائم دیکھو، یہ آگے کیا کرے گی۔“ تائی جی بھڑک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تائی جی نے کندھا پکڑ کر انہیں بٹھانا چاہا۔

”میری ایچی، ایمن بیٹا، جان! کیا ہو گیا ہے تمہیں، کوئی تمہیں جدا نہیں کر رہا بیٹا، اس وقت تو کہیں نہیں جاتے۔ تم خود عقل مند ہو۔ آدھی رات کا وقت ہے خدا نخواستہ کچھ ہو جاتا تو پھر۔“ غزالہ آنٹی لپک کر آگے بڑھیں اور اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”غزالہ! چھوڑو اسے میں دیکھ لیتا ہوں بہت بد تمیز ہو گئی ہے یہ۔“ تائی جی غصے سے بولے۔

”نہیں بھائی جان! غصے سے نہیں پیار سے۔ سمجھ جائے گی بہت اچھی بیٹی ہے ہماری ایچی۔“ غزالہ نے اپنی شال سے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے اس کا منہ چوما۔

”ہمیں اپنے گھر جانے دیں میں اور کچھ نہیں کہتی۔ ہمیں یہاں نہیں رہنا۔ غزالہ آنٹی ہمیں اپنے گھر جانا ہے اپنے پیپا کے گھر۔“ سسکیوں کے درمیان وہ اٹک اٹک کر بولی۔

”ہاں ہاں بیٹا ضرور جانا۔ کیوں نہیں کوئی تمہارے پیپا کا گھر تم سے نہیں چھین رہا وہ تمہارا گھر ہے، تمہارے بہن بھائیوں کا۔ بیٹا مگر اس وقت تو نہیں آدھی رات کو۔ اگر آپ لوگ گم ہو جاتے تو پھر بیٹا میں تمہیں لے جاؤں گی گھر۔ بس اب سو جاؤ۔ صبح چلیں گے ٹھیک ہے۔“ غزالہ نے اسے اپنی گود میں بھرتے ہوئے پیار کیا۔

”غزالہ آنٹی ابھی جانا ہے ابھی۔“ وہ پھر بکھرنے لگی۔

”ہاں بیٹا کمانا، صبح چلیں گے سب۔ بس اب سو جاؤ دیکھو تو کیسے ٹھنڈی برف ہو رہی ہو۔ اس وقت سردی ہے نا صبح چلیں گے۔“ غزالہ نے اسے اپنے ساتھ لپیٹ لیا۔

”چلو بچوں تم بھی اپنے بستروں میں سو جا کر۔ رات بہت ہو گئی ہے اور سفینہ تم مون کو لے کر لیٹ جاؤ۔ یہ ٹھیک

نہیں لگ رہا۔“ غزالہ نے مڑ کر سفینہ سے کہا تو اس نے تائی جی کی گود سے مون کو لے کر دوسرے بیڈ پر لٹا دیا۔ تائی جی سر جھٹکتے ہوئے باہر نکل گئے ان کے پیچھے ہی عاکف چچا نکل گئے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

UrduPhoto.com





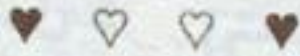
## دوسری قسط

”میں نے پہلے ہی کہا تھا بھائی صاحب سے کہ یہ ٹھیک نہیں اس سے بچے اور زیادہ فرسٹ ہو جائیں گے۔“ غزالہ نے ہلکی ہلکی سسکیاں بھرتی ایمین کو دیکھ کر دم آواز میں سفینہ سے کہا۔

”ہاں تو انہوں نے کون سا اکیلے فیصلہ کیا ہے؟ سب ہی موجود تھے، کوئی ایک پھر لے لے ذمہ داری چاروں کی نہیں پھریہ ہوں گے۔“ وہ ”کیا ہے؟“ تائی جی کو فرسٹ نہیں کہنا آیا تو وہ کہہ کر چپ ہو گئیں۔

”ہاں غزالہ اور کوئی حل بھی تو نہیں تھا نا۔ پھر بے چارے اور کیا کرتے۔ اب تو جو لکھی گئی ہے قدرت کی طرف سے، اسی کو بھگتنا ہے۔ ان معصوموں کو خود ہی صبر آجائے گا۔ دھیرے دھیرے۔“ وہ آہستہ آہستہ مون کو تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

”اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کی کیا مصلحت تھی اس میں آہ۔“ غزالہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ تائی جی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ عیبوہ اور فضہ پہلے ہی مون کے دوسری طرف دیک کر سوچ چکی تھیں مگر ایمین کی سسکیاں ابھی بھی نہیں ٹھم رہی تھیں۔ غزالہ اس کے سرخ پھٹرزہ گالوں کو دیکھ کر رو رہی تھیں۔ پھول سے ملائم گال جنہیں بھی گرم ہوانے بھی نہیں چھوا تھا اب دونوں پر انگلیوں کے نشان جیسے کھد گئے تھے اور ان کے گرد لالی اک آئی تھی۔



پھر وہ دن وہ شدید بخار میں پھنکتی رہی، بخار ایک سو چار درجے سے کم ہی نہیں ہو رہا تھا، دوبار تو اس کی جان کے لالے بڑ گئے۔ تین تین بار ڈاکٹر کو گھر بلا یا گیا تھا اتنی سردی میں بھی بخار کی پٹیاں کی جارہی تھیں، مگر بخار کی شدت کم ہی نہیں ہو رہی تھی اس کے پیلے زرد چہرے سے جیسے خون پھر کر رہ گیا تھا۔ غزالہ آنٹی اور تائی جی نے جی جان سے اس کی دیکھ بھال کی تھی، مگر اسے کچھ ہوش نہیں تھا، بے ہوشی میں بھی ماں، باپ، بہن، بھائیوں اور گھر گھر کو رکارے جارہی تھی۔ اس کی الٹی سیدھی باتیں سن کر اور سب کے دل کٹ رہے تھے، وہی دنوں میں اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ بچانی نہیں جا رہی تھی۔

سفینہ پھوپھو نے جانے سے پہلے صدقے کا کالا بکرا منگوا کر دیا، ان کے جانے تک اس کے بخار کی شدت کچھ کم ہو گئی تھی، لیکن ہوش ابھی بھی پوری طرح نہیں آیا تھا اور اچھا ہی تھا کہ وہ بے ہوش تھی ورنہ فضہ اور مون کے جانے پر پتا نہیں وہ اپنی کیا حالت کر لیتی، جب مون سفینہ کے ساتھ گیا وہ سویا ہوا تھا اور فضہ تو ویسے ہی سہمی ہوئی تھی



اور عاکف چچا نے اس کی انگلی اتنی لاٹھلی سے تھام رکھی تھی کہ وہ ڈر کے مارے کوشش کے باوجود ان کے ساتھ جانے سے انکار نہ کر سکتی۔ اس رات آئی کی پٹائی کا منظر اس کے سامنے تھا، پھر عبیدہ بھی توجہ نہ دے کر بھی اسے روکنے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ مڑ مڑ کر بے سدھ پڑی ایمن اور اس کے پاس سر جھکائے بیٹھی عبیدہ کو دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں سے آنسو ابل ابل کر بہنے لگے سارے بڑے اپنی باتوں میں مصروف تھے کسی کی نظر ان رائیگاں موتیوں پر نہیں پڑ رہی تھی جو ٹوٹے ہوئے خوابوں کی طرح آنکھوں سے برس رہے تھے۔

”چلو عاکف! ہمیں دیر ہو رہی ہے فلائیٹ کا ٹائم ہو رہا ہے ابراہیم کیسی لے آیا ہے ایمن انشا اللہ اب ٹھیک ہو جائے گی تم فون کرو دینا جا کر۔“ تائی جی نے عاکف چچا سے کہا۔

”ہاں میں جا کر فون کروں گا ویسے ہو جائے گی ٹھیک۔ یہ ایک دو روز میں سنبھل جائے گی فکر کی کوئی بات نہیں اور پھر سفینہ تم کل جاؤ گی۔“ وہ سفینہ کی طرف مڑے۔

”ہاں بھائی! میں کل چلی جاؤں گی مون تو اب کافی میرے ساتھ مل گیا ہے بچے تو ویسے بھی پیار کے بھوکے ہوتے ہیں پیار ملے گا تو دو چار ماہ میں سب بھول بھال جائیں گے۔ آپ بھی فضا کا خیال رکھیے گا اور کوشش کیجئے گا دو چار

ماہ بعد اسے ملوانے لے آئیں ادھر دونوں بہنوں سے۔“

”اس طرح تو یہ بار بار ڈسٹرب ہوں گی، میرا تو خیال ہے اب انہیں اپنے اپنے ماحول میں سیٹ ہونے دینا چاہیے۔ ویسے بھی میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا آنے جانے کا۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا۔“ وہ بزنس مین والے مصروف انداز میں بولے۔ ”اچھا بھائی جان! اب جازت دیں۔ مجھے واقعی دیر ہو رہی ہے۔“ وہ اس کی انگلی تھام کر ہر کی طرف بڑھے۔

”آئی! عبیدہ! میں نہیں جاؤں گی۔“ فضا مڑ کر گھٹی گھٹی آواز میں بولی، عبیدہ نے تڑپ کر بہن کی طرف دیکھا جبکہ بڑے کسی نے اس کی فریاد سنی ہی نہیں تھی۔

”چاچو! چاچو!“ عبیدہ عاکف کا دوسرا بازو ہلا کر بولی۔

”چاچو فضا کو رات کو ڈر لگتا ہے یہ بہت جلدی ڈر جاتی ہے آپ اسے اپنے ساتھ سلائیے گا پلیر۔“ وہ کہتے کہتے رو پڑی۔

”اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے یہ وہاں جا کر خوش ہو جائے گی شاباش، روتے نہیں میں اسے ڈھیر سارے کھلونے لے دوں گا سارے پاس ڈھیر ساری ڈالز ہیں یہ نہیں ڈرے گی چلو فضا! اچھا بھئی سب کو خدا حافظ۔“ وہ جلدی جلدی کہہ کر ہر نکل گئے باقی بھی ان کے پیچھے نکل گئے۔

”عبیدہ! عبیدہ!“ فضا ان کے تیز قدموں کا ساتھ دیتے ہوئے ایک بار پھر مڑ کر بے چارگی سے بولی تو عبیدہ وہیں چوکھٹ پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اور جب ایمن کو ہوش آیا تو جیسے سارا میلہ ختم ہو چکا تھا میلے کے شور اور بھیڑ میں عبیدہ فضا اور مون کہیں گم ہو چکے تھے اور اب چاہے وہ کچھ کر دیتی شور مچاتی مسجدوں میں اعلان کرواتی یا اخبار میں اشتہار دیتی وہ اسے نہیں مل سکتے تھے۔ غرا لہ اتنی جلدی جس روز سفینہ پھوپھو مون کو لے کر گئیں اسی روز وہ پھر کو عبیدہ کو لے کر حیدر آباد چلی گئی تھیں تائی جی کہیں باہر گئے ہوئے تھے ابراہیم بھائی ٹیوشن پڑھنے اور ولید کرکٹ کھیلنے۔ تائی جی کچن میں ابھی ہوئی تھیں اور وہ تین تھما کرے میں بیٹھیں ان تینوں کو یاد کر کے روئے جارہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو تائی جی اسے ڈانٹ

کر گئی تھیں۔

”تم نے کیا نحوست پھیلائی ہوئی ہے۔ ہر وقت یہ رونا دھونا مچائے رکھتی ہو تمہارے ماں باپ چلے گئے گھر اجڑ گیا اب اس گھر کو بھی اجاڑنا ہے یہ منحوس ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھر کے۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ بچے ادھر دن ملتا ہے ادھر سارا کچھ بھول بھال جاتے ہیں۔ تم تو اس روگ کو سینے سے چمٹا کر بیٹھ گئی ہو نہ ہم نے مارا ہے تمہارے ماں باپ کو۔ ان کی آئی تھی وہ چلے گئے ہماری آئے گی ہم چلے جائیں گے۔ اس پر تو کسی کا زور نہیں۔ پر بی بی تم نے تو حد ہی کر دی ہے آخر کہاں تک تمہاری دلداریاں کریں ہم۔ ہماری اپنی بھی کوئی زندگی ہے کہ نہیں کہ تمہارے ہی ناز اور جو بچلے اٹھاتے رہیں۔ اب بس کرو بہت ہو گئی دو ماہ بہت ہوتے ہیں۔ کسی کے سوگ کے لیے اس سے زیادہ سوگ تو خدا کو بھی ناپسند ہے۔ انھو اب کچھ دنیا کی طرف دھیان کرو اسکول والوں کو۔۔۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج بھیج کر تاپا تمہارے ٹھک گئے۔ اب انہوں نے سیدھا سادا نام ہی خارج کر دینا ہے۔

پھر کون نئے سرے سے داخلے بھرتا پھرے گا، ایک تو لے کے ماں باپ نے اتنے اونچے اسکولوں میں بھرتی کروا رکھا تھا، جیسے بیٹی کو کشتہ بنانا ہے، چلو یہ چار چھ ماہ تو کٹ لو اس اسکول میں پھر کسی سرکاری ہائی اسکول میں داخل کروا دیں گے، اب ایک تم ہی تو نہیں ہو اپنی بھی اولاد ہے، گھر داری کے سوبے بھیڑے ہیں، دنیا داری بھی نبھانی پڑتی ہے اب تمہارے اماں باوا کی طرح تو نہیں کہہ بس بچوں کو عیش کرا دیے، خود کر لیے نہ کسی سے ملتا، نہ کسی کو دینا دلا نا کہہ جی وقت نہیں ملتا، اب ہم تو یہ لنگڑا بھانا ہر کسی سے نہیں کر سکتے اور اب جو بیٹھے بٹھائے ایک ذمہ داری اور سر پر آن پڑی ہے، اس کو بھی تو دیکھنا ہے اور منگانی کیا کم ہے بھلا، جان کو کھانے کے لیے، ان کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ آج وہ پھٹ ہی پڑیں وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

”اب کیا گونگے کا گڑ کھا کر چھٹی ہو، جو کوئی جواب نہیں۔ کچھ کھا لو، لا دوں یہاں صبح سے دو توں کھا کر بیٹھی ہو، پھر دوائی لو اور کل پرسوں تک اسکول جاؤ یوں ہمارے سر چڑھ کر نہ مرنے۔“ وہ خود ہی بڑبڑاتے ہو کر ہر نکل گئیں تو اس آنسو اور تواتر سے بننے لگے۔

”یہ دن بھی آنے تھے ماما! میں کیا کروں۔ اس سے تو اچھا تھا اس روز میں آپ کے ساتھ چلی جاتی۔ اس طرح یہ سب کچھ نہ دیکھتی فضا مون، عبیدہ سب چلے گئے ماما میں اکیلی رہ گئی۔ مگر نہیں وہ بھی تو اکیلے ہو گئے ہیں۔ ماما! پاپا! یہ سب کیا ہو گیا ہے آپ لوگ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں کس کے پاس جاؤں، کس سے لپٹ کر روؤں، کس کو ماما کہوں اللہ میاں جی آپ نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہم تو چھوٹے چھوٹے سے ہیں ہم نے تو کوئی گناہ بھی نہیں کیا پھر ہمیں یہ سزا کیوں ملی، اتنی بڑی سزا اللہ میاں جی! اس سے بڑی سزا دے لو ہمیں بھی ماما! پاپا! کے پاس بلاؤ، مجھے اب زندہ نہیں رہنا بالکل نہیں رہنا میں کیا کروں ماما! میں کیا کروں۔“

وہ سسک سسک کر تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی، عبیدہ کہتی ہے وہ واپس نہیں آسکتے۔ لیکن ہمیں یہاں سے لے جانا تو آپ کے لیے مشکل نہیں، آپ مجھے یہاں سے اپنے پاس بلا لیں، ماما! پاپا! کے پاس ہم سب کو، ہم سب کو۔ اس کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

اس کی جب آنکھ کھلی تو اس کا سر پھوپھو کی گود میں تھا۔ اور دھڑ دھڑا کی دوسری سیٹ پر پہلے تو اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے حیرانی سے آنکھیں جھپک جھپک کر گود میں لیٹے لیٹے ہی ارد گرد کا ماحول سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے دھیرے دھیرے سر اٹھا کر گود والی کا چہرہ دیکھا۔

”پھوپھو۔!“ اسے کچھ درجہ طمانیت ہوئی کہ وہ پھوپھو کی گود میں ہے۔



”جی میری جان۔۔۔!“ وہ جو اسی کی طرف متوجہ تھیں، بھرپور مسکراہٹ سے اس کا ماتھا چوم کر بولیں۔  
 ”پھوپھو، ہم کہاں ہیں؟“ اس نے ارد گرد گردن گھما کر سینوں پر بیٹھے لوگوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”جان! ہم جہاز میں ہیں، ایروپلین میں، میرے بیٹے کو شوق تھا نا ایروپلین میں بیٹھنے کا۔ وہ دیکھو، ادھر سے نیچے ہمارا ایروپلین کتنا اونچا اڑا رہا ہے۔ آسمان کے اوپر۔“ انہوں نے اس کے بال سنوارتے ہوئے اسے اپنی گود میں بٹھا کر کھڑکی سے نیچے دیکھانا چاہا۔ جہاز واقعی بہت بلندی پر پرواز کر رہا تھا اسے خوف آگیا اس نے فوراً ”گردن پیچھے کر لی۔“  
 ”پھوپھو! آپ کہاں ہے بیرو آپ اور فضہ؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے دل میں مچلتا ہوا سوال بالآخر کر ہی دیا۔  
 ”وہ پاکستان میں ہیں، ہم تو اپنے گھر جا رہے ہیں، شارجہ مون بیٹے کے گھر۔“ انہوں نے پھر اس کے پریشان چہرے کو چوما۔  
 ”اپنے گھر!“ اس کا انداز سوالیہ تھا۔

”ہاں اپنے گھر، وہاں مون بیٹا اپنی گڑیا سی بہنوں کے ساتھ رہے گا۔“ انہوں نے اسے چکارا۔  
 ”بیرو آپ اور فضہ کے ساتھ۔“ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔  
 ”ہاں۔۔۔ وہ بھی ملنے آئیں گی۔ آپ سے میں ندیا اور فیمنال کی بات کر رہی ہوں۔ شارجہ میں آپ کی بہنیں ہیں نا وہ بھی۔“ انہوں نے اس کی توجہ بیٹانا چاہی۔  
 ”ندیا اور فیمنال کون؟“ اس نے حیران سی گول مٹول آنکھیں گھمائیں۔  
 ”بیٹا! آپ کی بہنیں، یاد ہے کچھلی عید پر وہ میرے اور انکل کے ساتھ آئی تھیں آپ کے گھر، ان دونوں نے ریڈ فریک اور ریڈ شوز پہنے ہوئے تھے، ہے نا۔“ انہوں نے اسے یاد دلانا چاہا۔  
 ”وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔“  
 ”ہاں۔ یاد آیا تھوڑا تھوڑا، فیمنال چھوٹی سی ہے۔ براؤن بالوں والی فضہ کی دوست ہے نا پھوپھو؟“ اس نے حافظے پر زور دے کر پوچھا۔

”بس میری جان وہی فیمنال اور ندیا اچھا بیٹا! مجھے یہ بتاؤ میں آپ کو کیسی لگتی ہوں۔“ انہوں نے موضوع بدلے۔  
 اس سوال پر مون نے ذرا مڑ کر از سر نو ان کا جائزہ لیا۔  
 ”اچھی۔۔۔“ اس نے سرسری سے انداز میں کہہ کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔  
 ”صرف اچھی۔۔۔“ پھوپھو نے چہرہ اس کے قریب کیا۔  
 ”نہیں بہت اچھی۔۔۔“ وہ مڑتا ”مسکرا کر بولا۔  
 ”ماما جیسی نا؟“ انہوں نے چہرہ اور اس چہرے کے قریب کر لیا۔  
 ”نہیں ماما جیسی نہیں“ اس نے سختی سے تردید کی۔  
 ”بیٹا! ماما بھی تو پیار کرتی تھیں نا آپ سے میں بھی کرتی ہوں تو پھر ماما جیسی نہ ہوئی۔“ ان کا انداز حسرت والا تھا۔  
 ”لیکن ماما تو نہیں نا!“ وہ اسی ضدی لہجہ میں بولا۔

”مون! میری جان دیکھو نا، اب آپ میرے ساتھ جا رہے ہیں اپنے گھر نیناں اور ندیا کے پاس اور اب آپ کو وہیں رہنا ہے اپنی سسٹرز کے ساتھ، وہ آپ کی سسٹرز ہیں نا!“ انہوں نے سوال کیا۔  
 ”ہوں“ وہ ناگجھی سے بولا۔  
 ”تو جب وہ آپ کی سسٹرز ہیں میں ان کی ماما ہوں تو پھر آپ کی بھی ماما ہوئی نا۔ ہے نا“ وہ ان کی کراس کو ٹھٹک

سے کنفیوز ہو گیا۔  
 ”لیکن میری سسٹرز تو امی آپ اور عبیرہ آپ اور فضہ ہیں۔“ وہ پھر اس کی طرف آگیا۔  
 ”وہ بھی ہیں لیکن فیمنال اور ندیا نہیں۔“ محبت بھی کتنی بڑی بلیک میلنگ ہے چھوٹا سا بچہ بھی اس کے ہاتھوں بلیک میل ہو گیا۔  
 ”ہاں وہ بھی ہیں۔“ وہ پھر مڑتا ”بولا۔  
 ”تو میں ان کی ماما نہیں۔“  
 ”ہاں ہیں۔۔۔“  
 ”تو پھر میں آپ کی بھی ماما ہوئی نا!“ انہوں نے پھر اسے گھیر لیا۔

وہ چپ رہا۔  
 ”ہوں نا۔۔۔ کو بیٹا! مجھے ماما۔“ انہوں نے پیار سے اس کے دونوں گال چوم کر کہا وہ خاموشی سے انہیں تنکے گیا۔  
 ”کو نا ماما!“ اس کی خاموشی ان کے اصرار کو بڑھا رہی تھی۔  
 ”کو نا۔۔۔“  
 ”ماما۔۔۔!“ اس نے فقط لب لائے۔  
 ”میں قربان اپنے بیٹے پر۔۔۔ اونچی آواز میں بولتا میں نے تو سنا ہی نہیں۔“ وہ لاڈ سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولیں وہ چپ رہا۔  
 ”مون کو نا ماما!“ انہوں نے چہرہ اس کے ہونٹوں کے قریب کیا۔  
 ”کو نا ماما!“

”ماما۔۔۔ ماما۔۔۔ ماں کہاں چلی گئیں پھوپھو! ماما کہاں ہیں میری ماما!“ وہ ایک دم سے رونے لگا۔ اس کی فریاد پر ان کی آنکھیں بھر بھر آئیں۔  
 ”بیٹا! ماما اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی ہیں نا، میں ہوں اپنی جان کی ماما! میں پیار کرتی ہوں نا آپ سے۔ ابھی گھر جا کر دھیروں کھلونے لے کر دوں گی، صرف مجھے ماما کو۔ میں آپ کی ماما! اپنے مون کی ماما!“ وہ فرط محبت سے زور زور سے اس کا منہ چومتے ہوئے بولیں۔  
 ”ماما! اب نہیں آئیں گی کبھی بھی۔“ اس نے بوسوں کی بوچھاڑ کے درمیان مدھم آواز میں پوچھا۔ تو انہوں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔  
 ”میرا بچہ، میری جان! میرا مون! میں ہوں آپ کی ماما ہمیشہ آپ کی، اب میری جان کیا کھائے گا۔ ہوں، جو س منگو اؤں اپنے بیٹے کے لیے اور بسکٹ بھی۔“  
 اس نے کوئی جواب دیے بغیر ان کے سینے میں منہ چھپا لیا تو سفینہ نے ایئر ہو سٹس کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔

”عبیرہ جانو! آپ تو پہلے بھی یہاں آتی رہی ہیں ماما کے ساتھ، بیٹا آپ کو تو پتا ہے نا یہ گھر چھوٹا ہے، بس تین کمرے ہیں ادھر اب آپ کو اپنی بہنوں کے ساتھ ہی رہنا پڑے گا۔ اسی کمرے میں میں، میں آپ کے لیے بیڈ منگوالوں کی جلد ہی بس ابھی کچھ دن آپ کو اپنی بہنوں کے ساتھ نیچے بستر لگا کر سونا پڑے گا آئی ایم سوری بیٹا! آپ کی خاطر میں آپ کو علیحدہ کمرہ اور دوسری سوئیں پروائیڈ نہیں کر سکتی۔“  
 غزالہ کہتے کہتے شرمندگی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔ وہ دوسرے کو آئی تھی غزالہ آنٹی کے ساتھ، اب وہ اسے اپنی



بیٹیوں کے کمرے میں لیے بیٹھی تھیں، جہاں نیچے زمین پر فوم کے گدے بچھا کر بستر لگائے جا چکے تھے۔ اور وہاں انہیں اپنے اپنے لفافوں میں دبی اپنی اپنی کتابیں لے کر بیٹھی ہوئی تھیں، ان کی دو بیٹیاں عبیدہ سے بڑی تھیں۔ ایک اس کی ہم عمر اور دو چھوٹی تھیں اسے بھی ان کے نام یاد نہیں ہوئے تھے۔ سوائے اپنی ہم عمر تانیہ کے اور اب اسے مستقل یہاں رہنا تھا ان کے ساتھ پہلے جب وہ ماما کے ساتھ آتی تو اسے پتا نہیں چلتا تھا کہ غزالہ آنٹی کی کتنی بیٹیاں ہیں اور اب یہاں ان کے ساتھ اسے نیچے فرش پر سونا تھا۔ آلو کھا کھا کر، حالانکہ آج رات کا کھانا بڑا زبردست تھا، چکن کڑاہی اور شکم گوشت لیکن اسے تھوڑا تھوڑا سا احساس تھا کہ اس طرح کے کھانے روز نہیں ملا کریں گے کیونکہ وہ جب بھی ماما کے ساتھ ادھر آتی تھی غزالہ آنٹی آلوؤں کے ساتھ کوئی نہ کوئی سبزی ڈال کر پکایا کرتی تھیں۔

”کوئی بات نہیں آنٹی میں سو جاؤں گی یہاں۔“ وہ کچھ دیر بعد ان کا ہاتھ ذرا سادبا کر مروت سے بولی۔  
 ”بس بیٹا! دو چار دن پھر آپ کا بیڈ آجائے گا تو آپ اس پر سو جایا کرنا۔“ وہ پیار سے بولیں۔  
 ”ٹھیک ہے آنٹی! میں اب سو جاؤں مجھے نیند آرہی ہے۔“ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ بہانا بنا کر بولی۔  
 ”بیٹا! بہنوں سے گپ شپ نہیں لڑاؤ گی۔“ وہ یہ بڑی اچھی Story teller ہے۔ اس سے کوئی استوری سن لو۔ ابھی تو دس بھی نہیں بجے۔“ انہوں نے محبت سے اس کے بالوں کو سنوارا۔  
 ”نہیں آنٹی! اہل آج مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ اٹھ کر لحاف ٹانگوں پر لے کر لیٹ گئی۔  
 ”اچھا چلو ٹھیک ہے سو جاؤ پھر۔“ انہوں نے جھک کر اس کا ہاتھ چومالو اور کھڑی ہو گئیں۔  
 ”چلو بھی، تم لوگ بھی لائٹ آف کر دو۔“ بن کو نیند آرہی ہے باقی صبح نماز کے بعد پڑھ لینا۔ میں زیرو کا بلب جلا رہی ہوں۔“

ان کے اتنا کہنے پر ہی سب نے تابعداری سے کسی رو بوٹ کی طرح کتابیں بند کیں اور سائینڈوں پر رکھ کر آرام سے لیٹ گئیں۔ غزالہ آنٹی نے مین لائٹ آف کر کے زیرو کا بلب جلا دیا۔ کمرے میں ہلکی سبز رنگ کی روشنی پھیل گئی۔ وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل گئیں۔

مایا تو غزالہ آنٹی کے گھر بہت کم آتے تھے۔ زیادہ تر ماما ہی آتی تھیں، وہ بھی ایمین یا عبیدہ کے ساتھ، فضلہ اور مون کو بھی وہ بہت کم لاتی تھیں وہ دونوں تو شور مچانا شروع کر دیتے تھے۔ ”ماما یہاں گرمی ہے۔ یہ گھر کتنا چھوٹا ہے، ہم کھیلیں کہاں۔ ان کے گھر میں ٹھنڈا پانی بھی نہیں ہے۔ ماما ان کا فریج ہر وقت خراب کیوں رہتا ہے۔ یہ نیا کیوں نہیں لے لیتے۔ ماما! غزالہ آنٹی نے آپ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں جو آپ نے پچھلی عید پر پہنے تھے۔ نا، ہمیں نے دال نہیں کھانی اور کبابوں میں تو مرچیں بہت ہیں۔ ہم نہیں کھائیں گے۔“ رعبہ آپنی نے ایسی آپنی کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں نا۔“

وہ دونوں بہت منہ پھٹ تھیں۔ ماما کے بہت لاڈلے تھے۔ ماما انہیں ڈانٹتیں، جھڑکتیں، گھورتیں مگر ان پر ذرا اثر نہ ہوتا اور غزالہ آنٹی بے چاری شرمندہ ہو ہو جاتیں پھر ماما نے ان دونوں کو لانا ہی چھوڑ دیا۔ ایمین یا عبیدہ کو لے آئیں۔ دونوں سب کچھ دیکھ کر پہچان بھی لیتیں تو ان کی طرح بولتی نہیں تھیں۔

ماما بھی غزالہ آنٹی کے گھر خالی ہاتھ نہ آتیں۔ ڈھیروں فروٹ، مٹھائیاں، موسم کی سوغاتیں، خشک میوے، غزالہ آنٹی کا اور بچوں کا ایک ایک نیا سوٹ اور باقی ایمین اور عبیدہ وغیرہ کے کپڑے جو اچھی حالت میں ہوتے عبیدہ نے اکثر دیکھا تھا، وہ جاتے جاتے ان کے ہاتھوں میں بھی ہزار کا ایک اور کبھی دو نوٹ دے کر جاتی تھیں، ان کے ساتھ بیٹھ کر دال سبزی اور کڑھی وغیرہ شوق سے کھاتیں، بچوں کے ساتھ کھل مل جاتی تھیں ان کے ساتھ مذاق کرتیں، انکل جمال کی بھی ماما بہت عزت کرتی تھیں۔ ماما کم کم ادھر آتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اتنے عرصے میں غزالہ

آنٹی کے گھر جانے کی تیاری، جوڑتی رہتی تھیں پانی پانی کر کے۔ غزالہ آنٹی سرکاری مڈل اسکول میں منچر تھیں اور انکل جمال ہائی اسکول میں، اور سرکاری منچرز کا جو حال ہوتا ہے وہی ان کا تھا پھر اوپر تلے پانچ بیٹیاں جنہوں نے ابھی سے ان کی راتوں کی نیند اڑا رکھی تھی۔

غزالہ آنٹی شام کو کھلے کے بچوں کو یوشن پڑھاتی تھیں اور جمال انکل بھی ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے پھر بھی ان کا گزارہ مرمر کر ہوتا تھا کہ سارا کچھ انہوں نے آج کے لیے نہیں کمانا ہوتا تھا، جوان ہوتی بیٹیوں کے لیے بھی کچھ پس انداز کرنا تھا۔ پہلے تو ماما کی وجہ سے بھی غزالہ آنٹی کی زندگی خاصی سہل تھی اور اب! اب کیا ہوگا۔ ”میں یہاں کیسے رہوں گی۔ اللہ تعالیٰ میں کیا کروں۔ ایک دم سے یہ سب کیا ہو گیا، ماما! پادونوں چلے گئے۔ دونوں میں محبت تو مثالی تھی مگر یہ تو کبھی خیال بھی نہیں گزرا تھا کہ اس درجہ ہے کہ دونوں اکٹھے ہی۔“

اس کے منہ سے سسکی نکل گئی وہ لحاف میں منہ سر چھپائے بیٹھی تھی۔  
 ”اب اس طرح رہنا انکل اور آنٹی پر بوجھ بن کر پانچ کی جگہ چھ بوجھ اور پھر ساری عمر کے لیے کاش ہم اپنے گھر جاسکتے، ہم اکٹھے رہ سکتے، مون کیسا ہوگا؟ فضلہ، فضلہ کتنا رو رہی تھی کتنا ڈری ہوئی تھی وہ اور ایسی کو تو کتنا بخار تھا پتا نہیں اس کا بخار ٹھیک ہوا کہ نہیں، اس کو تو بخار بھی چڑھتا تھا تو کئی کئی دن نہیں اترتا تھا۔ پیپا کے دوست ڈاکٹر نصیری اسے ٹریٹ کرتے تھے، مگر وہ تو اسپتال میں تھے۔ تایا جی کہاں دکھاتے۔ ماما ایسی بہت بیمار ہے اور میں یہاں ہوں، مون کہاں ہوگا، ہم کیا کریں۔ ماما، ہمیں اپنے پاس بلا لیں۔“

آنسو تو اتر سے بہنے لگے۔  
 ”فضلہ کا کیا حال ہوگا۔ مجھے پتا ہے، وہ بہت ڈر بوک ہے۔ کسی سے کچھ نہیں کہے گی۔ اللہ تعالیٰ میری بہن کو اچھا رکھنا، عاکف چچا اسے پیار سے رکھیں۔ ماما کہتی تھیں۔ میری انضی تو پیار کا پھول ہے۔ جو صرف محبت اور توجہ کی ہوا میں کھلتا ہے۔ ذرا سی بے توجہی، بے گانگی پر تو یہ مرجھا جاتا ہے۔ سکندر آپ اس کا خیال رکھا کریں۔ اور اب! اب اس کا خیال کون رکھے گا۔ ماما ہم بھی نہیں۔ میں کیا کروں کاش اسے اپنے پاس رکھ سکتی۔ ماما یہ کیا ہو گیا ہمارے ساتھ۔“

اس کا لحاف اس کی ہچکیوں سے مل رہا تھا۔

عبیدہ اور ایمین جتنا فضلہ کو ڈر بوک اور بزدل سمجھتی تھیں۔ وہ ان کے اندازوں سے کیسے بڑھ کر سہمی ہوئی تھی۔ ایک تو اتنا بڑا حادثہ پھر پے در پے زخم، ایسی آپنی کی تایا جی کے ہاتھوں پٹائی۔ مون کا طویل بخار، سب لوگوں کی ترس، آمیزنگاہیں اور بیزار رویے، وہ اور ہی سہم کر رہ گئی تھی۔ عاکف چچا کو تو اس نے اپنے ہوش میں صرف دو بار اپنے گھر آتے دیکھا تھا ان کا رویہ بچوں کے ساتھ بے حد سرسری سا ہوتا تھا اور فضلہ کو تو یقین تھا کہ عاکف چچا کو کم از کم اس کا نام نہیں معلوم ہوگا، اور اس کا یہ اندازہ درست نکلا پلین کے سفر کے دوران انہوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ صرف اپنا بریف کیس کھول کر انگریزی ٹائپ شدہ کانفڈنل کا پلندہ آگے رکھے پورے انتہاک سے پڑھتے رہتے تھے صرف ایک بار ایئر ہو سٹس کے آنے پر انہوں نے اس کے لیے جوس لیا تھا، خود انہوں نے وہ بھی نہیں پیا تھا اس کے بعد پھر وہ ان کانفڈنل میں ڈوب گئے تھے۔ وہ چپ چاپ جوس گھونٹ گھونٹ اندر اتارتی رہی تھی۔ ایر پورٹ پر ان کا ڈرائیور گاڑی لے کر آیا تھا۔ کراچی میں گھر سے ایر پورٹ تک انہوں نے اس کی انگلی تھامے رکھی تھی۔ اور اب جہاز سے اترتے ہی ان کا رویہ مزید اجنبی ہو گیا تھا وہ ان کے تیز قدموں کا ساتھ دینے کے لیے تقریباً ”دو ڈرہی“ تھی۔ ڈرائیور نے پچھلا دروازہ ان کے لیے کھولا۔ انہوں نے ذرا سا کھسک کر اس کے لیے جگہ بنائی۔

”آجاف۔“ سہ حرفی جملہ یا فقرہ جو انہوں نے ان تین گھنٹوں کی ہمراہی کے دوران بولا تھا اسے خوش کر گیا۔ وہ



سمٹ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔

وہ کھڑکی سے باہر کے نظاروں میں مگن تھی۔ بھاگتی دوڑتی دنیا بھی کیا عجیب چیز ہے انسان کتنا ہی خود میں مگن کیوں نہ ہو وہ کچھ دیر کے لیے اس کی توجہ ضرور اپنی طرف مبذول کرتی ہے کوئی ان نظاروں میں کھو جاتا ہے۔ کوئی اکٹا کر منہ موڑ لیتا ہے اور منہ موڑنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔

لاہور وہ صرف ایک بار ماما پاپا کے ساتھ آئی تھی۔ پچھلے سال پاپا کے کسی دوست کی شادی تھی وہ لوگ دو دن لاہور میں رہتے تھے۔ اس وقت وہ عاکف چچا کی طرف نہیں گئے تھے۔ صرف ماما اور پاپا جا کر ان سے مل آئے تھے۔ پاپا نے انہیں دو دن میں آدھالاہور گھما دیا تھا جو اے لینڈ اسکاٹ لینڈ میکڈونلڈز مینار پاکستان شاہی قلعہ بادشاہی مسجد اور ریس کورس ٹائم کم ہونے کی وجہ سے کئی مقامات رہ گئے تھے جس کا پاپا نے فیکسٹ ٹائم دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ جو اب بھی ایفا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے پھر سے پاپا یاد آنے لگے پاپا سب سے زیادہ اسی سے پیار کرتے تھے مون سے بھی زیادہ اور سب کہتے تھے فضہ تو بالکل سکندر کی ڈپلی کیٹ ہے۔ وہی براؤن آنکھیں باداموں جیسی براؤن بال سنہری رنگ اور چہرے کا بھولہ پن سب کو اس کی طرف متوجہ کر لیتا تھا۔

”ہاں مجھے یاد آیا تمہارا نام عبیرہ ہے نا؟“ عاکف چچا کی اچانک آواز پر وہ اچھل ہی پڑی یادوں کے بھنور میں الجھا اس کا دل زور زور سے دھڑکا تھا۔ ماما کہتی تھیں یہ ہے ہی ایسی ڈرپوک سی کوئی اوپھی آواز میں بلا لے۔ اس کی چیخ نکل جاتی ہے۔

”جی جی۔“ اس نے بمشکل تھوک نگلا۔

”ہوں!“ وہ پھر باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ گھر آنے تک کوشش کے باوجود انہیں یہ بتا ہی نہ سکی کہ وہ عبیرہ نہیں فضہ ہے۔ اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس طرح اپنا تعارف کرانے کا بھی موقع ہی نہیں آیا تھا پاپا ماما کی آئی اور عبیرہ آپلی سب سے بڑے لاڈ بڑے فخر سے متعارف کراتے تھے۔

”یہ ہماری فضی ہے“ فضہ سکندر کتنی پیاری ہے، ہے نا اور ہم میں سب سے زیادہ ڈرپوک اور بے وقوف۔“ عبیرہ آپلی کے ان کنٹنس پر اس کی آنکھیں ایک پل میں موٹے موٹے آنسو تیار کر لیتی تھیں جس پر انہیں پاپا سے ڈانٹ پڑتی تھی۔

”نہ فضی! مجھے بتاؤ تمہارے اندر کون سی فیکٹری فٹ ہے جو اتنے ارجنٹ نوٹس پر دھڑا دھڑیہ موٹے موٹے آنسو تیار کر کے آنکھوں سے باہر روانہ کر دیتی ہے۔“ ایسی آپلی اس کے ”فی البدیہہ آنسوؤں“ کا مذاق اڑاتی وہ اور رونے لگ جاتی اور اب۔۔۔؟ اس کی آنکھوں نے فوراً ”دو موٹی پکا دیے۔“

گاڑی وائٹ گیٹ کے آگے ہارن بجارہی تھی۔

اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ پتا نہیں آئی اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں؟ اس نے تو صرف انہیں ایک بار دیکھا تھا تائی جی کے گھر۔ ”انتہائی خوبصورت اور انتہائی مغرور۔“ یہ سفینہ پھوپھو اور تائی جی کے مشترکہ ریمارکس تھے جو انہوں نے نرگس آنٹی کے بارے میں دیے تھے اور اب؟ اس کی نگاہیں گیٹ کھلنے کی منتظر تھیں۔

ندیا اور فیمنال واقعی گریوں جیسی تھیں گوری جیسی موٹی موٹی آنکھوں والی پھولے پھولے فراکوں میں ان کے گول مٹول جسم اور بھی صحت مند لگ رہے تھے۔ ان دونوں نے مون کا بڑی محبت اور خوشی سے استقبال کیا تھا وہ نیچر انکل کے ساتھ مون اور پھوپھو کو لینے پر پورٹ آئی تھیں کوئیر انکل کا انداز لیا دیا تھا بہت فارمل قسم کا اس میں وہ بے ساختگی اور گرمجوشی نہیں تھی جو پھوپھو، ندیا اور فیمنال کے رویوں میں تھی۔ چھوٹے بچے رویوں کے فرق کو بڑی جلدی اور اچھی طرح پرکھ لیتے ہیں۔ اسے بھی فوراً اس کا احساس ہو گیا تھا اسی لیے وہ زبیر انکل سے کچھ

عاکف سا ہو گیا تھا۔

سفینہ پھوپھو کا گھر بہت خوبصورت تھا اسٹائلش اور جدید سہولتوں سے مزین۔ فیمنال اور ندیا نے اس کا کمرہ اپنے کمرے کے ساتھ ڈیکوریٹ کیا تھا چھوٹا سا کمرہ کھلونوں اور پوشیز سے سجا ہوا تھا اس کے سنگل بیڈ پر بلی پینک کلر کا ڈاکس والی بید شیٹ پچھی تھی اور اسی کلر کے پردے تھے قالین ریڈ کلر کا تھا۔

”یہ مون تمہارا کمرہ ہے، ڈیولائیٹک اٹ؟ ہم نے خود اسے ڈیکوریٹ کیا ہے۔“ ندیا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے کی مانی تھی۔ اور بڑے فخر سے بتا رہی تھی فیمنال اور پھوپھو ان کے پیچھے کھڑی تھیں۔

”لیکن میں تو اکیلا نہیں سوتا میں تو فضی کے ساتھ سوتا تھا اور جب وہ ڈر جاتی تھی تو پھر دونوں ماما اور پاپا کے ہاتھ۔“ کمرہ دیکھ کر دل خوش ہوا تھا مگر اکیلے سونے کی پریشانی بھی ہوئی تھی۔

”تو کیا ہوا؟ میں تمہارے کمرے میں سو جایا کروں گی چند دن بعد جب تمہیں عادت ہو جائے گی تو تم اکیلے سو جایا کرنا۔“ ندیا جھٹ سے بولی ”یہاں سب کے علیحدہ رومز ہیں، میرا فیمنال کا پاپا اور ماما کا ایک ہی ہے۔ تمہیں ابھی عاکف میں گئے۔“

”جی نہیں، مون کے ساتھ میں سوؤں گی، تم اپنے کمرے میں سویا کرنا۔“ فیمنال جلدی سے آگے آکر ندیا سے بات جی نہیں نہیں تم تو خود ڈرپوک ہو اسے بھی ڈراؤ گی۔“ ندیا مون کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

”تم ہو گی ڈرپوک میں تو ہمارے ہوں جب ماما پاکستان گئی ہوئی تھیں تو رات کو اٹھ اٹھ کر پاپا کے پاس کون جاتا تھا پاپا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ فیمنال نے اسے فوراً یاد دلایا۔

”ہاں تو اب ماما یہاں ہیں نا اب تو میں نہیں ڈروں گی۔“ ندیا سنبھل کر بولی۔

”فضول کی بحث، کوئی تمہیں سوئے گا مون کے ساتھ۔“ پھوپھو آگے بڑھ کر بولیں، میں سوؤں گی اپنے بیٹے کے ہاتھ پھر یہ بہت جلد خود سونے کا عادی ہو جائے گا۔ ابھی اس کا اسکول میں ایڈمیشن بھی کروانا ہے۔“ پھوپھو نے گے بڑھ کر اسے پیار کیا۔

”سوری پھوپھو۔۔۔ ماما!“

”میں ویری گنڈ۔۔۔ مائی انوسنٹ چائلڈ۔“ سفینہ نے اسے جھک کر گود میں اٹھالیا۔

”ماما! میرے اسکول میں داخل کرائیے گا مون کو۔“ ندیا فوراً بولی ”میں اپنی سب فرینڈز کو بتاؤں گی کہ مون میرا بے ہے۔ اب یہ یہیں رہے گا ہمارے پاس ہے نا ماما۔“

”بالکل۔۔۔“ سفینہ نے ذرا سا ہنس کر کہا۔

”ماما! مون میرے اسکول میں داخل ہو گا، ندیا کے اسکول میں تو بڑے بڑے بچے ہوتے ہیں یہ تو مونفیسوری جائے گا۔ میرے اسکول ہے نا۔“ فیمنال سفینہ کا بازو ہلا کر بولی۔

”ہاں بھئی، مون ابھی مونفیسوری میں جائے گا، بعد میں تم تینوں ایک ہی اسکول میں ہو گے یعنی ندیا کے اسکول، ٹھیک ہے نا۔“ وہ ندیا سے بولیں۔

”جی ٹھیک ہے۔“ وہ منہ بسور کو بولی۔

کیا اب سارا دن ان ہی چوپچلوں میں گزار دینا ہے۔ اتنا ٹائم ہو گیا ہے بھوک کی وجہ سے برا حال ہو رہا ہے۔ کس کوئی خیال ہے۔ پورے ڈیڑھ ماہ بعد تو محترمہ تشریف لائی ہیں۔ ”اچانک عتب سے انکل زبیر کی روکھی آواز ندیا تو سفینہ نے فوراً ”مون کو نیچے اتار دیا۔“

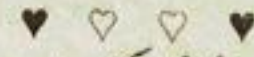
وہ یہ بچیاں مون کو اس کا کمرہ دکھانے لے آئی تھیں۔ ”وہ کچھ معذرت خواہانہ انداز میں بولیں اور باہر کی سب بڑھ گئیں۔“



”مون کہیں بھاگا جا رہا ہے نہ اس کا کمرہ اب یہ یہیں ہے تو پھر یہ بے صبری کیسی۔“ وہ اسی بیزار اور سرد لہجے میں بولے ”مون جلدی سے کھسک کر فیماں کے قریب ہو گیا۔“

”چلو تم دونوں بھی ابھی ہوم ورک بھی کرنا ہے۔ ٹیوٹر آنے والی ہیں آپ کی۔ کھانا کھا کر پڑھنے بیٹھو۔“

وہ فیماں اور دنیا سے ذرا ڈپٹ کر بولے تو وہ دونوں گھبرا کر ماں کے پیچھے باہر نکل گئیں۔ مون کچھ دیر کھڑا رہا جب انکل زبیر باہر نکل گئے۔ تو وہ بھی ڈھیلے قدموں سے ان کے پیچھے چل پڑا کارڈور میں انہوں نے سردی اجنبی نگاہ مڑ کر اس پر ڈالی اور پھر کندھے جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔ اس کے سہمے سے دل پہ اوس گر گئی۔



”اب روز روز چکن گوشت قیمہ میں تو نہیں افورڈ کر سکتا۔ سارے حالات تمہارے سامنے ہیں یا تو میں تم سے کچھ چھپاتا ہوں یا الگ رکھتا ہوں تو تم الزام بھی دو۔ کس کا دل نہیں چاہتا یہ سب پکانے کو اپنے بچوں کو کھلانے کو کتنا دل دکھتا ہے۔ جب میں کوشش کے باوجود انہیں صرف دال اور سبزیاں ہی مہیا کرتا ہوں۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں رزق حلال میں تو یہی کچھ ممکن ہے اور پھر آج کی وحشت انگیز منگانی کے زمانے میں اگر ایک سرکاری اسکول ٹیچر عزت و آبرو سے دال روٹی بھی اپنے بچوں کو کھلا سکتا ہے تو یہ بھی کارنامے میں شمار ہوتا ہے تم خود سوچو۔“ انکل جمال ایک گہری سانس لے کر چپ ہو گئے۔

”جمال ! میں کیا کروں مجھے بھی تو بتائیں ابھی اس کا زخم تازہ ہے، سنبھلنے میں کچھ وقت لگے گا پھر خود ہی آہستہ آہستہ ایڈ ہو جائے گی۔ سمجھ دار ہے خود ہی سمجھ جائے گی۔ لیکن ابھی میں اسے اس بات کا احساس دلانا نہیں چاہتی کہ وہ ہم پر بوجھ ہے اور۔“

”یہ احساس تو تم اسے خود بخود لارہی ہو اپنی گنجائش سے بڑھ کر اس کی خاطر تواضع کر کے غزالہ اب اس نے یہیں رہنا ہے۔ دو چار دن کے لیے نہیں رہنا ہے۔ دو چار دن کے لیے نہیں آئی وہ جو تم ان تکلفات میں پڑو۔ سمجھ دار ہے تمہارا ذرا سا اشارہ بھی سمجھ جائے گی۔ میرا خود دل نہیں چاہتا کہ شہلا کے بچے اس طرح زندگی گزاریں اب کیا کر سکتے ہیں۔“

انہوں نے تو بچوں کو پھولوں کی بیج بر رکھا تھا اب زندگی انہیں حقائق کے کانٹوں میں دھکیلنا چاہ رہی ہے تو میں یا تم اسے فرد نہیں کر سکتے۔ کوشش کر سکتے ہیں کہ ان کانٹوں کی موجودگی کے باوجود ان کی زندگی کو کچھ سہل بنا سکیں۔ حقائق کی تلخی ان چکن کبابوں یا گوشت سے کم نہیں ہو جائے گی انہیں زندگی اتنا بڑا ہاتھ دکھا چکی ہے کہ ساری دنیا کے خزانے اور عیش مل کر بھی اس کی تلافی نہیں کر سکتے یہ حکم رہی ہے اور اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ سوائے اسی رب کے عبیدہ کو تم گھر کے ماحول میں کس کرنے کی کوشش کرو۔ اسے محبت اور اچھی تربیت دو اچھے اخلاق اور اچھے کردار کا شفاف آئینہ بناؤ۔ ان ابدی نعمتوں کے مقابلے میں لمحاتی نعمتیں کچھ معنی نہیں رکھتیں یہ باتیں تم مجھ سے زیادہ سمجھتی ہو پھر یہ سب۔“ وہ جیسے تھک کر چپ کر گئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

ابھی نیا نیا صدمہ ہے کوشش تو کر رہی ہوں بچیاں ابھی اسے بھرپور محبت اور توجہ دینے کی کوشش کر رہی ہیں مگر یہ وہی آپ کی بات صحیح ہے کہ جتنا بڑا نقصان ان کا ہو چکا ان چیزوں سے اس کی تلافی ممکن نہیں لیکن ابھی ان کے منہ ذہن اس خسارے کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں اب اگر میں اس پر ناپسندیدہ کھانے بھی کھوں تو سوچیں اس کے معصوم دل پر یا گزرے گی۔ پہلا تکلیف وہ احساس اسے ان لذتوں سے محرومی کا ہو گا۔ کیا کروں جمال مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہاں بابا کے شہلا کیا سوچے گی میں اس کی پھولوں کی نازک گلیاں چند دن بھی تواضع نہ کر سکی۔ کچھ پیسے ہیں میرے پاس آپ لے جائیں۔ یہ مہینہ تو نکالیں پھر بعد کی باتیں ہیں گے ابھی اس کا اپنے اسکول میں ایڈمیشن کرانا ہے وہ اسی سے خاصی چپ چپ ہے افسوس میں کچھ بھی نہیں

کر سکتی چاہتے ہوئے بھی غزالہ آنٹی کا لہجہ افسوس بھرا تھا۔

”ساری بچت تو لگ چکی اب کیا پڑا ہے تمہارے پاس۔“ جمال انکل تلخی سے بولے۔ ”اور ہاں جس طرح کا بیڈ تم اس کے لیے پسند کر کے آئی تھیں وہ تو دس ہزار سے کم پر مان نہیں رہا بہت اصرار کے بعد ڈیڑھ ہزار کم کیے ہیں اس نے اس کا تو یہ مطلب ہے کہ میں کم از کم اپنی تین بچیوں کے گلے کھونٹ دوں یا ان کو سمندر کے حوالے کر آؤں یا پھر پورے دو مہینے آٹھ افراد پر مشتمل یہ کنبہ مکمل فاقہ کشی کرے پھر وہ بیڈ آسکتا ہے۔ مجھے بتاؤ تمہیں ان دونوں رستوں میں سے کون سا پسند ہے۔ وہ اختیار کر لیتا ہوں۔“ انکل جمال کی لہجے میں تلخی غصہ اور بیزاری تھی۔

اس سے زیادہ اس سے کچھ نہ سنا گیا۔ وہ چپکے سے کھڑکی سے ہٹ کر اندر کمرے میں جا بیٹھی۔ وہ تو اتنے دنوں سے اپنے ہی غم میں الجھی ہوئی تھی۔ اسے تو احساس ہی نہیں تھا کہ اس کے دو چار اچھے نوالوں کی قیمت یہ خاندان کس صورت میں چکا رہا ہے۔ اتنی سی عمر میں کب اندازہ ہوتا ہے۔ مٹن اور چکن کتنے کلو ملتا ہے یا آج کل انار کیلوں کی نسبت کتنے مہنگے ہیں یا آؤں کریم اور کولڈرنک کھانے پینے کی بنیادی ضروریات سے ہٹ کر کیا عیاشیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس عمر میں تو بس جو چیز نگاہ کو بھلی لگتی ہے جس کو دل طلب کرتا ہے بس وہی کھانے کو جی چاہتا ہے اور پھر جب روپے پیسے کی بھی فراوانی ہو اور خدا کے فضل کی بھی تو پھر اتنی سطحی اور عامیانہ سی باتیں کون کون سوچ سکتا ہے اسے آلو پسند نہیں تھے۔ ماما اس کے لیے کباب فرانی کر لائیں یا ڈرم اسٹیکس آجائے اور کچھ نہیں تو پیلا اس کے لیے پزائے آتے ساتھ میں پیسی تو لازماً ہوتی تو اسے لگتا کہ آلو اور دال کا متبادل پزایا چکن بیٹڈ ہیں اگرچہ کبھی بھی ماما اسے ڈانٹ دیتیں کہ اگر کل کو تمہیں آلو کھانا پڑے تو کیا کرو گی وہ فوراً ”جواب دیتی“ ماما میں بھوک رہ لوں گی مگر آلو نہیں کھاؤں گی۔“ اور اس وقت تو اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ بھوک ہوتی کیا ہے اور یہ دنیا کے ملک ترین ہتھیاروں سے زیادہ خطرناک زیادہ تباہ کن ہوتی ہے جب اس کا غلبہ ہوتا ہے تو اشرف المخلوقات اپنی بند منہبی سے بہت نیچے حیوانیت کے درجے کو چھو لیتا ہے پیٹ کا دونخ آگ کے دونخ سے زیادہ شدید اور ناقابل برداشت ہوتا ہے اس کا احساس صرف اسے ہوتا ہے جو اس کو سہتا ہے ورنہ تو پوری دنیا اناج سے بھری ہوئی ہے لیکن اس سب کے لیے تو نہیں کچھ لوگوں کو تو اس میں سے محض زندہ رہنے کے لیے تھوڑے سے ایندھن کے لیے ہی جان لڑا دینا پڑتی ہے۔

اور غزالہ آنٹی اور انکل جمال پانچ بچوں کے اس کنبے کے اس دونخ کو جس طرح دن رات ایندھن فراہم کر رہے تھے اسے اب اس کا اندازہ ہو رہا تھا اور اس کے لیے اپنی ساری بچت اور پس انداز کی ہوئی رقم کو جس طرح خرچ کر رہے تھے محض اس کی زبان کے چسکے کو برقرار رکھنے کے لیے وہ کن تکلیف وہ مراحل سے گزر رہے تھے۔ اس سے پہلے اس کا اندازہ ہو جاتا۔ یہ لوگ کیا سوچیں گے کہ شہلا اور سکندر نے اپنے بچوں کی اس طرح سے پرورش کی تھی کہ کل کو اگر انہیں آسانٹوں کے بغیر جینا پڑے تو وہ دوسروں کی زندگیاں اجیرن کر دیں گے اور ماما جب بھی آئیں۔ اپنے ساتھ غزالہ آنٹی کی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے سو طرح کے اسباب لائیں انہیں ہاتھ سائیڈ کر کے ہزار کے نوٹ تھماتیں آج ان کی بیٹی اس طرح ان پر زور آزمائش بن کر آئی ہے۔ تلخی بری بات ہے صبر و استقامت کی خاطر اپنے بھرم کی خاطر یہ کتنی تکلیفوں سے گزر رہے ہیں۔ تانیہ اور توبہ بھی تو میری ہم عمر ہیں وہ ان کو اور دال دیکھ کر منہ نہیں بناتیں۔ کہ ہم نے نہیں کھانا ہمیں نہیں پسند وہ اتنی رغبت سے یہ سب کھاتی ہیں بے آسمان سے من و سلوی اتر رہا ہے اور اتنی شدید سردی میں نیچے زمین پر گدے بچھا کر ایسے سوئی ہیں جیسے سخت دھوپ پر فرش ہوں اور میں۔؟

اپنی نعمتوں میں پی اندر سے اتنی بھوک اتنی ندیدی ہوں کہ دسترخوان پر دال کے ہوتے ہوئے ان بے چاریوں کا احساسات کی پروا کیے بغیر مظلوم صورت بنا کر غزالہ آنٹی کی پیش کردہ پلیٹ سے صرف چکن اور کباب ہی کھاتی



ہوں، کیا میرے ماں باپ کو انہوں نے مارا ہے جو یہ سزا بھگتیں جو دن ہم پر آئے ہیں، کیا ان کی وجہ سے آئے ہیں جو میں کسی کا خیال نہ کروں اور ماما کہتی تھیں کہ بیٹا زندگی اتنے برے دنوں کا مجموعہ ہے، اتنے دن تو سب ہی ہنس کھیل کر خدا کا شکر ادا کر کے گزار دیتے ہیں۔ مزہ تو تب ہے جب برے دنوں میں بھی چہرے سے کسی کو علم نہ ہو کہ ہم کیسے حالات سے گزر رہے ہیں۔ اس حال میں بھی آنکھیں اور چہرہ خدا کا شکر خدا سے راضی ہونے کی گواہی دے اور یہ گواہی ہنسی خوشی اور طمانیت ہی میں تو ہے۔

اس وقت گرم بستر میں لیٹ کر ماما کی باتیں سننا کتنا اچھا لگتا تھا اور ہم ہنسنا سوچے سمجھے جھٹ سے ان کی اچھی باتوں کو اپنانے اور عمل کرنے کا وعدہ کر لیتے تھے یک زبان میں ”آئی پر اس ماما“ یہ جانے بغیر کہ اس پر اس کو Frelo (ثابت) کرنے کے لیے جان کو کن جو کھوں سے گزرتا پڑے گا۔

لیکن کیا ہوا، آلوہی تو کھانے ہیں، دال نہیں پسند تو کیا ہوا، نیچے زمین پر سونا اتنا مشکل تو نہیں اور پھر ثوبیہ کتنی اچھی کہانیاں سناتی ہے، سنتے سنتے غنیمت آجاتی ہے۔ اور غنیمت میں کیا پتا چلتا ہے کہ نرم گرم بیڈ ہے یا زمین اور سرکاری اسکول میں پڑھنا اتنا برا تو نہیں غزالہ آنٹی کی سب بیٹیاں وہیں پڑھتی ہیں، اور پھر نہ پڑھنے سے تو بہتر ہے کہ بندہ کم از کم پڑھ تو لے۔ عام ہونا، غریب ہونا تو بری بات نہیں۔ ہاں چور ڈاکو ہونا بری بات ہے اور گناہ گار ہونا بری بات ہے اور غربت گناہ تو نہیں اور ماما کہتی تھیں کہ غربت تو نبیوں کا شیوہ ہے سب پیغمبر پوریا نشین اور عام انسان تھے اور جب ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زمین کے سب خزانوں کی کنجیاں پیش کی گئیں تو انہوں نے غربت کو ترجیح دی تھی غریب ہونے کا مطلب ان کی سنت کی پیروی کرنا ہے اور یہ تو بڑے فخر کی بات ہے رونے کی بات تو نہیں۔

اس نے آنکھ سے ہنسنے والے آنسو کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بوجھا۔

”ہاں اب میں بالکل ان لوگوں کو تنگ نہیں کروں گی، ماما اور پاپا کی اچھی تربیت کو سامنے لاؤں گی اب میں چیزوں کے لیے کبھی نہیں روؤں گی۔ ماما آئی پر اس یو۔“

اس نے خلا میں مسکراتی ماما کو دیکھ کر وعدہ کیا تو اسے لگا، ماما نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا ہے۔ خوشی اور بے بسی سے پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”رونا نہیں عبیرہ! بزدل روتے ہیں۔“ ماما نے مسکرا کر ڈانٹا تو وہ فوراً ”آنسو پونچھ کر کھڑی ہو گئی۔“

”یس ماما! بزدل روتے ہیں اور آپ کی بیٹی بزدل نہیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ رگڑ کر باہر کی طرف بڑھی۔

ہاں ایک گلہ اسے ماما پاپا سے تھا کہ انہیں اپنے بچوں کو اس طرح لاڈ سے نہیں رکھنا چاہیے تھا ان کی ہر خواہش کی تکمیل کو اپنا ایمان نہیں بنانا چاہیے تھا کہ جب اس طرح ماں باپ کے لاڈلے دنیا کے ہتھے چڑھتے ہیں تو دنیا ان سے بہت برا سلوک کرتی ہے اور انہیں بزدل نہ ہوتے ہوئے بھی رونا پڑتا ہے۔



اسے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھے آدھ گھنٹہ ہو چلا تھا۔ عاکف چچا اسے ادھر بٹھا کر خود نا معلوم کدھر چلے گئے تھے۔ اسے تو اب بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس بھی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اٹھ کر کدھر جائے کس سے اپنی ضرورت کا اظہار کرے، آخر بیٹھے بیٹھے وہ تھک گئی۔ اتنی بڑی کوٹھی میں ہو کا عالم تھا صرف گیٹ کے پاس چوکیدار اور مالی نظر آئے تھے یا پھر ڈرائیور جو انہیں لے کر آیا تھا، وہ بھی عاکف چچا کا بریف کیس اٹھا کر غراب سے اندر نہیں غائب ہو گیا تھا اسے لاؤنج میں بٹھا کر عاکف چچا غائب ہو گئے تھے۔ پہلے تو اس نے ان کے جانے کے بعد گم صم آواز میں رونا شروع کر دیا اس پندرہ منٹ میں خوب جی بھر کر آنسو بہائے پھر تھک کر خود ہی چہرہ صاف کر لیا کوئی بھی تو اس کے آنسو پونچھے نہیں آیا تھا۔ کسی نے رونے پر اسے آکر گلے سے نہیں لگایا تھا گھر میں تو اس کی آنکھ سے ٹپکا ایک آنسو بھونچال لے آتا تھا ایسی آبی اور عبیرہ آپنی کی شامت آجاتی تھی کہ کس نے اسے کچھ کہا ہے پاپا



باقاعدہ ان کی کلاس لیتے تھے۔ اس کی تو کلاس ٹیچرز کی ہمت نہیں تھی کہ اسے مارنا تو درکنار اسے ڈانٹ بھی دیتے۔ دوسرے چوتھے روز اس کی پرپل سے ملنے جاتے تھے اس کی پروگریس چیک کرتے اور ساتھ یہ ہدایت ضرور دے کرتے تھے کہ۔

”میری فضلہ بہت حساس ہے اپنی ٹیچرز سے کہیں گاکہ اسے ذرا سا گھور کر بھی نہ دیکھیں ورنہ وہ ڈر کر ساری رات روتی رہتی ہے نہاں اگر اسٹڈیز میں کچھ پر اہم ہو آپ پلیز ان سے کہیں اس کی ڈائری پر لکھ بھیجیں لیکن اسے ڈانٹیں نہیں۔“

پرپل صاحب سکندر صاحب کی اس درجہ محبت پر ہنس پڑتے۔

”سکندر صاحب! فضلہ سکندر کو ڈانٹ کر بے چاری ٹیچر نے اپنی روزی پر لات نہیں مارنی، ڈونٹ وری، فضلہ کا نہیں تو اپنی جاب کا بہر حال وہ ضرور خیال کریں گی۔“

اور شاید اس نے اپنی آٹھ نو سالہ زندگی میں کوئی چار پانچ بار ہی آنسو بہائے ہوں گے اور اب پاپا ماما کے بعد وہ کتنا روچکی تھی۔ ان کے سامنے اتنا روتی تو شاید وہ اسے خوش کرنے کے لیے زمین آسمان ایک کر دیتے۔

”ماما! میں کیا کروں، کوئی بھی نہیں ہے جو مجھے چپ کرائے نہ ایسی آئی نہ عبیدہ آئی اور مون تو میرا دوست تھا نا اسے بھی پھپھو لے گئیں، ہم اب کبھی نہیں ملیں گے۔“ آخری خوف بھرے خیال سے اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

”میں کہتی ہوں، ایک تو تم اپنی بھانج اور بھائی کا سوگ منانے کو پورا مہینہ گھر اور پرنس کی پروا کیے بغیر ادھر بھاگتے رہتے تھے جب دیکھو محسوس کراچی کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ اب اس کے اترنے کی کچھ امید پیدا ہوئی تھی تو تم اس مصیبت کو اٹھالائے ہو، کیا ادھر کراچی میں یتیم خانہ کوئی نہیں تھا یا سارے ایدھی سینٹرز بند ہو گئے، جو تم اسے ادھر لے آئے سینے سے لگا کر۔ برا مزاج تھا سکندر اور شہلا بی بی کا زندگی میں تو کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا انہوں نے لاہور آتے ہی فون کھڑکا دیتے، ہم فلاں ہو گئے ہیں، آج اور تم کیوں کی طرح بھاگے جاتے تھے۔ اب کیوں ان کی اولاد کو اٹھائے ادھر لے آئے ان کی روحیں نہ تڑپی ہوں گی اب، کیا اتنا نہ چھوڑ کر گئے کہ اولاد مل بیٹھ کر چار دن کھا ہی لیتی، تم لوگوں نے جھٹ بچوں کی بندر بانٹ کر دی۔ اب ان کا غرور اور تشنکا کیا ہوا، کیا ایک سڈنٹ میں ہی سارا پال پیسہ فنا ہو گیا جو اس طرح ادھر ادھر بھٹکریوں کی طرح ان کی اولاد کو ہنکا دیا۔“

پتا نہیں کوئی عورت تھی لاؤنج کے باہر کیا تھا کوئی کمرو یا کارڈور جو کچھ بھی تھا آواز اتنی قریب تھی کہ ایک ایک لفظ فضلہ کی سماعتوں کو چیرتا ہوا اس کے اندر ترازو ہو گیا تھا۔ لفظوں کی کاٹ نے اسے جیسے پل بھر میں زخمی کر دیا تھا وہ صوفے پر اور بھی سہم کر بیٹھ گئی تھی۔ یہ یقیناً ”نرگس“ آئی ہوں گی عاکف چچا کی کروڑ پتی بیوی وہ ایسی ہی ہو سکتی ہیں اس کے دل نے قیاس کیا۔

”کیا ہو گیا ہے نرگس تمہیں؟ آہستہ بولو پچی سن لے گی کیا سوچے گی۔ اب اس سارے میں اس بے چاری کا کیا قصور؟“ عاکف چچا کا نرم نرم گھگھکیا ہوا لہجہ اس کے قیاس کو کنفرم کر گیا۔

”آہستہ بولو، کیوں آہستہ بولو، یہ میرا گھر ہے، تمہارے باپ کا گھر نہیں جو تمہارے احکام مانوں میں اور اگر کچھ سوچتی ہے تو سوچتی رہے بھلا میں جائے میری طرف سے بھی تمہیں صاف صاف بتا رہی ہوں اسے جہاں سے اٹھا کر لائے ہو وہیں پھینک آؤ جا کر۔ میں اس قسم کے فلاحی کام اس حد تک پریکٹیکل کی۔ کرنا پسند نہیں کرتی وہاں نہیں لے جاسکتے تو یہاں بھی اچھے خاصے یتیم خانے اور چائلڈ ویلفیئر سینٹرز ہیں۔ جا کر وہاں اسے چھوڑ آؤ میں اسے اس گھر میں نہیں رکھ سکتی۔ فضول کا ہیڈک۔ اس کے ماں باپ کو ہم نے نہیں مارا ہے جو ہم سزا جھیلیں۔ اگر اس کا کوئی قصور نہیں تو ہمارا بھی کوئی قصور نہیں سمجھے، پر تم مجھے ایک بات بتاؤ۔“

عاکف چچا کی ہر گھگھکیا ہٹ کا دو ٹوک جواب دیتے ہوئے پل بھر کو رکیں۔

”تم اسے لائے کیسے ہو؟ میری اجازت، میرے مشورے کے بغیر۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اسے ہنسی خوشی یہاں رہنے کی اجازت دے دوں گی عاکف! تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟“ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے شوہر سے نہیں کسی اپنی درجے کے ملازم سے بات کر رہی ہوں۔

”نرگس پلیز، اپنے رویے میں لچک پیدا کرو، بے چاری اس وقت بے سہارا ہے۔ ہم نے کون سا بہت کچھ کرنا ہے اس کے لیے، اتنا بڑا گھر ہے کسی کو نے میں تھوڑی سی جگہ دے دو تنگ نہیں کرے گی۔“ وہ منت آمیز لہجے میں بولے۔

”اتنا بڑا گھر ہے تو کیا یتیم خانہ کھول لوں، پر غریب مسکین کے لیے لنگر کھول دوں، اتنا ہی شوق ہے نانکیاں کمانے کا تو اس شہر میں بہترے ضرورت مند اور یتیم بھرے پڑے ہیں۔ جاؤ جا کر ان کو بھی اٹھالو اور یہ اتنا بڑا گھر مسٹر عاکف یوں ہی نہیں بن گیا۔ میرے باپ کی شب و روز محنت کی کمائی سے بنا ہے۔ تمہاری طرح انہوں نے دوسروں کی دولت پر عیش نہیں کیے۔ جس طرح تم ان کی محنت کا پھل مزے لے لے کر کھا رہے ہو۔ کیا تمہاری اوقات بھی اتنی کہ ایسی لگژری لائف کا تصور کر سکو، شکر کرو میرے پاپا کا، انہوں نے تمہیں معمولی اکاؤنٹنٹ سے اٹھا کر اس سلطنت کا بادشاہ بنا دیا۔ اس لیے نہیں بنایا تھا کہ تم ان کے خون پسینے کی کمائی کو اس بے دردی سے اپنوں میں لٹاؤ، ابھی میں زندہ ہوں مسٹر عاکف! اور اپنی زندگی میں تمہیں اس دریا دلی کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔“ ان کا والیوم بلند ہوتا جا رہا تھا فضلہ کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

”اس طرح بات کا بتنگڑ نہیں بناتے، چھوٹی سی بات ہے، تم نے اتنا بڑا ایشو بنالیا ہے۔ تم اس سے کام لے سکتی ہو۔ وہ سارے کام کر سکتی ہے، تم دیکھو تو سبھی اتنی پیاری بچی ہے، خود بخود پیار آتا ہے۔“ عاکف چچا صلح جو انداز میں بولے پتا نہیں انہوں نے اسے اس پیار کی نظموں سے کب دیکھا تھا۔

”کیا میری سارے کے لیے نوکر مر گئے ہیں جو میں بے کاری بھرتی۔ کرتی پھوں اس کے لیے اور میں اسے کیوں دیکھوں، میری سارہ خود لاکھوں میں ایک ہے اور بات کا بتنگڑ میں نے نہیں بنایا۔ میں تم سے صاف صاف کہہ رہی ہوں اس عذاب کو جہاں سے اٹھالائے ہو وہیں ڈال آؤ جا کر۔ میرے گھر اور میرے دل میں تمہارے پچھلوں کے لیے رتی برابر بھی جگہ نہیں ہے اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو باہر کا گیٹ کھلا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑو اور جدھر چاہے نکل جاؤ۔ کوئی تمہاری تلاش میں نہیں آئے گا۔ اس کی تم فکر نہ کرنا اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اندر اسٹینڈ۔“ وہ بے مروتی اور جلال کی آخری حد پر کھڑی تھیں۔

”نرگس! حد کرتی ہو تم بھی۔ اچھا۔ میں ابھی سفر سے تھکا لوٹا ہوں، کچھ دیر مجھے آرام تو کر لینے دو پھر اس مسئلے پر بیٹھ کر کچھ سوچتے ہیں۔“ عاکف چچا خوشامدانہ لہجے میں بولے۔

”تم سوچو مسٹر عاکف! میں نے تو جو سوچنا تھا کہہ دیا اب مجھ سے کوئی توقع نہ رکھنا۔ بس اسے کہیں چھوڑ آئے کے بارے میں سوچو اور اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔“ وہ تنگ دلی سے بولیں۔

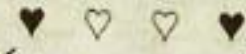
”نرگس! امی سے تو مشورہ کر لینے دو، دیکھو میں اسے کہاں چھوڑ کر آسکتا ہوں پلیز میری خاطر۔ سارے کی خاطر، تم صرف ایک بار، امی سے پوچھ لو۔ پھر جو وہ کہیں گی، آئی برامس میں وہی کروں گا۔“ عاکف چچا پھر گھگھکیا۔

”مئی بھی میری مئی ہیں، وہ بھی وہی کہیں گی جو میں کہہ رہی ہوں، ان سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ ان کا لہجہ بے لچک تھا۔

”ایک بار پوچھ لینے میں کیا حرج ہے، میں انہیں ساری بات بتا کر ایک بار فضلہ کو ان کے پاس لے جاتا ہوں، پھر جو وہ کہیں گی پلیز۔“



اس سے تو اچھا تھا وہ اسے پلین سے نیچے گرا دیتے چپکے سے۔ کسی کو پتا بھی نہ چلتا اور ان سے پوچھنا بھی کس نے تھا۔ اس نے سسکیاں دبا کر سوچا۔ دونوں کی آوازیں آتا بند ہو گئی تھیں شاید ان کی ”سی لارڈ“ کچھ سوچ رہی تھیں۔ پھر چند لمحوں بعد کمرے کے باہر ایک ہیل کی ٹک ٹک دور جاتی سنائی دی اور ان کے پیچھے بھاری بوٹوں کی چاپ اس کی ٹانگیں اکڑ چکی تھیں ”آخری فیصلہ ہونے میں شاید اب زیادہ دیر نہیں پھر پتا نہیں کہاں جانا پڑے گا۔“ اس نے سوچتے ہوئے جوتے اتار کر ٹانگیں سمیٹ کر صوفے پر رکھ لیں۔ اس کا پورا وجود تھک چکا تھا اور آنکھیں رو رو کر آنسوؤں اور سوچوں کی لالچنی کشش کے دوران پتا نہیں کب نیند اس کی آنکھوں پر مہمان ہو گئی اور وہ کسی گٹھڑی کی طرح گردن بانہوں میں چھپائے سو گئی۔



ایمن نے اب اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ تایا جی ہی اسے اور ولید کو اسکول چھوڑتے تھے۔ اس لیے تینوں کا آٹھ بجے تک تیار ہو کر گھر سے نکلنا ضروری تھا۔ ابراہن ذرا لیٹ کالج جاتا تھا وہ یوں بھی اپنی بائیک پر جاتا تھا۔ اور ان تینوں کے لیے بیک وقت ناشتہ تیار کرنا تایا جی کے لیے کسی افتاد سے کم نہیں تھا پتا نہیں پہلے ولید اور تایا جی کے لیے ناشتہ تیار کر کے دیتی تھیں یا نہیں۔ لیکن آج کل ان کا یہ روٹین ورک بھی کسی کارنامے سے کم نہیں تھا اور یہ کارنامہ وہ ایمن کی شمولیت کے بغیر انجام دیتا نہیں چاہتی تھیں۔ صبح بچے ہی ان کی بابا کا راسے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیتی۔ ان کے شور و غل کو شاید نظر انداز کر کے وہ بستر پر ہی پڑی رہا کرتی لیکن تایا جی کی ایک کڑک اسے سیکندوں میں کمرے سے باہر آنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ تایا جی کو اچھے ہی نہ تو کچھ دکھائی دیتا تھا نہ بھائی دیتا تھا جب تک چائے کا لبا اب بھر آپ ان کے ہاتھ میں نہ تھمایا جاتا۔ تایا جی پہلے کیا کرتی تھیں یہ تو اس کو خبر نہیں تھی لیکن اب تایا جی کی اس انتہائی طلب کی تکمیل اس کے ذمے ٹھہری تھی چائے وہ اسے جیسے بھی سرانجام دے۔

اور پہلے دن منہ اندھیرے جب گھنٹوں کی تکلیف سے ہائے کرتی تایا جی نے اسے کیتلی میں چائے کا پانی دیتے ہوئے چائے بنانے کو کہا تو وہ جیسے گرتے گرتے پچی۔ اس عمر تک چائے بنانا تو درکنار ان چاروں بہن بھائیوں نے کبھی چائے چکھی بھی نہیں تھی۔ بابا بچوں کو چائے دینے کے بہت خلاف تھیں انہوں نے تو انہیں دودھ اور جوسز پر پالا تھا چائے سے اس کی شناسائی صفر تھی۔ تو جب تایا جی نے کہا کہ اپنے تایا کے لیے چائے بناؤ تو چو لہا تو اس نے جلا لیا لیکن ان کی بات سن کر جلی ہوئی تیلی بجھانا بھول گئی ابھی گرمی نیند کا خمیر بھی نہیں اترتا تھا کہ اتنے عجیب حکم سے اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ سوچنے سے بھلا اس معے نے کہاں حل ہونا تھا ہاں تیلی ساری جل کر اس کی انگلیوں کی پوروں تک آن پچی تپش نے نرم ہاتھ کو جو جلایا تو اس نے ”سی“ کر کے تیلی کو نیچے گرا دیا۔

”سنائیں تم نے“ میں نے کہا ہے ”چائے بناؤ“ ورنہ تمہارے تایا جی یونہی بگل بجاتے رہیں گے چائے چائے کا۔“ تایا جی کی پکار پر تایا جی نے ناگواری سے اسے بے حس کھڑے دیکھ کر کہا ”یہ لو پکڑو“ انہوں نے کیتلی اسے تھمائی۔

”وہ تایا جی!“ اس نے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کیتلی پکڑی۔

”ہاں کیا ہے نیند نہیں آ رہی آنکھوں سے بیٹا اُم دیکھو وقت کیا ہوا ہے۔ پونے چھ ہو رہے ہیں۔ ابھی ناشتا بھی بنانا ہے۔ کبجنت آتا بھی رات کو حتم ہو گیا“ تمہارے تایا جی پر اٹھا کھاتے ہیں۔ چائے کا پانی رکھ کر مجھے آنا چھان کر دو“ میں کو نڈھ لوں۔“ وہ ادبھی پڑھی پر نہیں از حد ہزار تھیں۔

اس نے ایک نظر تایا جی کے وسیع و عریض وجود پر ڈالی اور دوسری کیتلی پر۔

”ہاں اب کیا میرا ایکسے اتارنا ہے پٹ پٹ آنکھیں کھولے کھورے جاری ہو۔ بنا لو اب چائے“ میں نے نہیں کے نو سر کرنے کو تو نہیں کہہ دیا۔ ”ان کی بیزار ہی بوہتی جا رہی تھی۔“

”تائی جی! مجھے تو چائے بنانا نہیں آتی۔“ اس نے تھوک نگل کر صاف آواز میں کہا۔

”کیا؟“ اب چودہ طبق روشن ہونے کی باری تایا جی کی تھی۔

”اولی میرے اللہ اتنی بڑی لوٹھا کی لوٹھا۔ آنکھیں جماعت میں پڑھتی ہو اور چائے بنانا نہیں آتی۔“ وہ حیرت کے سمندر سے نکل کر بولیں۔

”آنکھیں جماعت میں پڑھنے کے لیے ضروری نہیں کہ چائے بنانا بھی آتی ہو۔“ اس نے دونوں کاموں کے لازم و ملزوم ہونے کی نفی کی۔

”ہاں تو جب زبان چلانا آتی ہو، نخرے دکھانے آتے ہوں تو پھر چائے سیکھنے کی کیا ضرورت ہے، بلکہ میرا تو خیال ہے اگر زبان چلانے کا ہنر آجائے تو پھر کچھ بھی سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور تمہیں تو میرے خیال میں شہلا نے یہی فن سکھایا ہے۔ اب تمہیں کچھ اور سیکھنے کی ضرورت بھی نہیں۔“ ان کا طعنہ اسے آگ لگا گیا۔

”تائی جی! میری ماما کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، تایا جی کے لیے چائے بنانے کی ذمہ داری آپ کی ہے میری نہیں۔ چائے بنائیں، چائے نہ بنائیں۔“ وہ فوراً ”کو را کر ارا جواب دے کر پیر پختی یا ہر نکل گئی مگر یہ اس کی بھول تھی کہ وہ اکڑ دکھا کر ہر نکل سکتی ہے۔ اور تایا جی کے جسم کا حجم جس قدر پھیلا ہوا تھا اور کھٹنے ان کو اچھے بیٹھے تنگ کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ لپک کر اس کی درگت نہیں بنا سکتیں۔ ابھی اس نے کچن کی دہلیز پر دوڑ کر قدم اپنے کمرے کی طرف برہائے ہی تھے کہ پیچھے سے تایا جی نے اس کی قمیص پکڑ کر اس کا سراپنی طرف گھمایا۔ اور کھینچ کر دو تھپڑ تراخ تراخ اس کے گالوں پر جڑ دیے۔

”نہ ماں کو کچھ نہ کہوں، جو کچھ اس دنیا میں چھوڑ کر چلی گئی کہ دنیا تیرے آگے رُے سجا سکا کر پیش کرے گی،“ باب زادی کے ناز اٹھائے گی، اسے کچھ نہ کہوں اور کچھ بھی۔“ وہی ہی چھوڑ دوں کہ توجہ دیر چاہے شتر بے مہار کی طرح سر نہیہوا کر بیٹھ جائے میں نے تیرا چار نہیں ڈالنا ہے جو تجھ سے کوئی کام نہ لوں، تجھے تخت پر بٹھا کر تیرے نخرے اٹھاؤں۔ چل دفع ہو اندر اور چائے بنا۔“ انہوں نے ایک دھمو کا اس کی کمر پر جڑا اور اسے کچن کی طرف بڑے دھکا دیا۔ تکلیف اور ذلت کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ اندر جانے کے بجائے وہیں دیوار کے ساتھ لگ کر پیچ کر رونے لگی۔

”میں ڈراے باز تیری میں نے کھال کھینچی ہے جو یوں چیخ چیخ کر حملہ اکٹھا کرنے لگی ہے۔ میں کہتی ہوں اندر نہ ہوتی ہے کہ نہیں۔“ تایا جی نے آگے بڑھ کر جو زور سے اس کی کلائی پکڑ کر مروڑی اس کی چیخ نکل گئی۔

”کیا ہو گیا، صبح ہی صبح کیا چیخ و پکار شروع کر دی ہے تم دونوں نے ایک چائے مانگی تھی غلطی سے اپنے سیاپے ال کر بیٹھ گئی ہیں۔“ تایا جی بلند آواز میں دھاڑتے ہوئے باہر نکلے۔

”اب اندر دفع ہوتی ہے یا پڑاؤں تایا کے ہاتھوں ساری چو کڑی بھول جائے گی نامراد کو۔“ نفرت بھری شدید صمکی کام کر گئی۔ تایا جی کی اس رات کی مار اسے ابھی بھی دن میں ڈرا دیتی تھی۔ وہ سسکیاں لیتی اندر کچن میں چلی گئی۔

”نہ کیا ہوا تھا اسے صبح صبح کون سا دورہ پڑا تھا جو چیخ چیخ کر نحوست پھیلا رہی تھی یہ۔“ تایا جی ان دونوں کے پیچ کر سر پر کھڑے حقارت سے بولے۔

”ہونا کیا تھا“ میں نے لینڈ لارڈ زادی کو غلطی سے کہہ دیا کہ چائے بناؤ آگے سے۔ وہی ادائیں مجھے دکھا کر ”مجھے تو چائے بنانا نہیں آتی“ مجھ کرموں جلی کے منہ سے نکل گیا کیا ماں نے نہیں سکھائی؟ بس پھر کیا تھا چیخ



باہر نکل گئی۔ ”ہو نہ! تائی جی نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا اور پھر زور زور سے آنا چھاننے لگیں۔  
لاڈلے جب دنیا کے ہتھے چڑھتے ہیں تو دنیا ان کے ساتھ بہت برا سلوک کرتی ہے۔

”غزالہ آنٹی! چنے کی دال تو مجھے بہت پسند ہے اور آپ تو بالکل حلیم کی طرح پکاتی ہیں۔ آپ کبابوں کے لیے قیمہ نہ منگوائیں۔ میں دال ہی کھاؤں گی۔“ غزالہ قیمے کے لیے پرس میں سے پیسے نکال رہی تھیں جب عبیدہ نے پیچھے سے آکر کہا۔

”نہیں بیٹا! مجھے پتا ہے، تمہیں دال پسند نہیں اور قیمہ تو ویسے بھی منگوانا ہی ہے۔ اس میں کیا بات ہے بھلا۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولیں۔

”نہیں کباب کوئی بھی شوق سے نہیں کھاتا“ مجھے پتا ہے اور آپ نے ابھی کپڑے بھی پر لیں کرنے ہیں۔ کھانا بھی پکانا ہے، پہلے ہی شام ہو چکی ہے۔ کباب بنانے میں بہت وقت لگے گا۔ پرسوں چھٹی کا دن ہے نا، پرسوں کباب بنالیتے گا۔ ٹھیک ہے نا؟“ وہ ان کے بازو کے ساتھ ٹنگ کر بولی۔

”تو پرسوں بنالیں گے۔ قیمہ تو آج منگوا لوں نا۔“ وہ پھر بولیں۔

”پرسوں فرلش منگوائے گا۔ آج منگوا کر باسی کرنا ہے بس آج دال پکائیے مزید اسی۔“

”چلو جیسی تمہاری مرضی۔“ انہوں نے پیسے واپس پرس میں رکھ دیے وہ ان کے ساتھ کچن میں آگئی۔

”کلاس میں لسن چھیلی ہوں۔“ اس نے پلٹ ان کے ہاتھ سے لے لی۔

”چھیل لو گی؟“ غزالہ ہنس کر بولیں۔

”ہاں تو اس میں کیا مشکل ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور چھلکے اتارنے لگی۔

”کلاس میں کوئی دوست بنی عبیدہ کی؟“ وہ بازو کاٹتے ہوئے بولیں۔

”بھی تو ساری کلاس دوست ہے۔ کلوز فرینڈ تو کوئی نہیں بنی۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔

”غزالہ آنٹی! ایک بات کہوں آپ سے۔“ وہ کچھ دیر بعد بولی۔

”ہاں کہو۔ کیا بات ہے۔“ انہوں نے چو لہے پر دیکھی رکھتے ہوئے کہا۔

”غزالہ آنٹی! میں جب پہلے آپ کے گھر آتی تھی، ہم رات کو نہیں رہتے تھے بس دن میں ہی واپس چلے جاتے تھے، ٹوبہ اور تانیہ مجھے بتاتی تھیں کہ ہم رات کو مل کر سوتے ہیں، خوب باتیں کرتے ہیں، کہانیاں سناتے ہیں۔

پہیلیاں بجاتے ہیں۔ برا مزہ آتا ہے۔ ادھر میں اور ایسی الگ الگ سوتے تھے اور ماما کہتی تھیں۔ باتیں نہ کرو جلدی سو جاؤ۔ صبح اسکول جانا ہے تو میرا اس وقت بڑا دل کرتا تھا کہ میں ادھر رہوں رات کو۔ ٹوبہ وغیرہ کے ساتھ سوؤں۔ ان کے ساتھ باتیں کروں، پہیلیاں بوجھوں اور رات کو دیر تک جاگوں مگر ماما رہنے ہی نہیں دیتی تھیں۔“ وہ چپ کر گئی پرانے درد جاگنے لگے تھے۔

”ہاں تو بیٹا! وہ بھی صحیح کہتی تھیں نا، وہاں تم لوگوں کے اسکول صبح جلدی اشارت ہو جاتے تھے۔ جلدی اٹھنا پڑتا ہے اس لیے۔ ان کے تو اسکول بھی کچھ لیٹ اشارت ہوتے ہیں اس لیے یہ رات کو موج میلہ کر لیتی ہیں۔“ غزالہ نے کہا۔

”لیکن پھر بھی یہ صبح جلدی اٹھ کر نماز بھی پڑھتی ہیں۔ اٹھتی تو جلدی ہیں نا۔“

”ہو!“ غزالہ سمجھ نہیں پائیں کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔

”غزالہ آنٹی! مجھے نیچے ٹوبہ اور تانیہ کے ساتھ بہت مزہ آتا ہے آپ پلیز وہ جو بیڈ کا آرڈر دیا ہوا ہے، وہ کینسل کرادیں۔ مجھے نیچے سونے میں مزہ آتا ہے اور پھر گرمیوں میں تو سب چھت پر اوپر سو میں گے تا میں نیچے اکیلی کیسے

چن کر یہ ڈرامہ کرنے لگی۔“ تائی جی کا جھوٹا اسے مزید آگ لگا گیا مگر اب اس آگ میں اسے اپنا آپ ہی جلاتا تھا کسی اور کو اس کی آج بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

”مگر کر رہی تھی۔ اس رات کی طرح۔ دیکھا کیا ہنگامہ کیا تھا اس نے اس رات پھوپھی اور ماسی کے سامنے ہمیں ذلیل کروایا تھا۔ میں تو اسے بڑی بھولی سمجھتا تھا۔ یہ تو بڑی مکار ہے انیسہ! اس پر اب کڑی نظر رکھنا یہ تو ہمیں بھی بخیر دے جائے گی۔ کل کو سب کو جواب تو ہم نے دینا ہے، تم ہی اب خیال رکھنا۔“ تائی جی وہیں اسٹول سنبھال کر بیٹھتے ہوئے نفرت سے بولے۔

”چل مرہ چائے کی پتی ڈال اس میں۔“ تائی جی نے چائے کا ڈبہ اس کی کمر میں دے مارا، اس نے دو آنسو اندر اتارے، دو باہر گرائے اور چائے تھام لی۔

”ایک چنچ ڈال۔ دیکھو آنسو اس کے جیسے ہم نے اسے فوج کر دیا ہو۔ منحوس ڈرامہ گر اتنی سی لڑکی اور چلن دیکھو۔ اللہ میری توبہ، نڈر دیدہ اس رات اندھیرے میں بسن بھائیوں کو لے کر نکلنے لگی تھی۔ توبہ کیا زمانہ آگیا ہے خوف تو رہا نہیں زمانے میں۔“

تائی جی اس کے سر پر کھڑی کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں۔ وہ کیتلی سے اٹھتے دھند کے غبار کو دیکھتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔

”چینی ڈال اس میں۔ اب کھڑی دریا بہا رہی ہے۔ میں کہتی ہوں ابرار کے ابا! یہ تو مجھے بہت تنگ کرے گی۔“ وہ مڑ کر تائی جی سے بولیں۔

”تنگ کرے گی تو خود ہی تنگ ہو گی۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں، کوئی لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا تو دماغ اچھا خاصا خراب ہے۔ پتا نہیں ماں باپ نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں ایسی گستاخ اولاد سے۔“ تائی جی بیوی کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

”دودھ ڈال اب اس میں اور صبح صبح یہ ماتم بند کر۔ جب سے آئی ہے، گھر میں جیسے نحوست پھیل گئی ہے۔“ انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے کپ اس کے آگے سلیب پر رکھا۔

”اس سے پکڑ کر چائے ڈال۔“ رومال اسے تھماتے ہوئے وہ حکمیہ لہجے میں بولیں۔

اس نے رومال سے کیتلی احتیاط سے پکڑی جیسے ہی چائے کپ میں اندھیلنے لگی۔ رومال پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ آدھی چائے کپ کے اندر اور کیتلی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے پاؤں کے پاس زور سے جاگری، ”کی

ہوئی چائے بائیں پاؤں کو جلا گئی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ ہاتھ سے رومال چھوڑ کر نیچے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”ہائے میرے اللہ کیسی نکمھی لڑکی ہے، ہمارے سرچڑھ کر پاؤں جلا بیٹھی۔ یہ تو مجھے ذلیل کر کے رکھ دے گی، ساری چائے تباہ کر دی۔ مجھے اس سے کیا فیض ملے گا۔ النایہ تو اذیت کا سامان پیدا کرے گی میرے لیے۔“ جلن اور تکلیف سے وہ از سر نو رونے لگی۔

”چلو جتنی چائے پی چکی ہے وہی دے دو صبح صبح سر میں درد کر رہا ہے نہ تم خود نہیں بنا سکتی تھیں چائے“ مصیبت۔“ تائی جی بیزاری سے اٹھ کر تائی جی سے کپ لیتے ہوئے بولے اور باہر نکل گئے۔

”اب بیٹھی یہاں کیا اشک بہا رہی ہے، جا جا کر کوئی ٹوبہ لگا لے پاؤں پر۔“ کپ اس کی تھی، مجھے آنا چھان دے اپنا ہی ڈرامہ کر کے بیٹھ گئی۔ ہمیں کسی سے کوئی فیض کہاں۔ ایسے اچھے اپنے نصیب کہاں۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے پرات میں آنا چھاننے لگیں تو وہ روئے ہوئے اٹھی پاؤں سے جلن کی نیس اٹھ رہی تھیں۔ وہ بمشکل قدم اٹھاتے ہوئے



سوؤں گی اور پھر اس پر تو گری لگے گی نا اور اب تو سردیاں ختم ہونے والی ہیں۔ آپ انکل سے کہیں کہ بیڈ کا آرڈر کینسل کرادیں۔“

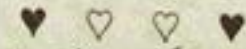
اب بات غزالہ کی سمجھ میں آئی تھی، انہوں نے ایک شرمندہ سی نگاہ اس پر ڈالی۔  
”برینا! اب تو وہ بیڈ آج کل میں آنے والا ہے۔ اس طرح تو آرڈر کینسل نہیں ہوتا۔“ غزالہ نے سمجھایا۔  
”غزالہ! آئی! میں نے بتایا نا کہ بیڈ تو ایک دو ماہ بعد بے کار ہو جائے گا گری کی وجہ سے۔“ وہ اصرار سے بولی۔  
”آپ انکل کو منع کر دیں۔“

”بیٹا! ایسے تو وہ آرڈر کینسل نہیں کرے گا۔ اس نے کچھ پیسے لیے ہوئے ہیں، اس طرح وہ پیسے نہیں دے گا۔ اس لیے بیڈ آجانے دو۔“ نمک مرچ ہنڈیا میں ڈال کر انہوں نے ڈھکن رکھ دیا۔  
”تو ان پیسوں کی ہمیں کتابوں کی الماری بنوادیں ہمارے بیڈ روم میں۔ ہم سب کو ضرورت بھی ہے اور وہ اچھی بھی لگے گی۔“

اس نے فوراً ”تجویز پیش کی۔“  
”ہاں! یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے۔ اچھا۔ میں تمہارے انکل سے بات کروں گی آج۔ اگر وہ مان گئے تو الماری منگوا لیں گے۔“ انہوں نے ہامی بھری توجیسے عبیدہ کو سکون آگیا۔

”چلو۔ اب تم اٹھو۔ کافی ٹائم ہو گیا ہے۔ بیگ کھولو اور جا کر اپنا ہوم ورک شروع کرو۔ میں ابھی آرہی ہوں اور دیکھو وہ سب بھی پڑھ رہی ہیں یا زرا کھیل تماشا ہو رہا ہے۔“ انہوں نے اسے اٹھایا تو وہ جی اچھا کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔

”وقت کتنا بڑا استاد ہے، وہ باتیں جو ہم دن رات لگا کر ان بچوں کو ذہن نشین نہ کرا سکتے۔ وقت نے ایک ہی جھٹکے میں سب کچھ سکھا دیا ہے۔ عبیدہ کتنا بدل گئی ہے۔ ساری ضدیں، سارا اکھڑن بھول گئی ہے۔ ہاں باپ ہوتے تو دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ اللہ اس کی آئندہ کی زندگی بہتر کرے۔“ غزالہ اسے جاتے دیکھ کر سوچ رہی تھیں۔



”آں کیا نام ہے تمہارا فضہ۔ لڑکی ادھر آؤ۔“ گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے ممی نے اسے پکارا۔ وہ ان کے بیڈ کے سامنے پڑے صوفے پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”جی! وہ آہستگی سے چلتے ہوئے ان کے پاس آکھڑی ہوئی۔“  
”یہاں بیٹھ کر میرے ہاتھ دباؤ۔“ انہوں نے جھڑپوں سے بھرے ہاتھوں والی پتلی پتلی سفید کلاٹیاں اس کے آگے کر دیں۔ وہ بیڈ کے کنارے ٹک کر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کے ہاتھ دبائے گی۔

”تمہارا نام فضہ ہے نا، حالانکہ تمہارا نام تو چیزیا ہونا چاہیے تھا۔ معصوم سی، سہمی ہوئی، بے ضرری۔“ وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں وہ بدستور سر جھکائے ہاتھ دباتی رہی۔

”لیکن نہیں۔ چیزیا نہیں۔ چیزیا تو چوں چوں کرتی ہے۔ اس کی ننھی سی چکار سے سارے آنگن میں شور ہو جاتا ہے اور تم تو بالکل کم صم ہو۔ چپ چاپ اس لیے تمہارا نام کوئی اور ہونا چاہیے۔ میری نواسی کو دیکھا ہے نا تم نے سارہ کو۔ اس کا نام سارہ نہیں شیطان کی خالہ ہونا چاہیے اس کمرے میں آئی ہے، منٹوں میں سارے کمرے کو گھس گھس کر دیتی ہے اور بچے تو ایسے ہی اچھے لگتے ہیں۔“ ممتے، کھلتے، شرارتیں کرتے، تم کیوں اتنی چپ ہو؟ کسی سے ڈرتی ہو۔“ وہ ننھی آوازیں بولتے ہوئے مسلسل اسے دیکھ جاری تھیں۔

اس نے نفی میں سر ہلادیا۔  
”ہن بھائی یاد آتے ہیں؟“ انہوں نے اس کی دھتھی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چپ رہی ہاں جھکی ہوئی آنکھوں میں

نمی اتر آئی۔

”وقت بڑا ظالم ہے۔ اتنی ننھی سی کونج کو ڈار سے جدا کر دیا۔ بچے! جدائی کے زخم بھرنے میں کچھ تو وقت لگے گا نا۔“ وہ آہستہ آوازیں بولیں۔ ”بو! امی یاد آتے ہیں۔“

ان کا سوال پہلے سے بھی زیادہ ظالمانہ تھا اور آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک کر ان کے جھریوں والے ہاتھوں پر آگرے انہوں نے ایک نظر ان موتیوں کو دیکھا جو آنکھوں سے نکل کر محض پانی بن گئے تھے۔

”چلو اداس نہیں ہو۔ مجھے اپنے امی ابو کی باتیں بتاؤ۔“ انہوں نے اس کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اسے بہلایا اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”کیوں؟“ وہ چپ رہی۔

”ہاں! درد بڑھتا ہے۔ یوں زخم کو بار بار کریدو تو۔“ انہوں نے آہ بھر کر کہا۔

”چلو پھر سو جاؤ جا کر۔“ مجھے وہ سائیڈ پر پڑا ہے۔ دودھ کا گلاس اور دونوں ٹیبلٹس جو پاس پڑی ہیں دے جاؤ۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ انہیں دودھ اور میڈیسن دے کر اسی کمرے کے دوسری طرف رکھے سنگل بیڈ پر آکر لیٹ گئی کبل گردن تک اوڑھ کر اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

کل جب وہ صوفے پر پڑے پڑے سو گئی تھی تو نوکر اسے جگانے آیا کہ آپ کو اندر بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔ وہ اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ اسے اس کمرے تک لے آیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے عجیب سا احساس ہوا جیسے وہ کسی ہاسپٹل کے کمرے میں آگئی ہے۔ یہی ہی خوشبو تھی یا شاید بو بھی فیما نکل جیسی۔ کمرے کا سارا فرنیچر فرانسیسی تھا، اسے تو نہیں بتا تھا کہ یہ فرانس سے منگوا یا گیا ہے ہاں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فرنیچر بہت قیمتی ہے یہ بات اسے آج می نے بتائی تھی۔ دیواروں پر سفید بے داغ پینٹ ہوا تھا۔ فرنیچر کی جلد بیش قیمت سفید فارمیکا کی تھی۔ کھڑکیوں پر سفید بے داغ پردے ہوئے ہوئے لہرا رہے تھے کیونکہ کھڑکیاں پچھلے لان کی طرف کھلتی تھیں۔ فرش پر قالین بھی سفید اور ہلکے آسمانی کھر کا تھا۔

”ممی! یہ ہے فضہ، اب بتائیں بھلا میں اسے واپس کیسے چھوڑ آؤں۔“ عاکف چچا کی آوازیں لجاجت اور بے بسی دونوں تھیں۔

”ہوں!“

”زرگس! تم کیا کہتی ہو؟“ انہوں نے غور سے عاکف چچا کے پاس بیٹھی فضہ کو دیکھ کر کہا۔

”ممی! میں تو اسے قطعاً برداشت نہیں کر سکتی میرا گھر کوئی Orphanhouse (یتیم خانہ) نہیں ہے جو میں یہ فی سبیل اللہ کام شروع کروں۔ میں اس طرح کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی۔ اس لیے عاکف سے کہیں کہ اسے فوراً سے پیشتر اس کے تایا چچا جو بھی ہیں ان کے حوالے کر آئیں۔ پہلے ہی انہوں نے وہاں اتنے دن وہاں برباد کیے ہیں۔“ زرگس بیزار کن لہجے میں بولیں۔

”ہر بات پر یوں بیزار نہ ہو جایا کرو زرگس!“ ممی نے زرگس کو ڈانٹا۔

”عاکف! تم کیا کہتے ہو؟“

”ممی! بتاؤ چکا ہوں، میری عزت کا معاملہ ہے۔ میں اب کیسے اسے چھوڑ آؤں۔“ عاکف چچا کا لہجہ بدستور عاجزانہ تھا۔ ”سب کے سامنے بات ہوئی تھی اب اس طرح پھر جاؤں۔“

”عزت ہو نہ! تمہاری بھی کوئی عزت ہے۔“ زرگس آئی کا ہنکار اور جملہ خاصا بلند تھا۔ عاکف چچا پہلو بدل کر رہ گئے۔

”زرگس! بری بات۔“ ممی نے سرسری لہجے میں کہا۔



”ایسا ہے نرگس! تم اس بچی کو میرے پاس چھوڑ دو جب سے میرا آسٹریلیا میں طوطا فوت ہوا ہے، میں اب اس کمرے میں پڑے پڑے بور ہو جاتی ہوں۔ اس سے میرا دل لگا رہے گا اور عاکف کی بات بھی رہ جائے گی۔ کیا خیال ہے تمہارا۔“ انہوں نے دونوں کو دیکھا۔

”ممی! آپ کے لیے میں نے طوطا منگوایا تو ہے آسٹریلیا سے۔ ایک دو روز میں پہنچ جائے گا پھر آپ کو کیا مسئلہ ہے۔“ نرگس کا لہجہ ہنوز کٹھن تھا۔

”طوطا آجائے گا تو خیر ہے۔ یہ بچی یہیں رہے گی میرے پاس۔ مجھے یہ اچھی لگی ہے۔ تم اب مزید اعتراض نہ اٹھاؤ اور اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ اسے میں رکھوں گی۔ تم دونوں بزنس کی طرف دھیان دو۔ فیجر آیا تھا کل میرے پاس سائن کروانے کچھ پیپرز پر۔ وہ بتا رہا تھا، افضل وغیرہ نے مل میں اور قمر کوپ نے فیکٹری میں بڑے کھیلے کر رکھے ہیں۔ وہ یونین کو آج کل میں اسٹرائیک کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ اندر ہی اندر کچھڑی پک رہی ہے۔ تم اب ہوشیاری سے ادھر توجہ دو۔ اس معاملے کو مجھ پر چھوڑ دو۔“ انہوں نے دونوں سے کہا۔

”ممی! آپ بھی تو حد کرتی ہیں۔ اب پچھلے مہینے آپ امریکہ چلی گئیں تو وہ اتنے لازمی پیپرز تھے۔ ارجنٹ جن پر آپ کے سائن ہونا تھے۔ ایک ہفتہ پورا اس پر اجیکٹ کوڈیلے کرنا پڑا۔ پتا نہیں آپ کو مجھ سے اب کیا خطرہ ہے پاور آف اٹارنی آپ مجھے کیوں نہیں دے دیتیں۔ یہ روز روز کی چیخ چیخ سے توجان چھوٹے اتنے مسائل ہو جاتے ہیں اس سے۔“ نرگس آنٹی کچھ غصے سے بولیں۔

”ہاں۔ کہا تو ہے میں نے ایڈوکیٹ اعجاز سے۔ وہ اگلے ماہ تک سارے پیپرز تیار کر کے لے آئے گا پھر یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ مجھے بھلا تم پر اعتبار کیوں نہیں ہو گا۔ کوئی اپنی اولاد پر بھی بے اعتباری کرتا ہے۔ یہ کام بھی اب جلد ہی ہو جائے گا بلکہ میرے کندھوں سے ذمہ داری کا بوجھ اترے گا۔ تم فکر نہ کرو اور اپنا دھیان صرف بزنس کی طرف کرو مجھے بڑی فکر ہے اور عاکف بیٹا! تم بھی نرگس کے ساتھ مل کر ان معاملوں کو سلجھاؤ۔“

”ہو نہ! یہ کیا سلجھاؤں گے کسی معاملے کو۔ اپنے بیک ورڈ خاندان کی تو فکریں کر لیں پھر باقی کا بھی کچھ کریں گے۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

”اوکے ممی! مجھے ذرا جانا ہے، خالد صاحب کے ہاں بزنس پارٹی ہے۔ ادھر اور عاکف! تم جا کر عثمانی صاحب سے مل لو انہوں نے میسور کنگ کہاں تک مکمل کر لی ہے اوکے ممی!“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

ان کے ساتھ ہی عاکف چچا ممی کو اوکے کہہ کر باہر نکل گئے اور وہ کل سے ممی کا دل بہلانے کے لیے ان کے آسٹریلیا میں طوطے کی جگہ اس کمرے میں تھی۔ کمرہ بہت بڑا تھا۔ درمیان میں ریشمی سفید پردوں سے کمرے کی پارٹیشن کر کے اسے دو بنایا گیا تھا۔ سری طرف اس کا سنگل بیڈ لگا دیا گیا تھا۔ ممی ایک ٹانگ سے معذور تھیں ان کے پیچ پیروں میں پرابلم تھی۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار چھوٹی موٹی بیماریاں تھیں جن سے بچنے کے لیے وہ دن رات نیلی سفید سن اور پیکلی چھوٹی بڑی گولیاں اور کیپسولز لگاتی رہتی تھیں اور فضلہ ان کی خدمت پر مامور ہو گئی تھی۔



پھر تائی جی کی کڑی تربیت نے صرف ایک ماہ میں اسے چائے بنانا، آنا گوند ہٹا، سبزی بنانا سکھا دیا۔ یہ الگ بات ہے اس سیکھنے کے دوران اس نے کئی بار ہاتھ اور بازو جلانے چاقو اور چھری تو اتنی بار انگلیوں سے نبھو آنا ہوئے کہ ہاتھوں پر باقاعدہ ان کے نشان رہ گئے تھے۔ دوبار تو اس ہاتھ کے انگوٹھے پر ایسی چھری لگی کہ خون ہی بند نہیں ہو رہا تھا۔ ابراہیم بھائی گھر پر موجود تھے وہ تائی جی سے لڑنے لگے اور اسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

تائی جی ابراہیم بھائی کی اس ناگہانی ہمدردی کا بدلہ کئی روز اس سے لیتی رہیں۔ اٹھتے بیٹھتے اسے ایکسٹریس ادا کارہ اور ڈرامہ باز کا خطاب دیتی رہیں۔ پہلے وہ پلٹ کر جواب دے دیتی تھی لیکن اس زبان ورازی پر دو چار جھانپڑ اور پڑ جاتے تھے اور اس کے بعد میں تائی جی کی زبان چلتی رہتی۔ اس کی طبیعت بیزار ہو جاتی پھر اس نے جواب دینا ہی چھوڑ دیا۔ کیا فائدہ دوبارہ مار بھی کھاؤ اور ان کی زبان پھر بھی گولے اگلتی رہے۔ کچھ دن تائی جی کو اس کی ایک چپ اور سو سکھ والی پالیسی کی خبر نہ ہو سکی پھر کچھ دن بعد ہی انہوں نے نوٹ کر لیا جب گھر کی دیواریں ان کی تڑتڑ چلتی زبان کے پھول واپس گونج کی شکل میں لا کر ان کی سماعتوں میں اندیلنے لگیں تو وہ چونک پڑیں۔ اب ان کے طعنوں نے نئے خطاب کا رخ کیا۔ اسے گھنی میسینی، مکار لومڑی جیسے القابات سے پکارنے لگیں۔ غصہ تو اسے بہت آیا مگر پھر برداشت کر گئی اور تائی جی کی ڈیمانڈ صرف وقت پر کھانا اور چائے کی دستیابی تھی اس کے بعد تائی جی لاکھ اس کی برائیاں تائی جی کے کانوں میں اتارتی رہتیں۔ وہ ذرا توجہ نہ دیتے ایک کان سے سنتے دوسرے سے اڑا دیتے۔

کچھ وقت اور سر کا تو اسے پتا چلا کہ تائی جی کو خاموش کروانے کے بھی بہت سے طریقے ہیں جن میں سے خوشامد تو ظاہر ہے نمبر ون ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی بچن کی مکمل ذمہ داری اٹھالے تو وہ تائی جی کے نزدیک سب سے زیادہ فرمانبردار اور سمجھ دار ہوتا ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ کھانا پکانے میں حصہ لینا شروع کر دیا تائی جی کے طعنے تو نہ ختم ہوئے البتہ کم ضرور ہو گئے اور تینوں وقت کی چائے جب وہ ان کے کمرے بغیر لا کر ان کے آگے رکھ دیتی تو ان کی زبان مکمل خاموش ہو جاتی۔

ابراہیم بھائی ویسے ہی بے ضرر سے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے کالج اور ہاکی کلب دو ہی ان کی زندگی کی مصروفیات تھیں۔ وہ بہت کم کسی کے معاملے میں دخل دیتے تھے۔ گھر میں ہوتے تو زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتے تھے۔ ویسے بھی وہ ایمین کا خیال رکھتے تھے۔ کبھی بھی خیال آنے پر اس کے لیے چاکلیٹ اور بسکٹ وغیرہ لے آتے تھے۔ اس کے انکار کے باوجود اس کے کمرے میں رکھ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں پوچھتے رہتے تھے وہ نفی میں سر ہلا دیتی۔ ایسے ہی ایک روز انہوں نے پانی کا گلاس اپنے کمرے میں لے جاتے ہوئے اس سے پوچھا تو وہ ایک لمحے کو چپ رہ گئی۔

”ہاں۔ گڑیا! کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ کالی پین وغیرہ جوتے کپڑے۔“ وہ اس کی چپ پر مڑ کر دوبارہ بولے۔

”ابراہیم بھائی! آپ سے ایک بات کہوں۔“ وہ مڑ چھیل رہی تھی۔

”ہاں کہو وہی تو میں کہہ رہا ہوں۔“ وہ محبت سے بولے۔

”ابراہیم بھائی! امیر بڑا دل کرتا ہے ایک بار میں اپنے گھر جاؤں ویسے ہی دیکھنے کے لیے۔“ وہ اٹک اٹک کر بولی۔

”گھر۔“ وہ کچھ حیران رہ گئے۔ ”یہ بھی تو تمہارا گھر ہے“ انہوں نے اسے بہلایا۔

”ہاں وہ تو ہے۔“ وہ تامل سے بولی۔ ”لیکن صرف ایک بار۔ ایک بار میں ادھر جانا چاہتی ہوں۔ دیکھیے پلیز ابراہیم بھائی۔“ وہ آواز کو حتی الامکان لمبی بناتے ہوئے بولی۔

”گڑیا! میں تمہیں ادھر لے جاؤں وہاں تو کرائے دار رہتے ہیں ایسے تو اچھا نہیں لگتا نا اور کرایہ وغیرہ بھی ابوان سے لینے جاتے ہیں اب ہم جا کر دروازہ کھٹکھٹائیں کہ ہم نے گھر دیکھا ہے تو اچھا تو نہیں لگے گا نا۔“ انہوں نے اسے بھلیا۔

وہ چپ کر گئی اور دوبارہ مڑ کر مڑ چھیلنے لگی۔ وہ اسے کھڑے دیکھتے رہے۔

”اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔ کسی روز تمہیں لے جاؤں۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گئے تو وہ مڑ چھوڑ کر ہاتھوں میں منہ



چھپا کر رونے لگی۔

پھر کتنے دن گزر گئے نہ اس نے ابرار بھائی سے ان کے وعدے کے بارے میں پوچھا نہ انہوں نے دوبارہ کہا۔  
تائی جی کی لعن طعن سنتے سنتے وہ نویں میں آگئی۔ کچھ دنوں بعد عید آگئی۔ ماما پاپا کے بعد ان کی پہلی عید آئی تھی۔  
اور ان کی زندگی میں ان کی عید کیسے گزرتی تھی۔ وہ اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ عید پر ماما ان کا  
ایک لباس تیار نہیں کرتی تھیں ہمیشہ دو یا تین ہوتے تھے اور اپنی تیاری بھی وہ پورے اہتمام سے کرتی تھیں۔ ایک  
ہفتہ پہلے گھر کی تفصیلی صفائی کرتی تھیں۔ کئی قسم کے کھانے وہ دو دن پہلے ہی پکا کر فریز کر لیتی تھیں۔ پاپا چٹ پٹے  
کھانوں کے بے حد رسیا تھے اور ماما ہر چیز ہر کام میں پاپا کی پسند کو اولیت دیتی تھیں۔ عید والے دن ان کا گھر خوشیوں  
کی چکار سے مہک رہا ہوتا تھا۔ آدھا دن وہ گھر پر مہمانوں کو خوش آمدید کہتے تھے اور باقی کا آدھا دن باہر گزارتے تھے۔  
رات کا کھانا بھی باہر ہوتا تھا کسی اچھے ہوٹل میں۔

اور آج صبح ہی کتنی اداس تھی وہ کئی بار صبح سے ماما پاپا، عیبوہ، فاضلہ اور مون کو یاد کر کے رو چکی تھی۔ تائی جی نے  
اس کے کپڑے بنائے تھے لیکن اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا پہننے کو۔ تائی جی، ابرار بھائی اور ولید عید کی نماز پڑھ کر آگئے  
تو تائی جی نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہونے کو کہا وہ کپڑے پہننے چل دی۔ آج خلاف معمول تائی جی کا رویہ اس کے  
ساتھ اچھا تھا لیکن صبح صبح کھانا بھی انہوں نے خود ہی پکا لیا تھا۔

تائی جی اور ابرار بھائی نے اسے عیدی دی تھی اور ولید تو اس کی مٹھی میں بند روپے بھی کھینچنے کے چکر میں تھا۔  
پہلے دن سے اس سے جو ٹھنی تھی وہ آج تک چل رہی تھی۔ تائی جی اور تائی کی اور بات تھی ان کی ڈانٹ ڈپٹ اگرچہ  
اسے بہت بری لگتی تھی لیکن ولید سے اسے چڑھی۔ کئی بار اسے صرف ولید کی شکایت لگانے پر تائی جی اور تائی جی  
سے ڈانٹ اور مار پڑی تھی وہ دل سے اس سے بدظن تھی۔

عیبوہ اور غزالہ آئی نے شام کو ملنے آنا تھا۔ صبح ان کا عید مبارک کا فون بھی آگیا تھا۔ عیبوہ بہت خوش تھی کہ  
وہ شام کو آئے گی تو اسے اپنے کپڑے دکھائے گی۔ غزالہ آئی نے اس کے بہت اچھے کپڑے، چوڑیاں، جیوریں  
تھیں۔ تھوڑی دیر بعد سفینہ پھوپھو کا فون آگیا۔ اس نے مون سے بات کی تھی مون نے ریسیور پکڑتے ہی کہا تھا "می  
آبی عید مبارک۔" تو اس سے بات کرنا محال ہو گیا تھا۔ ماما کے بعد گھر میں سب سے زیادہ وہی تو مون کا خیال رکھتی  
تھی۔ چھوٹے ہونے سے لے کر اب تک۔ اور اب وہ اس سے اتنی دور تھا کہ وہ اسے دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔  
پھوپھو نے کہا تھا کہ وہ کچھ دنوں تک مون کو لے کر پاکستان کا چکر لگائیں گی لیکن ابھی زیر انکل مصروف ہیں۔ فون بند  
ہوا تو وہ پچھلے صحن میں جا کر رونے لگی۔ اسے تینوں بہن بھائی کتنا یاد آ رہے تھے۔ اس کی زندگی کی یہ کتنی عجیب عید  
تھی۔ ماں باپ سے دوری خدا نے لکھی تھی اور بہنوں بھائی سے دوری دنیا نے۔ کتنی دیر گزرتی جب ولید اسے دہلی  
کے کھانے کے لیے بلانے آیا۔ اس کے دل کا غبار رو رو کر ہلکا ہو چکا تھا وہ کھانا کھا کر برتن اٹھا رہی تھی۔

"میں عاکف کو دیکھو۔ دو بچے کو آئے" اسے بڑے بھائی کو عید مبارک کہنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ چلو خوند سہی  
اس بچی کی تو ایمن سے بات کروا دیتا۔ اسے تو دولت اور بیوی نے بالکل ہی اندھا بہرہ کر دیا ہے۔" تائی جی اونچا اونچا  
بول رہے تھے۔

"ہاں، آج تو عید کا دن تھا چھ سات ماہ ہو گئے۔ اسے فاضلہ کو لے کر گئے ہوئے۔ لاہور آیا کون سا سمندر پار ہے  
کئی بار یہ کراچی آتا جاتا ہے لا نہیں سکتا تھا اسے تھوڑی دیر کے لیے۔" تائی جی نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔  
"نیرا چکر لگتا لاہور کا چلو میں ہی ایمن کو لے جاتا ہوں ہم ملازمت پیشہ لوگ تو بندھے ہوتے ہیں۔" آج دونوں

کے ہی رویے ایمن کے حق میں بہت نرم ہو رہے تھے۔

"چلیں۔ آپ ہی اٹھ کر فون پر بات کروا دیں ایمن کی فاضلہ سے۔" تائی جی نے کہا۔

"ہاں میں ہی کرتا ہوں فون۔" کس ایمن ہی بات کرے گی۔ اتنا تو کجخت بل آجاتا ہے فون کا اسے تو توفیق نہیں  
ہوتی۔ جتنی اللہ نے دولت دی ہے۔ اتنا ہی دل کا کمینہ ہے یہ عاکف! اب اس غزالہ کو بھی دیکھو اتنے گئے گزرے  
حالات میں بھی سب سے پہلے اس نے دونوں بہنوں کی بات کروائی ہے، اچھی ہے غزالہ، اب شام کو کچھ اہتمام کر  
لیتا وہ جمال کے ساتھ آئے گی۔" تائی جی اٹھتے ہوئے بولے۔

"ہاں کر لیا ہے میں نے۔ اب اور کچھ نہیں ہوتا مجھ سے۔" تائی جی بڑبڑائیں۔ پھر تائی جی نے نمبر ملا کر اسے آواز  
دی۔ عاکف پچا تو گھوٹ نہیں ملے۔ فاضلہ کافی دیر بعد فون پر آئی۔ اس کی آواز اسی طرح تھی، سہمی سہمی مرل سی۔  
"فاضلہ! تم ٹھیک ہونا۔" ایمن اس کی آواز سن کر بے قراری سے بولی۔  
"ہوں! اس کی ہوں اور بے چین کر گئی۔"

"تم بولتی کیوں نہیں ہو فاضلہ جان؟ مجھ سے بات کرو۔ آج کون سے کپڑے پہنے ہیں۔ عید ہے نا آج۔" وہ جلدی  
جلدی بول رہی تھی تائی جی کی نظریں گھڑی کی سوئیوں پر تھیں۔  
"ہاں عید ہے۔ نئے کپڑے پہنے ہیں۔ آبی آجاؤ نا۔" وہ کہتے کہتے رو پڑی۔  
"فاضلہ! میں آؤں گی گزیا جان! تم ٹھیک ہو نا۔ خوش ہونا۔ اسکول جاتی ہونا۔"

"ہوں۔" وہ روتے روتے پھر ہوئی۔  
"ہوں ہوں۔ کیوں کر رہی ہو ٹھیک سے بات کرو نا۔" دوسری طرف خاموشی تھی۔  
"رو کیوں رہی ہو؟ تم کو کسی نے کچھ کہا ہے۔" وہ پریشان ہو گئی تھی۔  
"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" آنسوؤں میں بھگی اس کی گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔  
"تم عاکف پچا سے کہہ کر کسی روز آجاؤ نا کراچی۔" تائی جی کریڈل پر ہاتھ رکھنے والے تھے۔ اس نے جلدی سے  
کہا۔

"چھا! اس کا اچھا بھی خاصا تکلیف دہ تھا۔  
"فاضلہ بی بیسی بیسی ہے نا گزیا خوش رہتا ہے۔ اچھا تمہاری اپنی تمہارے لیے ڈھیر ساری دعا کرتی ہے۔ دل لگا کر  
پڑھتا ہے۔ میں آؤں گی کسی دن۔ پر اس کا اچھا خدا حافظ۔" دوسری طرف سے اس کا جواب سنے بغیر ہی اس نے  
ریسیور تائی جی کو پکڑا دیا کیونکہ وہ پہلے ہی کریڈل دبا چکے تھے وہ اپنے آنسو چھپا کر ہر نکل گئی۔

"فاضلہ ٹھیک نہیں ہے۔" کتنے دن اس کا دل بھی کتنا ہار اور گوی بھی اس خدشے کی نفی نہیں کر سکا تھا اور وہ اب  
دل ہی دل میں لاہور جانے کے منصوبے بنا رہی تھی کہ کسی طرح تائی جی کو راضی کرے۔  
پھر اس نے کئی بار تائی جی کی منت کی مگر وہ نہ مانے پھر دوبارہ اس کا فاضلہ سے رابطہ ہی نہ ہو سکا۔ بس دل میں ایک  
خلش سی رہ گئی اور وقت گزر رہا تھا۔  
اور طویل سات سال گزر گئے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)





۳  
تیسری قسط

کسی نے صحیح کہا ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی غم کوئی بھی منظرِ آخری نہیں ہوتا اور جب تک انسان زندہ رہتا ہے اس کی بینائی اسے وہ کچھ دکھاتی ہے جو شاید وہ دیکھنے کے بعد زندہ نہ رہنا چاہتا ہو مگر رہتا ہے۔ فضلہ کے لیے ان دنوں اس سے بڑا غم کوئی نہیں تھا کہ اس کے عزیز از جان سب سے پیارے ماما پاپا ایک بیک الٹھے اس کی نظروں کے سامنے اس دنیا سے اٹھ گئے اور اس سے بھی بڑا غم کہ انہیں ان ہی کے گھر سے بے گھر کر دیا گیا۔ ماما پاپا مر کر بے گھر ہو گئے اور یہ جیتے جی بے گھر کر دیے گئے۔ یہ دو صدمے اس کی عمر بھر کی پرسکون نیند اڑانے کے لیے کافی تھے مگر یہ کافی نہیں تھے کہ اس سے بڑا صدمہ اس کا منتظر تھا جو اس کے ننھے دل نے سہا وہ تھا جدائی کا صدمہ۔ اپنے پیارے ماں باپ کے جگر گوشوں سے جدائی کا صدمہ جیسے ایک جسم کے مختلف حصے کاٹ کر جدا کر دیے گئے ہوں اور اس آخری زخم نے ثابت کیا کہ پہلے دو صدمے اس کے مقابلے میں کم تھے پھر باقی کے دن اسی امتیڈ پر گزر گئے کہ شاید یہ جدائی پالی جاسکے شاید اس دوری کو سمیٹا جاسکے شاید کوئی معجزہ رونما ہو جائے وہ پھر سے تینوں بہن بھائیوں سے مل سکے مگر اب معجزوں کا زمانہ تو نہیں تھا ہاں البتہ اس کے ارد گرد کے ماحول نے اسے مزید اپنے خول میں سمٹنے پر مجبور کر دیا۔

عاکف چچا جو آخری بار اسے مئی کے کمرے میں چھوڑ کر گئے پھر کئی ماہ تک وہ ان کی شکل بھی نہ دیکھ سکی۔ اسے ہمہ وقت مئی کے کمرے میں رہنا پڑتا اور اس دوران اگر نرگس آنٹی مئی کے کمرے میں آتیں بھی تو وہ پاؤں سوٹی بن جاتی، بیٹھی ہوتی تو نگاہوں سمیت جیسے خود کو زمین میں پیوست کر لیتی کھڑی ہوتی تو رخ بدل کر خواجوا کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے لگتی۔ نرگس آنٹی کو دیکھتے ہی اسے خیال آتا کہ کہیں وہ اسے ہاتھ پکڑ کر کسی میم خانے میں نہ چھوڑ آئیں۔ یہاں کم از کم کبھی نہ کبھی آپنی وغیرہ سے ملنے کی امید تو تھی۔

سارہ اکثر مئی کے کمرے میں آتی۔ سارا کمرہ الٹ پلٹ دیتی مئی کے بستر پر اچھلتی سارے کھلونے اٹھا کر بیڈ پر لے آتی پھر خواہ مئی سو رہی ہو تیں وہ کوئی پروانہ کرتی اماں کی طرح فضلہ اسے بھی پسند نہیں آتی تھی جس کا اظہار اس نے برملا مئی کے سامنے فضلہ سے پہلی ملاقات ہی میں کر دیا تھا۔ مئی نے ٹوکا تھا تو وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”جو مجھے نہیں پسند وہ نہیں پسند۔“ وہ فضلہ سے ایک آدھ سال بڑی تھی۔

”نرگس! یہ فضلہ کو کسی اسکول میں داخل کروادو۔ اسے اب رہنا تو یہیں ہے نا۔“

”اٹھویں دن مئی نے نرگس آنٹی سے کہا تھا وہ کافی سارے پیپر ز مئی سے سائن کروانے لائی تھیں۔ ان کا مزاج



پہلے ہی براہور ہاتھا۔ فضلہ نے ان کے اندر داخل ہوتے ہی اندازہ لگالیا تھا۔

”مہی! اسے میں نے صرف آپ کی وجہ سے آپ کے کہنے پر یہاں رکھا ہے اور اب اسے یہیں رہنا ہے آپ کے پاس۔ اسکول مدرسوں کے چونچلے میں نہیں اٹھا سکتی۔ اگر آپ کو منظور ہے تو اسے رکھیں ورنہ عاکف اسے واپس پھینک آتا ہے۔ میں اس قسم کی کوئی ہڈک نہیں پال سکتی، آپ بھی آئندہ یہ اسکول وغیرہ کا خیال نہ کیجئے گا۔ یہ شکر کریں کہ میں نے اسے یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔“

ان کا لہجہ حد درجے کٹھن اور نفرت انگیز تھا۔ اس کے سمجھے ذہن نے ان کی بات پر دوسری بار سوچا کہ کاش وہ نہ ہوتی۔ پہلی بار ماما پاپا کے بعد اسے یہ خیال آیا تھا۔

”نرگس! ڈونٹ لی سو روڈ (اتنی سخت نہ بنو) کچھ تو خیال کرو۔ معصوم بچی ہے، اس کا بھی دل کرتا ہو گا پڑھنے کو، اسکول جانے کو۔“ مہی نے نرگس آنٹی کو ٹوکا۔

”مہی پلزز! Mind your own business“ (اپنے کام سے کام رکھیں) وہ انتہائی بد تمیزی سے گویا ہوئیں، ان کی نظر میں کوئی لحاظ نہیں تھا۔ ”آپ ان پیپر ز پر سائن کریں اور اس کے دلی جذبات کا خیال چھوڑیں۔ میرے پاس اتنا فالٹو وقت نہیں ہے۔ کہ اس فالٹو بحث میں پڑوں اور آپ بھی یہ فضول ہمدردیاں کرنا چھوڑ دیں ان نیکیوں کا کچھ صلہ نہیں ہوتا۔“

وہ فائل ان کے آگے کھول کر ایک کے بعد ایک ورق لٹتے ہوئے بولیں ”اور آپ کا وکیل اتھارٹی پیپر کب تیار کرے گا دو ماہ ہو گئے مجھے سنتے سنتے۔“

”میں نے کل فون تو کیا تھا کہ رہا تھا کہ آج ضرور آئے گا بہر حال ایک دو روز میں تم یہ سائن وغیرہ کی زحمت سے بھی بچ جاؤ گی۔ یہ لو کہیں اور تو سائن نہیں کرنے۔؟“ انہوں نے پین بند کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں بس یہی کرنے تھے۔“ وہ سیدھی ہوتے ہوئے بولیں۔

”نرگس! تم نے ڈاکٹر افتخار کو فون کر کے نہیں بلایا۔ میں نے کل کہا تھا اور آج فون بھی کیا تھا وہ اپنے کلینک میں نہیں تھے۔ تم پتا کرو مجھے تو رات بھر نیند نہیں آئی اوپر سے یہ کھانسی نہیں سونے دیتی۔ پتا نہیں کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔“ انہیں پھر سے کھانسی آنے لگی۔

”مہی! ڈاکٹر افتخار تو آج کل یو کے گئے ہوئے ہیں، دو چار روز میں آجائیں گے تو ان سے کہہ دوں گی، آپ سیلنگ پلزلے لیا کریں، اب علاج وہ کر رہے ہیں تو کسی اور ڈاکٹر سے کنسلٹ کرنے کا کیا فائدہ؟ بس اب چلتی ہوں، بڑے کام ہیں آج کل آفس میں، اوکے مہی!“ وہ مہی کا جواب سنے بغیر ٹک ٹک کرتی باہر نکل گئیں، مہی گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔

پھر نہ تو ڈاکٹر افتخار ہی آئے ان کا یو کے کا وزٹ چھ ماہ پر پھیل گیا تھا اور نہ ہی مہی کی کوشش کے باوجود فضلہ کو اسکول میں داخل کرایا گیا۔ ہاں نرگس آنٹی کے نام اتھارٹی پیپر ضرور تیار ہو گیا۔ جس کے بعد وہ بیڑھ ماہ تک مہی کے کمرے میں ہی نہ آئیں، کیونکہ وہ ان دنوں بہت بڑی تھیں فیکٹری مل اور ایک ملٹی انشوری پلانز کی خرید میں۔

مہی کی کھانسی بڑھتی گئی ان کی فینڈ بالکل ختم ہو گئی، وہ بیماری رات جاگتی رہتی تھیں اور کھانسی راتیں فضلہ نیند سے بو جھل سرخ آنکھیں لیے انہیں کبھی کوئی سیرپ دیتی تو کبھی کوئی مگر کھانسی کی شدت میں کمی نہ آئی۔ ملازمہ سے اسے پتا چلا کہ عاکف چچا امریکہ گئے ہوئے ہیں ایک ہفتے پہلے وہ مہی سے ملنے آئے تھے جب وہ سو رہی تھی۔

مہی نے اس کے لیے کتابیں منگوائی تھیں وہ اسے خود ہی پڑھانے لگی تھیں لیکن ان کی اپنی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔

”مہی! آپ کسی اور ڈاکٹر کو بلا لیں آپ کی طبیعت بہت خراب ہے۔“ ایک دن ڈرتے ڈرتے اس نے مشورہ دیا۔

”ہاں بیٹا یہی سوچ رہی ہوں میں بھی، لیکن آج کل نہ تو عاکف گھر پر ہے نہ نرگس، ڈاکٹر خالد میرے پہلے معالج تھے۔ ان کے کلینک آج فون کروں گی۔“ وہ سوچتے ہوئے بولیں۔

پھر اگلے روز انہوں نے فون کر کے ڈاکٹر خالد کو بلا لیا۔ انہوں نے مہی کو دھیان سے چیک کیا اور کچھ ٹیسٹ بھی لکھ کر دیے۔ میڈیسن تو مہی نے ملازم سے منگوا لیں مگر ٹیسٹوں کے لیے لیبارٹری جانا ضروری تھا اور جب پندرہ دن بعد نرگس آنٹی اور عاکف چچا امریکہ سے آئے تو نرگس آنٹی مہی سے لڑ پڑیں کہ ”آپ نے ڈاکٹر خالد کو چیک کیوں کروایا اس نے کچھلی بار بھی آپ کے کیس کو خراب کیا تھا۔ کتنا عرصہ لگا تھا ڈاکٹر افتخار کو سب Recover کرنے میں اور آپ ہمیشہ اپنی من مانی کرتی ہیں، پھر اس بڈھے کی اوٹ پٹانگ میڈیسن لے لی ہوں گی پھر مسئلہ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر افتخار نے اگلے ماہ آہی جانا تھا مگر آپ کو کون سمجھائے۔“

”پتا نہیں نرگس آنٹی ہر وقت اتنے غصے میں کیسے رہ لیتی ہیں۔“ ان کے شکوے ں بھرے ماتھے کو دیکھ کر اس نے سوچا۔

”نرگس! مجھے بہت تکلیف تھی، رات رات بھر نہیں سو سکتی تھی، اس کھانسی کے ہاتھوں اور خالد کی دوا کھاتے ہوئے تو مجھے ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا ہے، لیبارٹری ٹیسٹ جو اس نے لکھ کر دیے تھے، وہ تو میں نے کروائے ہی نہیں پھر بھی خاصا افتادہ ہوا ہے رات کو کچھ سکون رہتا ہے۔“ مہی کی آواز خواجوا بھرتی۔

”بہر حال جب تک ڈاکٹر افتخار نہیں آجاتے آپ یہ میڈیسن نہ کھائیں، میں تو یہی کہوں گی آگے آپ کی مرضی۔“ وہ بے رخی سے کہتے ہوئے کھڑی ہو گئیں ”میں سوئے جا رہی ہوں سفر نے آج بہت تھکا دیا ہے، آرام کروں گی۔ اب آپ بھی آرام کریں اوکے مہی!“

وہ کبھی بھی مہی کا جواب نہیں سنتی تھیں، ذرا سا جھک کر انہوں نے مہی کے ماتھے کو ہونٹوں سے ہلکا سا ٹپ کیا اور باہر نکل گئیں۔

اگلے ماہ جب ڈاکٹر افتخار آئے تو مہی کی تکلیف حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ کتنے دن لگ گئے ان کے ٹریٹمنٹ میں، کتنے ہی لیبارٹری ٹیسٹ کروائے گئے، جن کے رزلٹ سب کے لیے شاکنگ تھے، مہی کوئی بی تھی ان کے پیچھے پڑے بری طرح سے تباہ ہو چکے تھے۔

”میں نے بکواس کی تھی اس بڈھے کھوسٹ مینٹل ڈاکٹر کی دوائیں مت کھائیں۔ وہ تو اب کسی جانور کا علاج کرنے کے قابل نہیں رہا، مگر آپ کو تو پرانی کلاس فیلوشپ کی یاد ستاتی تھی، کبھی آپ نے کسی کی سنی ہے اب مزہ چکیں بیٹھے بٹھائے نیا روگ لگ گیا۔“

نرگس آنٹی کی بلند آواز کے سامنے مہی کی پست منمننا ہٹ سنائی ہی نہ دی۔ ”اور بیماری دیکھیں کیا غریبوں اور مفلوک الحال لوگوں والی لگی ہے۔“ وہ حقارت سے بولیں۔

پھر نرگس آنٹی نے ان کے کمرے میں آنا بالکل موقوف کر دیا۔ ایک روز عاکف چچا نرگس آنٹی کا پیغام مہی کے لیے لائے۔

”ڈاکٹر نے آپ کو کھلی ہوا میں رہنے کو کہا ہے۔ اس لیے آپ کو انیکسی میں شفٹ کیا جا رہا ہے، انیکسی بہت ہوا دار ہے۔“ اسی روز نو کروں نے مہی کا سامان انیکسی میں شفٹ کر دیا اور ساتھ ہی ان کو بھی وہیل چیئر سمیت۔

نرگس آنٹی کے اس بے دردی نے مہی کو جیسے توڑ کر رکھ دیا۔

”کاش میں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر اس کو نہ تھمائے ہوتے۔ میں نے کتنی بڑی غلطی کی۔“ وہ خود ہی بڑبڑاتی رہیں۔

811



ڈاکٹر افتخار کی تجویز کردہ میڈیسن سے بھی انہیں کوئی خاص افادہ نہیں ہو رہا تھا اور کچھ ویسے بھی دوا لینے کے معاملے وہ خاصی لاپرواہ ہو گئی تھیں۔ ان کا مرض بڑھتا جا رہا تھا نرسز آئی کھڑے کھڑے آتیں کھڑے کھڑے حال چال پوچھ کر چل دیتیں۔ سارہ تو اب آتی ہی نہیں تھی۔ فضلہ ان کی دیکھ بھال اور دل بہلانے پر مستقل مامور کر دی گئی تھی۔ اس کا بچپن ان کی بیماری اور ان کے پریشان برہائے میں کہیں گم گیا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے بڑے بڑے غموں کو جسم دیکھ لیا تھا۔ اسے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کبھی کھلونوں سے بھی کھیلی ہے۔ ایک ایک کر کے دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں ڈھلتے گئے اور وقت کو روکنے والا کون ہے۔ سات سال گزر گئے مئی کو اب کھانسی کے ساتھ ساتھ خون بھی آنے لگا تھا، شروع شروع میں تو وہ بہت گھبرائی تھی مگر پھر عادی ہوتی چلی گئی۔ مئی نے اس کے لیے اب یوٹر رکھ دیا تھا۔ اپنے ذاتی پیسوں پر جس کا نرسز آئی کو بہت قلق تھا۔ انہوں نے مئی کی پاکٹ منی کم کر دی تھی۔ مگر مئی نے پروا نہیں کی تھی۔ آج کل ان کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے وہ میٹرک کے پرائیویٹ امتحان کی تیاری کر رہی تھی اور مئی کا مرض جیسے آخری اسٹیج سے آن لگا تھا۔ اب نہ بوڑھی پسیلوں میں کھانسنے کا دم رہا تھا اور نہ جسم میں اتنی طاقت کہ خون اگل سکے۔

”میڈم! آپ انہیں مری سینی ٹوریم میں بھیج دیں یہاں اب ان کو رکھنا بے کار ہے۔“ ڈاکٹر افتخار نے اس دفعہ نرسز آئی سے صاف کہہ دیا۔

وہ خود بھی اکتا چکی تھی مئی کی اتنی لمبی بیماری سے، فوراً ”آماہ ہو گئیں۔ مئی نے البتہ انکار کر دیا کہ وہ نہیں جائیں گی مگر ان کی سنتا کون تھا اگلے ہی ہفتے ان کا سامان پیک کر کے گاڑی میں رکھوا دیا۔ ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر ان کا منیجر کمال تھا اور پچھلی سیٹ پر مئی کا بوڑھا ادیبہ مواہود اور جھریوں بھرا سفید کورے لٹھے جیسا چہرہ فضلہ کی گود میں۔ گاڑی لاہور سے مری کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

سات طویل سال جیسے پلک جھپکتے میں گزر گئے تھے۔ دیکھنے کو ایسا ہی لگتا تھا مگر سوچنے بیٹھو تو جیسے سات صدیاں تھیں جو قطرہ قطرہ اس کی روح کے اندر اترتی تھیں اور جب وقت کو لمحوں میں ناپا جائے تو ایسے ہی لگتا ہے جیسے وقت گزر نہیں رہا بلکہ ہم پر ہماری بے بسی پر ہنس رہا ہے۔

عبیہ تو اکثر ہی آجایا کرتی تھی غزالہ آئی کے ساتھ اس سے ملنے وہ خود بھی فون کر لیا کرتی تھی عبیہ میں جیسے کوئی خلیج نہیں آیا تھا۔ ان سات سالوں میں بھی وہ ویسی ہی تھی ہر طرح کے حالات میں پرسکون رہنے والی جذبات پر لاجب کو ترجیح دینے والی اور ایمن کے نزدیک کول ہارٹڈ وہ ہر چیز کو ہوا فتنے کو بے حد سرسری انداز میں لیا کرتی تھی۔ بڑی سے بڑی بات بھی اس کے نزدیک عام سی ہوتی تھی۔ جب ایمن اس اہم بات پر کڑھ کڑھ جایا کرتی تھی کہ مون کے فون کو آئے مہینے سے اوپر ہو چلا ہے تو عبیہ لاپرواہی سے کہہ دیتی ”اسٹڈیز میں بڑی ہوگا کر لے گا دو چار دنوں میں اس میں اتنا کاتیش ہونے کی کیا ضرورت ہے امی!“ تو امی جی جان سے جل کر رہ جاتی۔

”عبیہ! اتنے دن تو اس نے کبھی بھی نہیں لگائے ہفتے پندرہ دن بعد تو لازمی فون کر لیتا تھا اور اب تو مہینہ ہونے کو آیا ہے۔ معلوم نہیں کیا بات ہے۔ میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔“ وہ واقعی ان دنوں اس بات پر بے حد پریشان تھی۔ ”امی! تمہارے دل کو تو بونہی عادت ہے گھبرا جانا۔ کیا بات ہوگی بھلا۔ وہ اسٹڈیز میں بڑی ہو گیا کہیں سیر کو وہ لوگ گئے ہوں گے فون کی کچھ پراہم ہوگی ہوگی یا کوئی اور گھریلو مسئلہ“ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا مجھے بتاؤ بھلا۔“ عبیہ زچ آجاتی اس کی اس درجہ حساسیت سے۔

”انکل زبیر نے فون کرنے سے منع کر دیا ہوگا کہ بل زیادہ آتا ہے وہ اسی طرح کے ہیں Materialistic (مادہ پرست)۔ پالی پالی جوڑنے والے۔“ وہ اپنے خدشے کا اظہار کرتی۔

”بھئی اگر ایسا کیا بھی ہوگا تو صحیح ہے۔ ظاہر ہے ایک بندہ جب محنت کرتا ہے تو روپے کو بے مقصد اڑاتے ہوئے اسے تو دکھ ہوگا اور یہ فون تو ہے ہی آج کل کے زمانے کی عیاشی، فضول میں محض خیر خیریت دریافت کرنے میں دو ڈھائی ہزار برباد کر دو، یہی کام دس روپے کا خط لکھ کر بھی آرام سے ہو سکتا ہے۔ تمہارے اصرار کی وجہ سے پچھو ہر ہفتے دس بارہ منٹ کا فون کروا دیتی ہیں مون سے۔ تمہیں خود سوچنا چاہیے۔“ وہ الٹا اسے تار دیتی۔ عبیہ کی حقیقت پسندی اسے آگ لگا جاتی۔

”کیا سوچنا چاہیے ہمیں“ ایک تو ہمارے بھائی کو ہم سے اتنی دور لے گئیں۔ پتا نہیں کیسے رکھا ہوا اسے مہینے مہینے بعد فون کروا تی ہیں، جس سے اور تڑپ بڑھتی ہے۔ سات سال ہو گئے ہیں اس کی شکل دیکھے ہوئے۔ ایک ہی بھائی تھا ہمارا، کون سے پانچ سات تھے جو انہوں نے یوں ہمیں تقسیم کر دیا، اس وقت ان ظالموں نے کچھ نہیں سوچا۔ اب اگر وہ سوچاں اس کا فون کروا دیتی ہیں تو کون سا احسان کرتی ہیں۔ جدائی سے بڑھ کر کوئی ظلم ہوگا وہ بھی جیتے جی ایسے ہمیں ایک دو سرے سے دور کر دیا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”امی! جہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں کچھ اور سہی اور پھر ویسے بھی وقت تو گزر رہا ہے اچھا برا گزر ہی گیا ہے نا۔ اب تو تمہیں حالات کو سمجھ لینا چاہیے جتنے ہمارے سکھ کے قربتوں کے دن تھے سو گزر گئے کہ اللہ نے یہی کچھ لکھ رکھا تھا اب بھلا کوئی اللہ سے بھی لڑ سکتا ہے۔“ عبیہ نے اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے اسے سمجھایا۔

”نہ کوئی بندوں سے لڑ سکتا ہے نہ اللہ سے، تو بتاؤ ہم جیسے پھر کس سے شکایت کریں جا کر۔“ وہ رونے لگی تھی کس کا قصور ہے پھر اس سارے قصے میں کون ظالم ہے؟“

”کوئی بھی نہیں، نہ ہم نہ یہ سارے لوگ۔ انہوں نے بھی وہی کیا جو حالات کا تقاضا تھا اور تھوڑا بہت نرم گرم تو ہر کوئی اپنے حساب کے مطابق ہو سکتا ہے۔ اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں بلکہ الٹا ان کا ہم پر احسان ہے کہ انہوں نے ہمیں سنبھالا اور امی! اگر انسان شکایت اور شکوے کا خیال دل سے نکال دے تو یقیناً کروڑوں زندگی بہت نہ سہی پھر بھی سہل گزر سکتی ہے۔ اس شکوے اور شکایت سے کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا، الٹا اپنا ہی خون جلتا ہے دماغ خراب ہو جاتا ہے اور منفی خیالات جنم لیتے ہیں، کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔“ عبیہ نے پتا نہیں کن تجربات اور تجزیات کی بجائی سے گزر کر یہ سب کچھ سیکھا تھا لیکن ہر انسان اپنی ہی فطرت کے مطابق ہی سیکھ سکتا ہے اور جو وہ سیکھتا ہے وہ دوسروں کو اس درجے تک نہیں سکھا سکتا۔ ہر ایک کی بصیرت اتنی ہی روشن ہوتی ہے جتنی کہ وہ تمنا کرتا ہے۔

”منفی خیالات جنم لیتے ہیں تو اس میں بھی میرا قصور ہے، بتاؤ فضلہ کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے، کبھی عاکف چچا کو خیال آیا کہ وہ اسے ملوانے لے آئیں۔ کوئی سات سمندر پار تو نہیں بس رہے وہ۔ اسی ملک کی سرحدوں کے اندر ہیں اور انہوں نے ہمیں صدیوں کے فاصلے پر کھڑا کر دیا ہے۔ اور میں تم اتنے بے بس ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی اس معمولی فاصلے کو دوری کو نہیں مٹا سکتے۔ اس کی خبر نہیں لے سکتے۔ عبیہ ہم اتنے مجبور کیوں ہیں، میں کیا کروں مجھے فضلہ کا خیال بہت ستاتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے وہ اچھے حالوں میں نہیں ہے۔ اب ان خدشات میں تو میرا کوئی قصور نہیں۔“ وہ اس کے کندھے سے لگ کر رونے لگی۔

”ہاں امی! تم درست کہتی ہو، فضلہ کو دیکھتے اتنے برس ہو گئے، اکٹھے سات سال کم نہیں ہوتے۔ پتا نہیں اب وہ کیسی ہو گئی ہوگی۔ اسی طرح بھولی بھالی معصوم سی یا۔۔۔“



وہ دور نہیں کھو گئی جیسے تصور میں سات سال کے اتار چڑھاؤ کے غبار میں سے فضلہ کو تراش رہی ہو۔ ”ایمی! اب فضلہ میٹرک میں ہوگی تاہم اس سال میٹرک کر لے گی ہے نا؟“ وہ کچھ چونک کر بولی جیسے حساب لگا رہی تھی۔

”پتا نہیں شاید وہ کچھ بتاتی بھی تو نہیں۔“ ایمین نے اس کے کندھے سے سر اٹھا کر اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ بھی ہے غزالہ! آئی سے میں نے ایک دوبار کہا بھی وہ لے بھی جاتی تھیں لیکن لاہور میں ان کا کوئی رشتہ دار نہیں اس لیے وہ ہریار چپ کر جاتی ہیں۔ وہ عائف چچا کی طرف کبھی نہیں ٹھہریں گی ورنہ میں ہی جا کر فضلہ سے مل آتی۔“ عبیدہ بولی۔

”پھر تم کہتی ہو جلتے کڑھنے سے کیا فائدہ؟ پھر میں اور کیا کروں اگر مومن اور فضلہ بھی تمہاری طرح نزدیک ہوتے؟ ہم اس طرح مل لیا کرتے تو شاید میرا دل اس قدر بے چین نہ ہوتا۔ حالات پر قرار آجاتا مگر ان دونوں کی دوری۔؟“ اس نے گہرا سانس لیا۔ ”پتا نہیں کب تک یہ دوریاں رہیں گی۔“

”ہوں۔۔۔“ عبیدہ بھی چپ تھی۔

”عبیدہ! تمہاری اسٹڈیز کیسی جا رہی ہے؟ ایف ایس سی میں تمہارا میرٹ بن جائے گا نا۔“ اس نے موضوع بدلا۔

”انشاء اللہ اسٹڈیز تو میری اے ون جا رہی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے ناسیلف اسٹڈیز کی وجہ سے میں اپنی پڑھائی میں ہمیشہ ٹھیک رہی ہوں باقی رہا میرٹ تو دیکھو وہ بھی بن جائے گا۔ امید تو ہے سب پیچرز کا بھی یہی خیال ہے۔ بس ایک بار ڈاکٹر بن جاؤں! ایمی پھر میں فضلہ کو ادھر ہی لے آؤں گی کراچی میں، بلکہ ڈاکٹر بھی کیا بس میڈیکل میں ایڈمیشن ہو گیا تو سمجھو پہلی سیڑھی پر قدم آجائے گا تم دعا کرنا۔“

”وہ تو میں ہر وقت کرتی رہتی ہوں تم تینوں کے لیے تم ڈاکٹر بن جاؤ میں بھی بس اس سال بی ایس سی کے بعد کہیں جاب کر لوں گی تو دیکھنا اگلے سال ہی فضلہ کو یہاں لے آؤں گی۔ جاب کے بعد تو مجھے کوئی نہیں روک سکے گا نا بس اب یہ فور تھ ایر اور پھر رزلٹ کے بعد جاب اس بات سے مجھے تایا جی اور تائی جی بھی نہیں روک سکیں گی بہت ڈر لیے اب نہیں ڈروں گی۔“ وہ عزم سے بولی۔

”اگر تایا جی نے کہا کہ وہ ایگزٹام کے بعد تمہارے ہاتھ پیلے کر دیں گے تو پھر؟“ عبیدہ نے اسے چھیڑا۔

”عبیدہ!۔۔۔ اس قسم کا بے ہودہ خیال بھی ذہن میں نہ لانا بس اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ جب تک ہم سب اکٹھے نہیں ہو جاتے اور اپنے گھر نہیں چلے جاتے۔“ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں تھیں اس خیال سے۔

”اپنے گھر۔۔۔؟“ عبیدہ کھو سی گئی۔

”ہاں تمہیں کوئی شک ہے؟“ ایمین نے اسے گھورا۔

”ایمین تم نے دیکھا ہے جب چڑیا کے ننھے بچے اڑنا سیکھتے ہیں اور گھونسلے سے باہر پہلی اڑان لیتے ہیں اور پھر کچھ ہی دنوں میں کھلے بسیط آسمانوں میں لمبی لمبی اڑانیں پر پھیلا کر لیتے ہیں تو پھر گھونسلے میں واپس نہیں آتے۔ ان کے تنکوں سے بنے گھروندے ان کو دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ پھر وہ تھیں اور جا کر تنکے جوڑ کر نیا آشیانہ بناتے ہیں And It's natural (اور یہ قدرتی ہے) کائنات کا جنم اکالی سے ہوا تھا اور اس کا اختتام بھی Unit ہے م جانتی ہوں۔“ وہ تائی جی کے غرغور غرغور کرتے کپوتوں پر نظر جمائے مدھم آواز میں بول رہی تھی۔

”عبیدہ! پرندوں اور انسانوں میں فرق ہوتا ہے مگر اتنا بھی نہیں۔ پرندوں کا آشیانہ تنکوں کا گھروندا نہیں یہ کھلا آسمان ہوتا ہے اور آسمان تو کہیں نہیں بدلتا انسان بھی جب ایک یار گھر بنا لیتا ہے تو چاہے کتنی ہی اڑانیں کیوں نہ

لے لے واپس وہیں آتا ہے۔“ اسے عبیدہ کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

”ہا۔۔۔ کون جانے، اگلی اڑان کس کو کہاں لے جائے۔ میں اور تم سوچنے پر تو قادر ہیں کرنے پر تو نہیں نا؟“ وہ کپڑے جھاڑتے ہوئے میڑھیوں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”انسان کی تقدیر اس کے خیالات بناتے ہیں انسان جو سوچتا ہے خدا اسے ویسا ہی دکھاتا ہے۔ اس لیے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی کہ ہم کبھی اکٹھے نہیں ہو سکیں گے۔ انشاء اللہ ہم اپنے پیارے ماما کے گھر ایک روز ضرور اکٹھے ہوں گے۔“ وہ اسی عزم سے بولی۔

”آمین اللہ کرے ایسا ہی ہو، چلو اندر چلتے ہیں۔“ وہ کہہ کر اندر کی طرف مڑ گئی تو ایمین بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑی۔

♥ ♥ ♥ ♥

مری دیکھنے کا اسے بہت شوق تھا، بلکہ وہ عمر کے جس حصے سے گزر رہی تھی اس میں سبھی کو گھومنے پھرنے اور نئی جگہیں دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ مری پاکستان کا سوئٹزرلینڈ، ملکہ کوہسار، کتابوں نے میڈیا نے اس علاقے کو اس طرح سے دکھایا گیا ہے کہ خواہ مخواہ دل میں اشتیاق پیدا ہوتا ہے کہ سوات کاغان نہ سہی مری تو دیکھ لیا جائے اور اس کا یہ شوق پورا بھی کس طرح ہو رہا تھا کہ مری کی موت اور زندگی کی وحشت اس کے سر پر سوار تھی اگر مری نہ رہیں تو۔۔۔

”یہ تو“ ایک خوفناک سوالیہ نشان بن کر دن رات اسے ڈرا رہا تھا۔ مری کے اس بندھال بوڑھے وجود کی وجہ سے ہی تو وہ اس گھر میں تھی اگر یہ نہ رہیں تو میرا کیا ہوگا۔ خوف سے اسے جھرجھری آجاتی باقی رشتہ داروں نے تو کبھی خبر بھی نہ لی تھی۔ تایا جی غزالہ آئی اور سفینہ پھوپھو کوئی بھی تو کبھی ملنے نہیں آیا تھا۔ ”اگر ادھر سے نکال دی گئی تو کیا وہ لوگ مجھے قبول کر لیں گے جن کی صورتیں بھی اب مجھے یاد نہیں۔“ وہ ان وسوسوں سے گھبرا اٹھتی۔

مری سنی ٹوریم جہاں ہم معاشرے کے بگاڑ کو لا کر تو انا بنانا چاہتے ہیں۔ معاشرہ انسانوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک نہ کرے تو کسی معاشرے میں کسی سنی ٹوریم کا کسی اولڈ ٹائمل کلوڈ نہ ہو مری سنی ٹوریم کیوں تھا کیونکہ لوگ ابھی بھی بھوک سے، سیلن زدہ تنگ و تاریک کوٹھڑیوں سے، جسموں کو اندر ہی اندر کھاجانے والے غم و الم کا شکار ہو کر خون اگلنے تھے وہ خون جو زندگی کی علامت ہے ذرا کم پڑ جائے تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں، ایک ایک قطرے کے لیے لوگ بھیک مانگنے سے دریغ نہیں کرتے ہاتھ پھیلا پھیلا کر جسموں کے اندر خون کے اس خزانے کو بناتے ہیں اور جب یہی سرخ لاوا بغاوت کرتا ہے تو انسان اسے اپنے جسم سے باہر اگلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ مرض کتنا تکلیف دہ کتنا اذیت ناک ہے کہ انسان خود چاہتا ہے کہ کاش زندگی کی ڈور کو کاٹ کر مختصر سے مختصر کر سکے۔ اس کا اندازہ اسے مری کی حالت دیکھ کر ہو رہا تھا وہ موت مانگ رہی تھیں زندگی کے زندہ لمحوں سے موت مانگ رہی تھیں اور موت ان سے آنکھ پھولی کھیل رہی تھی۔ پل میں ایک جان کے پاس اور پل میں دور کھڑی ہو کر ان کی بے بسی پر مسکراتے لگتی۔ اس وقت انہیں موت سے بڑھ کر اور کسی چیز میں عافیت نظر نہیں آرہی تھی اور دولت کی فراوانی ان کے لیے اس سہولت کے مہیا کرنے کے رستے میں دیوار بنی کھڑی تھی۔

سنی ٹوریم میں آتے ہی کچھ دنوں بعد ان کی طبیعت سنبھل گئی تھی، کچھ وہاں کی فضا آب و ہوا، کچھ مرض کے مطابق علاج، دوسرے گھریلو ماحول کی سٹیشن سے دوری۔ یہاں ان کیسی میں دور دور سے آتی نرگس آئی کی بکاش مالکانہ حقوق کا بھرپور اظہار کرتی آواز ان کی تکلیف کو بڑھادی تھی پھر سارہ کا آتے جاتے ان کیسی کے دروازے پر کھڑے ہو کر ”ہائے گریبی! ہاؤ آریو“ کہنا ان کے اندر کی رنج کو اور بھڑکا دیتا تھا۔ اندر کوٹھی میں باہر کے لان میں جب بزنس



پارٹنر ہوتیں کھٹ کھٹ گاڑیوں کے دروازے ٹھٹھتے بند ہوتے خوشی بھرے نارمل قمقمے کاروباری آوازیں تجارتی دھیمی دھیمی سرگوشیاں، سرسراہٹیں قدموں کی آہٹیں پاس آتیں اور دروازے کے پاس آکر دوڑ چلی جاتیں تو ان کی کھانسی شدید ہو جاتی یہاں کم از کم ان تکلیف دہ چیزوں سے انہیں نجات مل گئی تھی۔

ان کے مری آنے کے چوتھے روز نرس آنٹی کا فون آیا تھا۔ مری کی خیریت پوچھ رہی تھیں فضا نے کہا کہ اب ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے ڈاکٹر زکچہ پرامتید ہو گئے ہیں کہ بہت جلد نہ سہی پھر بھی اب موت کو جیت اتنی آسانی سے نہیں ملے گی۔ اسے یقین تھا کہ آنٹی خوش ہوں گی اس خوش خبری کو سن کر لیکن انہوں نے ”اچھا ٹھیک ہے خدا حافظ“ کہہ کر ٹھک سے فون بند کر دیا پھر تین چار ہفتے ان کا نہ کوئی فون آیا نہ وہ خود۔

وہ صبح و شام ہرے بھرے لان میں مری کی وہیل چیئر لے کر انہیں سیر کرواتا، ان کے کمزور بوڑھے وجود کو گرم کپڑوں اور کبل میں چھپا کر وہ کتنی کتنی دیر باہر گھومتی رہتی۔ مری کی بیماری کی ٹینشن اور اپنے مستقبل کی فکر کے باوجود بادلوں سے ڈھکا آسمان، ارد گرد کے ہرے بھرے نظارے اور اونچے اونچے سرخسٹیاں پہاڑ اسے کتنی کتنی دیر تک مسحور کیے رکھتے۔ اس کا دل چاہتا وقت گھٹم جائے اور وہ ساری زندگی ان ہی نظاروں کو دیکھتی رہے یا ان کا حصہ بن جائے۔ اکتوبر کے مہینے میں جب میدانی علاقوں میں لوگ سردی گرمی کے مسم موسم کو انجوائے کر رہے ہوتے یہاں بھرپور سردیاں ہو چکی تھیں۔ شام ہوتے ہی برقی دھند ہر طرف چھا جاتی اور وہ بیٹھ جاتے کمرہ گرم کیے مری کے پاس بیٹھی کھڑکی سے ان کمرزہ شاموں کو اپنے اندر اتارتی رہتی۔

دن ایک ایک کر کے گزرتے جا رہے تھے وہ سنی ٹوریم کے ماحول کی عادی ہو گئی تھی۔ تین چار ماہ تو ہو چلے تھے انہیں یہاں آئے ہوئے لمبے لمبے ٹھنڈے کاریڈور میں سے بے آواز قدموں سے آتی جاتی نرسیں ان کے سفید برقی یونیفارم، ایک ہی لہجے، ایک ہی نون میں ہر مریض کو محبت سے ٹیٹ کرتی ہوئی تقریباً ”سب کی سب اس کی واقف بن گئی تھیں۔ ان میں زیادہ تر کرپین تھیں۔ گلے میں صلیب لٹکائے ان نرسوں کو اپنے پیشے سے عشق تھا اور وہ ان کے اس بچے جذبہ خدمت سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔

وہ سمبر کا اینڈ تھا جب شام کے وقت کتنے دنوں سے چھائے بادلوں سے یکایک برف روئی کے گالوں کی طرح برسنے لگی یہ اس کی زندگی کا حیران کن منظر تھا۔ وہ باہر آمدے کے ستون سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ سفید اور دوہیا برف کو ہاتھ بڑھا کر — چھونے لگی۔

”فضہ اندر چلی جاؤ سردی ہے۔ تم نے بہت گرم کپڑے بھی نہیں پہن رکھے اور تمہاری مری بھی تمہیں بلاری ہیں۔“ سسٹرمار تھامیڈیس کاٹھے اٹھائے اس کے قریب آکر بولی تو وہ سر ہلا کر اندر چلی آئی۔

”فضہ مجھے چیئر پر بٹھاؤ۔“ مری اسے دیکھتے ہی بولیں تو اس نے چیئر ان کے بیڈ کے قریب کی اور انہیں سہارا دے کراٹھایا۔

”چیئر کو کھڑکی کے پاس لے چلو۔“ چیئر پر بیٹھ کر وہ بولیں تو وہ چیئر کو دھکیل کر کھڑکی کے پاس لے آئی۔ ان کی طبیعت آج کافی بہتر تھی۔

”میں اچھی ہوتی تو تمہیں سارا مری گھماتی، ہم مال روڈ پر جاتے مال روڈ مری کی جان ہے۔ پھر تم دیکھتیں کہ وہاں زندگی کتنے مزے سے رواں دواں ہوتی ہے۔ اس موسم میں ہی تو مال روڈ انجوائے کرتے ہیں۔ بھانت بھانت کے لوگ جن کو تکتے ہوئے انسان خود کو بھول جاتا ہے، میں جب نرس کے پیپا کے ساتھ مری آتی تو ہم دونوں بہت انجوائے کیا کرتے تھے۔ سارا دن ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر مال روڈ پر گھومتے یہاں ہمارا اپنا کام تھا جو نرس نے وہ سال پہلے فروخت کر دیا۔ اسے مری پسند نہیں اس نے میرا بھی خیال نہ کیا۔“ وہ کھانسنے لگیں اب ان کے سینے سے

کھانسی کی جگہ ”ہوں ہوں ہوں ہوں“ کی آوازیں نکلتی تھیں۔ ”مال روڈ پر شاپنگ بہت مہنگی ہوتی ہے لیکن میں تمہیں ضرور کرواتی تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔ خدا تمہیں اس کا صلہ دے گا میں اگر کچھ دنوں میں اچھی ہو گئی تو تمہیں مال روڈ پنڈی پوائنٹ، گھوڑا گلی سب جگہوں پر لے کر جاؤں گی۔ تم بہت انجوائے کرو گی۔“ ان کی آنکھوں میں زندگی کی چمک دوڑنے لگی تھی۔

”میری! میری تو رات دن دعا ہے اللہ آپ کو میری بھی عمر لگا دے۔ آپ جلدی۔ اچھی ہو جائیں، میرا آپ کے سوا اور ہے ہی کون۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”نہ میری سسٹھی بیٹی! تم اپنی عمر جو بلکہ میری بھی باقی کی عمر تمہیں لگ جائے۔ میں تو اپنا حصہ بنا چکی۔ سب زندگی کے مزے لوٹ چکی، اب تو خدا سے دعا ہے وہ جلد سے جلد مجھے اپنے پاس بلا لے۔ پتا نہیں کیوں اتنی دیر ہو رہی ہے۔“ وہ جیسے کھوسی گئیں۔

”پلیز مری! ایسا نہ کہیں۔“ وہ خوفزدہ ہو گئی۔

”بے وقوف! ہر کسی کا سہارا اللہ ہوتا ہے۔ تمہارے والدین اٹھ گئے تم زندہ رہیں نا، میں چلی جاؤں گی تو بھی وہ تو ہے نا۔ فضا وہ ہماری ضرورتوں سے، ہم سے زیادہ آگاہ ہوتا ہے، ہم تو سب کچھ انجانے میں ہی کرتے رہتے ہیں ہوتا تو وہی ہے جو اسے پسند ہوتا ہے پھر غم کرنے کا فائدہ؟“

”میری! آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہے نا؟“ وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔

”ہاں بہت بہتر ہوں! اسی لیے تو کہتی ہوں، یہاں تو اتنی نرسیں ہیں میری دیکھ بھال کرنے والی، تم اب پڑھ لیا کرو۔ چند ماہ بعد تمہارے امتحان ہونے والے ہیں بیٹا! یہ امتحان بہت ضروری ہیں۔ اللہ تمہیں اس میں کامیاب کرے فضا میرے بچے! مجھ سے وعدہ کرو۔“ وہ سفید ہڈیوں والا بوڑھا ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر بولیں۔

”جی مری! اس نے ان کا بیٹھنڈا کمزور ہاتھ تھام لیا۔

”میں رہوں یا نہ رہوں، تم یہ امتحان ضرور دو گی۔ پوری ہمت کر کے پوری بہادری سے۔“ مری کو ایک دم سے کھانسی شروع ہو گئی۔

”آئی پراس مری! آپ ٹھیک ہیں نا۔“ وہ ان کی کھانسی سے گھبرا گئی۔

”ہاں ٹھیک ہوں، مجھے لٹاؤ۔“ ان کی کھانسی تیز ہو گئی تھی وہ چیئر گھسیٹ کر بیڈ کے پاس لائی اور بڑی مشکل سے انہیں سہارا دے کر بیڈ پر لٹایا۔ ان کے کمزور وجود کا وزن نہ ہونے کے برابر ہو چکا تھا۔

”لیٹنے سے ان کی کھانسی اور شدید ہو گئی وہ نرس کو بلانے دوڑی۔

رات تک ان کی طبیعت خاصی بگڑ گئی فضا کے ساتھ سسٹرمار تھا اور ڈاکٹر یوسف ساری رات لگے رہے باہر برف پڑتی رہی اندر مری کی جنگ زندگی اور موت سے شدید ہوتی گئی۔

سسٹرمار تھا کو مری سے زیادہ اس سے ہمدردی تھی۔

”تم اتنی چھوٹی بچی ہو اور یہ اتنی بوڑھی پھر یہ تمہاری مری کیسے ہوئیں؟“ ان کے یہاں آنے کے تیسرے دن وہ تعجب سے پوچھ رہی تھیں۔

”یہ مری اس لیے ہیں کہ یہ میری مری ہیں اور میں ان کی بیٹی۔ خون کے رشتوں سے کیا ہوتا ہے۔ سسٹرا اصل رشتہ و محبت اور احساس کا ہوتا ہے نا۔“

اتنی ہی عمر میں ہی اسے اس فرق کا پتا چل گیا تھا جس کا علم لوگوں کو عمریں گزارنے کے بعد بھی نہیں ہوتا۔

”لیس یو آر رائٹ لٹل گرل“ آئی ایڈما بھر پور ہیشن (مجھے تمہارا جذبہ پسند آیا) ”وہ اس کے جذبے کو سراہتیں۔“



اور اس رات کی صبح تو لگتا تھا جیسے ہونی ہی نہیں۔ اتنی طویل رات دو تین بار تو کھانسی کی شدت میں ممی کا سانس ہی کہیں گم ہو گیا تین بجے تو وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

”ممی! ممی! خدا کے لیے نہ جائیں، ممی! میرا آپ کے سوا اور کون ہے۔ اے خدا رحم کرو سری بار موت کا یہ بھیا تک روپ مجھے مت دکھا۔ میں مر جاؤں گی۔ میں گدھر جاؤں گی۔ ممی! نہ جائیں۔ ممی! پلین ممی! آپ کی چیز کہاں جائے گی۔“ وہ روتے روتے چیختی لگی۔

مارتھانے اسے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لا بٹھایا۔

”یہ لوپانی پو اور گاؤ سے دعا کرو، وہ بچوں کی دعا ضرور سنتا ہے۔ وہ تمہاری ممی نئی صبح کے ساتھ تمہیں گفٹ کر دے گا اگر تم سچے دل سے دعا مانگو گی۔ اب رونا نہیں ورنہ تمہاری ممی کا تکلیف بڑھ جائے گا۔“ وہ پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں دے کر باہر نکل گئی۔

”مجھے وضو کر کے نماز پڑھنی چاہیے پھر دعا مانگنی چاہیے۔“ اس کے دل نے راہ بھائی۔ اس نے اٹھ کر وضو کیا اور دو نفل نماز پڑھ کر سجدے میں گر کر گڑا کر خدا سے دعا مانگنے لگی مسجدے میں گرے شاید اسے آدھا گھنٹہ ہو چلا تھا۔

جب کسی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا۔ آنسوؤں کی دبیز چادر آنکھوں کے آگے تنی تھی اس نے بمشکل دیکھا وہ مارتھا تھی ستا ہوا چہرہ لیے۔

”چھوٹی معصوم لڑکی نہ روؤ، خدا مہربان اور رحم کرنے والا ہے اس نے تمہاری دعا سن لی ہے،“ اس کی بات پر اس کے سسے ہوئے دل نے سکھ کا سانس لیا۔

”کہاں ہیں ممی؟ وہ ٹھیک ہیں نا؟“ وہ بے قراری سے دروازے کی طرف بڑھی۔

”Feza! she is expire“ (فضہ وہ مر چکی ہیں) سسٹر مارتھا کی عقب سے آتی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے وہ مڑ کر بے یقینی سے دیکھنے لگی۔

”ہاں ٹھیک گرل! خدا نے تمہاری سن لی۔ دیکھا تھا تم نے وہ کتنی تکلیف میں تھیں۔ اب ان کو تکلیف سے رہائی مل گئی ہے۔ اتنے لمبے ٹارچر کے بعد تم نے ان کی بہتری کی ان کے اچھے ہونے کی دعا مانگی تھی نا تو وہ دعا قبول ہو گئی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔“

وہ اسے سینے سے لگائے ہوئے ہوئے تھک رہی تھیں اور وہ چیخیں سننے میں دبائے گم صم ان سے چٹنی کھڑی تھی۔ جس بات کا ڈر تھا وہ ہو گئی۔ ساری شام ممی کی گفتگو کتنی فریش، لٹنی اچھی تھی۔ اس کا دل خوا مخواہ خوش امید ہو چلا تھا کہ اب ممی بالکل ٹھیک ہو گئی ہیں۔

”فضہ! جب چراغ بجھنے لگتا ہے نا تو وہ ایک بار ضرور بھڑک کر جلتا ہے With its full strength (اپنی پوری طاقت کے ساتھ) یونو اسی لیے شام کو ان کی طبیعت اس قدر فریش تھی اسی لیے وہ تم سے اتنی باتیں کر رہی تھیں مجھے شام کو ہی شک ہو چلا تھا۔ ان کی آواز میں کھنک تھی جیسے کالج کے نکلے آپس میں ٹکراتے ہیں میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی لیکن پھر سوچا چند گھنٹوں کی خوشی ہے سمیٹ لو۔“ وہ کہہ رہی تھی اور فضہ کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

”اب کیا ہو گا۔“ ممی نے وجود سے منسلک یہ سوال اس کے آنکھوں کے آگے ناچنے لگا تھا۔ نرگس آنٹی اسے برداشت کر لیں گی۔؟ دو سرائے کاٹوں بھر سوال۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ سسٹر مارتھا کی بانہوں میں جھول گئی۔

UrduPhoto.com

وہ شام کی چائے بنانے جا رہی تھی جب ابراہان بھائی شاپرڈ کے ساتھ لدے پھندے کچن میں داخل ہوئے۔

”ممی! یہ سامان ذرا چائے کے ساتھ ٹرائی میں رکھ دینا۔“ انہوں نے لفافے کاؤنٹر پر رکھے۔

”کوئی دوست آیا ہے آپ کا؟“ اس نے قبوے کی آنچ بلیک کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں دوست ہی سمجھو بہت قریبی۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولے۔

”چائے ڈرائنگ روم میں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں وہیں بلکہ تم ہی لے آنا۔“ وہ جاتے جاتے بولے۔

”میں۔۔۔!“ وہ سوالیہ انداز میں بولی ”تائی جی کا پتا ہے نا آپ کو۔“

”اوہو بھئی، کچھ نہیں ہوتا۔ میری کو لیگ ہے آفس کی، تم ذرا جلدی کرو۔ اور یہ امی کہاں ہیں؟“ وہ جاتے جاتے

بلنے۔

”وہ اپنے کمرے میں ہی ہوں گی۔“ وہ لفافے کھولنے لگی۔

”اچھا جلدی کرنا ذرا۔“ وہ اسے تاکید کر کے باہر نکل گئے۔

جب چائے کی ٹرائی سجا کر وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہاں مکمل خاموشی تھی۔ ابراہان بھائی تائی جی کے سامنے والے صوفے پر سر جھکائے بیٹھے تھے اور سفید کاٹن کا کڑھائی والا سوٹ پہنے ایمین کی ہم عمر لڑکی ہو گئی یا اس سے کچھ بڑی سلیقے سے دوپٹہ سر پہنے۔ سر جھکائے وہ اپنے ہاتھوں سے الجھ رہی تھی۔ اس کا میک اپ بالکل نیچل تھا یا شاید کیا ہی نہیں ہوا تھا۔ ٹرائی کی کھڑ پٹر اس نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں باوامی تھیں۔ تائی جی کڑی نظروں سے اسے جانچ رہی تھیں۔ سلسلہ کچھ ایمین کی سمجھ میں آ رہا تھا اس نے خاموشی سے پلیٹیں ٹیبل پر سجا دیں۔

”چائے بناؤں ابراہان بھائی؟“ اس نے سنجیدہ سے بیٹھے ابراہان بھائی سے پوچھا۔

”ہاں بناؤ۔“

”لڑکی کیا نام بتایا تم نے اپنا؟“ تائی جی اکھڑ لیچے میں بولیں۔

”حننا۔ حنا اقبال!“ اس کی آواز بچوں جیسی تھی اسے بے ساختہ فضہ یاد آنے لگی۔

”ابا کیا کرتے ہیں تمہارے؟“ تائی جی کا سوال اور لہجہ دونوں ہی لٹھ مارتھے۔

”جی وہ فوت ہو چکے ہیں میرے بچپن میں۔۔۔“ وہ یوں بولی جیسے چیزیا چوں چوں کرتی ہے۔ ایمین کے ہاتھ چینی گھول

رہے تھے اور آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔

”کتنے بسن بھائی ہو؟“ لہجہ مزید ہزار ہو چکا تھا۔

”جی دو بہنیں ہیں۔“ چیزیا بولی۔

”ماں ہے؟“ بڑا لٹھ مار لہجہ تھا۔

”جی۔۔۔ وہ اسکول ٹیچر ہیں۔“ چیزیا کالہجہ اقبالی تھا۔

”ایمن! پیالیاں پکڑا کر چائے کی تم ہنڈیا چڑھاؤ چولے پر جا کر تمہارے تیا آتے ہوں گے۔ مجھے بھی ذرا کام

ہے۔ میری چائے کمرے میں لے جاؤ۔“

تائی جی نے ہاتھ اٹھا کر میچ ختم ہونے کا اعلان کر دیا اور صوفے سے اٹھ کر بیڑاری سے باہر چل دیں۔ چیزیا کی آنکھوں

میں شبنم اتر آئی۔ ابراہان بھائی نے بے چارگی سے تائی جی کو اور پھر حنا کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ ایمین دونوں کے آگے

چائے رکھ کر باہر نکل آئی۔

رات کو جب وہ تیا جی اور تائی جی کا دودھ لے کر ان کے کمرے کی طرف گئی وہاں بحثا بحثی ہو رہی تھی۔ کچھ



انسانی تجسس، کچھ شام کے واقعہ کا اثر دروازے کے باہر ہی رک گئی۔  
 ”جب وہ راضی ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔“ تایا جی متحمل لہجے میں بولے۔  
 ”ناوہ کے میں کنوئیں میں چھلانگ لگاؤں گا تو لگانے دوں اسے ہم مرگے ہیں اسے برا بھلا بتانے والے۔“ تائی جی گرجیں۔

”آخر جوان ہے، خود مختار ہے پھر اس عمر میں یونہی ہوتا ہے۔“  
 ”انوکھا جوان ہوا ہے اور کون کرتا ہے اس عمر میں ایسا ہم نے بھی عمریں گزاری ہیں۔ ماں باپ کی مرضی پہلے بعد میں کچھ اور۔“ وہ کڑک کر بولیں۔  
 ”ضد میں آیا ہوا ہے، نہیں مانے گا۔ تم کچھ لچک پیدا کرو۔“ تایا جی صلح جو انداز میں بولے۔  
 ”ارے دفتر میں کام کرتی ہے، ماں اسکول میں کیا ایسی پرکٹی رہ گئی ہیں میرے بچے کے لیے۔ وہ تو نا سمجھ ہے ضد کرے گا ہی، ہم تو نا سمجھ نہیں۔ بچہ انگارہ پکڑنا چاہے تو کیا اس کی ضد سے ڈر کر اسے انگارہ پکڑا دیتے ہیں ماں باپ آپ بھی حد کرتے ہیں۔“

”تو پھر کیا کرو گی لڑکی اس سے۔“ تایا جی زچ ہو کر بولے۔  
 ”لڑنے کی کیا ضرورت ہے، مجھے کیا پتا تھا وہ یہ نمونہ گھراٹھالائے گا۔ میں تو خود آج کل میں کچھ کرنے والی تھی۔ اچھا ہوا اس نے خود پہل کر دی اس کی توجہ دوسری طرف لگاؤں گی تو خود ہی بھول جائے گا سب کچھ۔“ اب کے لہجہ مدھم تھا۔

”کیا مطلب؟“ تایا جی الجھ کر بولے۔  
 ”متکلفی وغیرہ نہیں، بس دو چار ماہ میں شادی کر دیتے ہیں۔ سب کچھ بھول بھال جائے گا۔ یہ عشق محبت کا بھوت سر سے اتر جائے گا۔“  
 ”دیکھ لو، معاملہ بگڑ نہ جائے۔“ تایا جی تشویش سے بولے۔

”نہیں بگڑتا مجھے پتا ہے ایسے معاملوں کو ایسے ہی سنبھالا دیتے ہیں۔“  
 ”اتنی جلدی لڑکی کہاں سے ڈھونڈو گی۔“ تایا جی پریشان ہو گئے تھے۔  
 ”لڑکی تو گھر میں موجود ہے۔“ تائی جی کی بات پر اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے لرزی۔  
 ”گھر میں۔۔۔؟“ تایا جی سوالیہ انداز میں بولے۔ ”تمہارا مطلب ہے ایمن، ٹھیک ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولے۔  
 ”بلاغ تو نہیں خراب ہو گیا آپ کا۔ میرے بچے کے لیے زمانے بھر کی یتیم و بوسیر ہی رہ گئی ہیں، پہلے وہ اسکول ٹیچر کی کنگلی بیٹی اور اب یہ ایمن، ساری زندگی ہماری روٹیاں کھانے والی۔ اب اسے اٹھا کر اپنے سر پر بٹھالوں۔ اتنی مت ماری گئی ہے میری۔“ ایمن کا جی چاہا کہ ٹرے اٹھا کر دروازے پر دے مارے۔  
 ”تو پھر۔۔۔؟“

”میں درنا بابت کی بات کر رہی ہوں۔ کفیل بھائی کی بیٹی، لاکھوں کی جائیداد کی اکلوتی وارث۔ میرے بیٹے کے تو نصیب جاگ انھیں گے۔“  
 ”اس کا خیر اٹھا لو گی تم وہ ناک پر لکھی نہیں بیٹھے دیتی۔ ہم جیسوں کو تو ویسے ہی کٹرے مکوڑے سمجھتی ہے وہ۔“  
 ”بلاغ خراب ہو گیا ہے تمہارا بیٹھے بٹھائے نیا شو شا۔“ تایا جی بلند آواز میں بولے۔  
 ”لاکھوں کی جائیداد کی اکلوتی وارث اتنا مخروہ ہو گا نا۔“ تین تین نوکر اس کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں، یہ تو ایک الگ بات ہے ویسے مزاج کی اچھی ہے، مجھے معلوم ہے نا۔ جاؤں تو بڑی عزت کرتی ہے۔ منہ سوکھتا ہے اس کا پچھو۔“

پچھو کرتے۔“  
 ”منہ تو پہلے ہی سوکھا ہوا ہے اس کا، لگتا ہی نہیں لاکھوں کی وارث ہے۔ جسامت سے لگتا ہے کسی یتیم خانے سے آئی ہے۔“ تایا جی بڑبڑائے۔

”خبردار یتیم خانے جائیں اس کے دشمن، کتنے یتیم خانے تو اس کے باپ کی خیرات سے چلتے ہیں۔“  
 ”مان جائیں گے وہ تمہارے سات آٹھ ہزار تنخواہ دار بیٹے کے لیے۔“ تایا جی طنز سے بولے۔  
 ”خود مجھ سے کفیل نے اشاروں کنایوں میں کئی بار کہا ہے، میں ہی نظر انداز کر رہی تھی کہ ابرار کو نوکری مل جائے۔ حالانکہ اسے نوکری کی کیا ضرورت ہے خیر اب میں دو چار دنوں میں جا کر بات کر لوں گی۔ مجھے پتا ہے فوراً ہاں کر دیں گے پھر دیکھیے گا ہمارے کیسے دن پھرتے ہیں۔“ تائی جی کے لہجے میں امیدیں انگڑائیاں لینے لگیں۔  
 ”ہاں لگتا ہے واقعی اب تو دن پھر جائیں گے۔ اپنی من مانی کر رہی ہو، کل کو کسی کو آزار نہ دینا۔“ تایا جی نے وارننگ دی۔

”میں کچھ غلط نہیں کر رہی اپنے بچے کی بھلائی کر رہی ہوں اور میں کیوں کسی کو الزام دوں گی۔ مجھے پتا ہے سب اچھا ہی ہو گا۔“ وہ شاید اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ”یہ ایمن کہاں مر گئی؟ دودھ لینے گئی تھی میں دیکھتی ہوں۔“  
 دودھ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ایمن پن کی طرف مڑ گئی۔

♥ ♥ ♥ ♥  
 نرس آنی اگلے روز ایک بجے کے قریب پہنچی تھیں۔ ڈیڈ باڈی کو دیکھنے سے لے کر اس کی وصولی تک ان کا رویہ بے حد نارمل سا تھا، جیسے یہ سارا واقعہ ان کے بزنس کنسرز کا کوئی حصہ تھا اور وہ اسے بڑے فارمل طریقے سے ڈیل کر رہی تھیں۔ سارے واجبات و حیابات کلنر کر کے وہ اپنی گاڑی میں جا بیٹھیں۔ وہ اپنے ساتھ ایمو لینس ہائر کر کے لائی تھیں۔ ایمو لینس آگے تھی اور ان کی گاڑی پیچھے پیچھے۔

دونوں گاڑیوں کے ماحول میں کچھ زیادہ فرق نہیں لگ رہا تھا۔ ایک میں مردہ وجود موجود تھا، دوسری گاڑی میں بیٹھے افراد کا رویہ مردوں جیسا تھا بے حس اور ڈل سا، نرس آنی مسلسل سامنے وندنا سکرین سے باہر دیکھ رہی تھیں پہلے انہوں نے فضا کو مٹی کے ساتھ ایمو لینس میں بٹھایا تھا، وہاں ہاسپٹل کا ایک بندہ جی بیٹھا تھا سفید چادر میں لپٹا مٹی کا بے حس، بے جان جسم، وہ جب بھی تھوڑی دیر بعد چور نگاہ سے اس سفید ابھرے ہوئے وجود کو دیکھتی تھی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ جاتی، مری کی سڑکوں کی پتھر در پتھر اترائی آسمان سے باتیں کرتے اونچے سرفنک پہاڑ اور درخت جنہوں نے آتے وقت اس قدر Fascinate (مستور) کیا تھا اب ماحول کو اور بھی پراسرار بنا رہے تھے۔ رات کی برفباری کی وجہ سے درختوں کے سبز پتوں پر کہیں کہیں برف کی پتلی سی کانچ جیسی تہہ جمی ہوئی تھی۔ صبح سے موسم کچھ نارمل ہو گیا تھا۔ صبح چار بجے کے قریب برفباری رک گئی تھی اب صرف کبریٰ کمر تھا۔ اتنی شدید سرد دھند تھی کہ اس میں چھپے بادل بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میلا سا اندھیرا سب طرف پھیلا ہوا تھا صبح کی ٹریفک سے سڑکوں کی برف کافی حد تک پھل گئی تھی جب کہ کناروں پر ابھی بھی برف انٹھی تھی جیسے اونچی سڑک گہری اترائی کی طرف جاتی اس کا دل بھی جیسے نیچے نیچے جانے لگتا تھا۔ ڈرائیور کی مشاقی تھی جو اتنے خمدار راستوں پر بڑی سبک روی سے گاڑی دوڑا رہا تھا۔

تین بجے کا نام تھا، لگتا تھا جیسے تھوڑی ہی دیر میں گہری شام ہو جائے گی۔ اندھیرے میں رستہ کیسے نظر آئے گا۔ اسے خوف نے اکھیرا اور اگر کوئی موڑ بہت اچانک آگیا، کہیں گہری کھائی آگئی، ڈرائیور کو اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دیا تو؟“ اسے جھرجھری سی آگئی ”مٹی کو تو سفید چادر مل گئی ہے کفن کی صورت میں تو ایسے ہی۔“ اسے



جھرجھری سی آگئی۔ ”نہیں اللہ میری توبہ۔ اللہ میاں جی بھیک ہے مجھے مئی سے بے حد بیمار تھا، لیکن اس طرح مرنا منظور نہیں۔“ اس نے دل ہی دل میں اللہ سے دعا کی۔ ”کاش عاکف چچا مجھے اپنے ساتھ بٹھالیتے۔ انہیں میرا خیال کیوں نہیں آیا۔ انہوں نے بھی نرس آنٹی کی طرح مئی کی موت پر ایک آنسو نہیں بہایا جب نرس آنٹی کو دکھ نہیں ہوا تو عاکف چچا کو کیوں ہونے لگا۔ وہ تو آنٹی کے اشاروں پر چلتے پھرتے ہیں۔“

وہ کھڑکی سے باہر افسردگی سے دیکھ رہی تھی۔ فضا میں مئی کی وجہ سے باہر کے شیشے بار بار دھندلا رہے تھے اندر کی فضا گرم تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر رہا تھا جس کی وجہ سے باہر کی ٹھنڈک اندر اتنی اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ پھر شاید خدا نے اس کی سن لی۔ عاکف چچا نے یا شاید نرس آنٹی نے اسے دونوں گاڑیاں رکوا کر اپنے ساتھ پچھلی سیٹ پر بٹھالیا۔ اسے کچھ خوشی تو ہوئی لیکن ساتھ ہی مئی سے دائمی جدائی کے جان لیوا اور احساس نے گھیر لیا اس گاڑی کا ماحول تو ایسا بولینس سے بھی زیادہ سرد اور بے حس تھا۔

”فضہ! کچھ کھا تو تم۔ وہ پیچھے ہاٹ پاٹ میں سینڈویچ پڑے ہیں وہ لے لو۔“ کچھ دیر بعد عاکف چچا نے مڑ کر اسے کہا تو اسے معلوم ہوا کہ اس گاڑی اور ایسا بولینس میں ایک نمایاں فرق تو یہ ہے کہ مردے کھاتے کچھ نہیں اور زندہ لوگ کھائے بغیر رہ نہیں سکتے۔ چاہے ان کے سامنے مردہ وجود پڑا ہو یا وہ اگلی گاڑی میں جا رہا ہو۔ اب اس نے غور سے دیکھا کہ نرس آنٹی اور عاکف چچا کافی کے ڈس پوزا بیل گلاس ہونٹوں سے لگائے بیٹھے تھے وہ دونوں بچ کر چکے تھے۔ شاید اسی لیے انہیں اس کا خیال آگیا تھا۔

”کھا لو نالے کر۔ ابھی تو سفر کافی لمبا ہے۔“ اسے اسی طرح بیٹھے دیکھ کر عاکف چچا نے پھر مڑ کر کہا۔ ”چچا جان! مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے تو رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پھر بھی اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا معدہ بھرا ہوا ہے۔ کبھی کبھی معدے کے لیے غم سے بڑی خوراک کوئی نہیں ہوتی۔ یہ ہر بھوک کو منادیتی ہے وقتی طور پر ہی سہی۔

”کھا لو پھر رات تک کچھ نہیں ملے گا۔ صبح سے بھی تم نے کچھ نہیں کھایا۔“ چچا جان کو بہت مدت کے بعد اس سے ہمدردی حنائے کا خیال آیا تھا۔ ”سن نہیں رہی ہو۔ اتنا دکھاؤ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تمہارے اس ڈرامے سے میری ماں واپس آجائے گی۔ اس طرح کی ہر بار منس مجھے متاثر نہیں کرے گی۔ کھا لو ورنہ تمہارے چچا کو چین نہیں آئے گا۔“

نرس آنٹی نے کافی کا گلاس ہاتھ میں پکڑ کر بڑے حقارت بھرے لہجے میں کہا تو اس نے فوراً ”میکا کی انداز میں مڑ کر ہاٹ پاٹ اٹھالیا اور اس میں سے ایک سینڈویچ اٹھا کر ہاٹ پاٹ واپس رکھ دیا۔ ”پتا نہیں اب کیا ہو گا۔ نرس آنٹی مجھے رکھ لیں گی۔“ پہلے لقمے کے ساتھ ہی یہ تلخ سوال پھر اس کے ذہن میں ابھرا ”اس نے کن اکھیوں سے بیزار سی کافی پیتی نرس آنٹی کو دیکھا۔

”بہت مشکل ہے۔“ اس کے دل نے جواب دیا۔ ”چلو اچھا ہے شاید اسی طرح یہ مجھے آپنی کے پاس بھیج دیں۔ اللہ کرے۔“ اس کے دماغ نے فوراً اسے ایک خوش کن دعا کا راستہ دکھایا۔

باقی کا رستہ اس نے ہی دعا مانگتے گزارا۔ جب وہ گھر پہنچی تو کوٹھی کے کشادہ لان میں بہت سے لوگ اکٹھے ہو چکے تھے رات کے شاید آٹھ بج رہے تھے۔ سوئڈن بزنس مین میت کے انتظار میں بے چین بیٹھے تھے۔ مئی کو جاتے ہی نہلانے کے لیے لے گئے اور ساڑھے نو بجے جنازہ اٹھالیا گیا۔

اگلے دن شام کو قفل کر لیے گئے اور رات تک گھر کی فضا کو سوگوار ماحول سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کو اب عاکف چچا سے ملنا ہو گا۔ کیونکہ نرس آنٹی کو تواب فرصت نہیں ہوگی۔ وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے

میں چلی گئی تھیں۔ دونوں کی اس مشقت نے انہیں بے حد تھکا دیا تھا۔ اب وہ مکمل آرام کریں گی کوئی انہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا سب کو کہہ دیا گیا۔

وہ بھی چپکے سے اٹھ کر انیکسی کی طرف آگئی۔ انیکسی کا دروازہ بند تھا اس نے اندر کی طرف دھکیلا شاید اندر سے لاکھڑا ہو پریشانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی رات کے آٹھ بج رہے تھے سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کا جسم اور ذہن دونوں سکون مانگ رہے تھے اتنے دنوں کی ذہنی ٹینشن نے اسے تھکا دیا تھا۔

”اب کیا کروں واپس اندر جاؤں۔“ دروازہ لاکھ دیکھ کر اس نے سوچا۔ ”اندر کہاں سوؤں گی۔“ عبدل چوکیدار سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ نرس آنٹی کا سب سے پرانا ملازم تھا۔ وہ سڑک کی طرف آکر عبدل کو بلانے کا سوچ رہی تھی وہ خود ہی اسے دیکھ کر آگیا۔

”عبدل چاچا! یہ دروازہ نہیں کھل رہا۔ کیا لاکھ ہے۔ مجھے سونا تھا۔“

”بی بی! آپ کا سامان تو وہ جو سرونٹ کواریٹز کے ساتھ کواریٹنا ہے۔ نیا والا۔ اس میں پڑا ہے۔ بیگم صاحب نے آپ کے جانے کے بعد آپ کا سامان ادھر رکھوا دیا تھا۔ انیکسی میں ان کے مہمان آکر ٹھہرے تھے۔ اس کواریٹز کی چابی یہ ہے آپ ادھر چلی جائیں۔“ اس نے جیب سے چابی نکال کر اس کی طرف بڑھائی اسے وہاں کھڑے ہونا دشوار ہو گیا۔

”میں اور سرونٹ کواریٹز میں؟“ اس کا دل جیسے مان نہیں رہا تھا۔

”مئی کو دی گئی سہولتیں ان کے ساتھ ہی کل رات دفن کر دی گئی ہیں۔ اب تمہارا مقام یہاں سرونٹ کواریٹز کے علاوہ اور کہاں ہو سکتا ہے۔“ اس کا دل ہنسا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر چابی لے لی اور واپس مڑ گئی۔

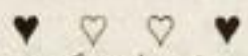
”اور بی بی! بیگم صاحب نے کہا تھا کہ کل صبح سے آپ کچن کے کام کروائیں گی، حمید اور شریفان کے ساتھ۔ خاص طور پر صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا وغیرہ۔ صاحب صبح سات بجے ناشتہ کرتے ہیں اور بیگم صاحب سات بجے جوس پیتی ہیں۔ آٹھ بجے ناشتہ کرتی ہیں۔ آپ جوس دینے جائیں تو ان سے ناشتے کا پوچھ لیں کہ وہ کیا لیں گی۔“ اس نے پیچھے سے اسے نیا حکم نامہ سنایا تو اس کا میٹر گھومنے لگا۔

”میں کوئی ملازمہ ہوں ان کی جوان کے لیے جوس اور ناشتے لے کر جاؤں۔“ وہ کھول کر رہ گئی۔

”مجھے کچن کا کام نہیں آتا۔ آپ آنٹی سے کہہ دیں۔“ اس کے ذہن نے بروقت جواب تیار کر کے ارسال کیا۔

”مجھے نہیں پتا جی۔ انہوں نے کہہ دیا تھا اور اب تو وہ سونے کے لیے چلی گئی ہیں۔ صبح آپ خود ہی کہہ دیجئے گا۔“ وہ بے رخی سے جواب دے کر واپس چوکیدار کی طرف مڑ گیا۔

وہ بے بسی سے اسے جاتے دیکھنے لگی اسے پتا تھا کہ وہ نرس آنٹی سے کسی بھی قسم کا جواب تو کیا سوال بھی نہیں کر سکتی۔ اس نے سر اٹھا کر تاروں بھرے آسمان کو ایک نظر دیکھا ”فطرت ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ چاہے کوئی جئے چاہے کوئی مرے چاہے کوئی مرمے کے جئے تارے چمکتے رہیں گے، پھول کھلتے رہیں گے، ہوا میں چلتی رہیں گی، پادل پرستے رہیں گے اور یہ سب مصروف عمل مظاہر فطرت انسان کی بے بسی و بے کسی کا مذاق اڑاتے رہیں گے کہ دیکھو تم پر حالات کا اثر ہو سکتا ہے ہم پر تو نہیں ہوتا۔ بابا۔ بابا۔“ وہ تھکے تھکے قدموں سے کواریٹز کی طرف چل دی۔



پھر گھر میں جیسے ایک محاذ کھل گیا اب رات بھائی حنا کے لیے اڑ گئے اور تائی جی درنایاب کے لیے۔ تائی جی اس مسئلے پر یوں چپ تھے جیسے ان کا اس سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور ولید تھالی کا بیٹن بننا ہوا تھا تائی جی کے گھٹنے کے ساتھ لگ کر



بیٹھتا تو ان کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ ان کے فیصلے کو دور اندیشی اور ابرار بھائی کے بہتر مستقبل کا ضامن قرار دیتا اور تائی جی کو تو یہی صدمہ کم نہیں تھا کہ ابرار سے انہیں یہ توقع نہ تھی۔

”اتنا فرماں بردار اتنا سعادت مند بچہ میرا۔ میں رات کو دن کہوں تو وہ دن کہنے والا اب زندگی میں پہلی بار اتنی ضد پکڑی ہے اس نے بلکہ اڑ گیا ہے۔ نامعلوم اس جادو گرنی نے کیا جادو کیا ہے میرے بچے پر نہ میری سنتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ مجھے ابرار سے کم از کم یہ توقع نہ تھی کہ وہ مجھ سے مقابلے بازی کرے گا۔“ تائی جی جیسے ہاتھ ملے جاتیں۔

”آپ کو ابرار بھائی سے توقع نہیں تھی۔ مجھ سے تو ہے نا؟“ وہ فوراً ان کی بات پکڑ لیتا۔

”میں کھال نہ کھینچ لوں گی تمہاری جو میرے حکم سے ذرا ادھر ادھر چلے تم ابرار تو میرے کسے کا مان رکھتا تھا تم تو بن کے میری بات کو سمجھتے ہو۔ تمہارا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ اس کے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ چھوڑتیں۔

”امی جان! وہ خلیل جبران نے کہا ہے کہ تمہارے بچے تمہارے نہیں، وہ کماتوں سے نکلے ہوئے تیر ہیں۔ تم انہیں جنم تو دے سکتے ہو ان کے خیالات پر قادر نہیں ہو سکتے۔“ وہ انہیں سمجھانا شروع کر دیتا۔

”کون منخوس ہے یہ خلیل جبران جو ایسے ناہنجار خیالات لوگوں میں پھیلاتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز اپنی جگہ ماں باپ کی اور ان کے فیصلوں کی اہمیت اپنی جگہ۔ نا فرمانوں کے لیے نہ اس دنیا میں سکون ہے نہ اس دنیا میں۔ یہی کچھ پڑھتے ہو تم کالج کتابوں میں۔ ذرا سر نکالو تو ماں باپ سے ہی منہ ماری کرنے لگو۔“

تائی جی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے دونوں بیٹوں کے دل و دماغ سے اپنی اہمیت کے سوا ہر خیال کو کھرچ ڈالیں۔

”امی جان! ماں باپ کی اہمیت اپنی جگہ، مگر مرضی اور پسند اور پھر پسند کی خوشی اس سے بڑھ کر تو کچھ نہیں تا۔“ وہ ان کے کندھے دبائے لگتا۔

”ماں باپ تمہاری پسند سے خوش نہ ہوں تو کیا تمہیں چین آجائے گا خوشی مل جائے گی۔“ تائی جی اس کے دونوں ہاتھ پرے جھٹکتیں۔

”ہاں۔ یہ بات بس سچ ہے خوشی کہاں ملے گی۔ یہ تو ادھوری خوشی ہوگی، ادھورا سکون۔“ وہ سوچ میں پڑ جاتا۔

”لیکن امی جان ایک درمیانی راہ بھی تو ہے؟“

”وہ کیا؟“ تائی جی اکتا کر پوچھتیں۔

”کہ پہلے اپنی پسند کو والدین کی پسند بناؤ پھر اظہار کرو۔ دونوں معاملے سیٹ۔“ اس نے چٹکی بجا کر کہا۔

”فضول کی بحث۔“ تائی جی بیزار ہوا ٹھٹھیں۔ ولید کی بات میں وزن تھا، لیکن اب ان کا اپنا اتنا وزن ہو چکا تھا کہ وہ کسی وزن دار بات کو سہ نہیں سکتی تھیں۔ اس لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”تم کہہ دو جا کر بھائی سے۔ بھلے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے میں اپنی بہو اور اس کی بیوی صرف درنا یا اب ہی کو بناؤں گی۔ میں نے کفیل بھائی سے بات کر لی ہے۔ وہ راضی ہیں۔ بس مجھے ابرار کی ہاں کا انتظار ہے اگلے مہینے بارات روانہ کر دوں گی۔ وہ کون سے کوئی بھوکے ننگے ہیں راتوں رات بیٹی کی رخصتی کا انتظام کر لیں گے۔ بتا دو تم ابرار کو اس کے علاوہ میں نہ کوئی بات سنوں گی نہ بحث کروں گی ہاں۔“ تیز تیز بولتے وہ باہر نکل گئیں۔

”تم بے شک امی سے جا کر کہہ دو چاہے کچھ ہو جائے میں شادی حنا ہی سے کروں گا۔ یہ میری زبان اور وعدے کی پاس داری کا مسئلہ ہے میں وعدہ کر چکا ہوں۔ صرف پسند کا مسئلہ نہیں۔“ ابرار بھائی ساری بات سن کر دو ٹوک انداز میں کہتے۔

”خدا ہو گئی بھائی! آپ جھک رہے ہیں نہ امی، آخر یہ مسئلہ کیسے حل ہو گا؟“ ولید بیزار ہو کر ان کے بیڈ پر لیٹ گیا۔

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ حنا نہیں تو کوئی بھی نہیں۔“ وہ کمرے میں ٹہل ٹہل کے بول رہے تھے۔

”ویسے درنا یا اب میں کیا برائی ہے؟ بقول امی کے آپ کی دنیا اور دین دونوں سنو رہا میں گے۔ دین امی کی بات ماننے سے اور دنیا درنا یا اب کو بیوی بنانے سے یعنی پانچوں گھٹی میں۔ میں نے تو آخر کی تھی امی کو کہ یہ دلکش سنہری موقع مجھے فراہم کریں۔ میں تو ایک منٹ کی دیر نہیں لگاؤں گا۔“ وہ اٹھ کر دونوں تکیے کمرے کے پیچھے رکھ کر بیٹھ گیا۔

”درنا یا اب کی سب سے بڑی برائی اس کی دولت ہی ہے ولید! کیا تم نہیں جانتے She is a Snob (وہ مغرور ہے)۔ وہ رک کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”بھائی وہ مغرور ہونے میں حق بجانب ہے۔ آخر کولا کھوں کروڑوں کی اکلوتی وارث ہے مگر اب کیا کیا جائے۔ امی کی ضد کا آپ کو پتا ہے۔ ہمیشہ سے وہ اپنی بات ہی منواتی آئی ہیں اور اب بھی انہوں نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ ابوان کے سامنے انہیں کر سکتے۔ ہم تو پھر۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”ولید! یہ انا کا مسئلہ نہیں۔ یہ میری پوری زندگی کا مسئلہ ہے۔ کیا وہ میری زندگی کو ایک عذاب مسلسل بنا دینا چاہتی ہیں کہ میں اپنی مرضی سے سانس بھی نہ لے سکوں۔“ وہ بے بسی سے بولے۔

”آپ حنا کے لیے کتنے سنجیدہ ہیں؟“

”شادی کی حد تک۔“

”تو پھر کر لیں شادی۔ امی بعد میں خود ہی مان جائیں گی۔ کب تک ناراض رہیں گی۔“ ولید نے انہیں بے خوف مشورہ دیا۔

”نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا بہر حال۔“ انہوں نے گہرا سانس لیا۔ ”امی کی رضا بہت ضروری ہے۔“

”تو پھر آپ بزدل ہیں اور بزدلوں کو دنیا میں ان کی پسند کا کچھ نہیں ملا کرتا۔ یاد رکھیے گا۔“

”میں بزدل نہیں ہوں ولید! حنا بھی اس بات کے لیے تیار نہیں نہ اس کی امی وہ بے حد وضع دار لوگ ہیں وہ تو اس روز میرے بے حد اصرار پر گھر آگئی تھی بعد میں وہ مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ امی نے جیسی اس کی پذیرائی کی تھی۔“ ابرار کے لہجے میں افسوس تھا۔

”وضع دار لوگوں کو کم از کم عشق وغیرہ نہیں کرنا چاہیے اور امی تو ایسے ہی کرتی ہیں آپ کو معلوم نہیں تھا۔ آپ کو حنا کو گھر لانا ہی نہیں چاہیے تھا پر بونل وغیرہ تو بعد کا مسئلہ ہے۔ پہلے تو کسی کی عزت نفس کا سوال ہے اور آپ کو پتا ہے۔ امی کو صرف اسی چیز کا علم تھیں، کسی کی کوئی عزت نفس بھی ہوتی ہے۔“ ولید ماں کی رگ رگ سے واقف تھا۔

”پھر میں کیا کروں۔“ وہ بے بس ہو کر بولے۔

”حنا سے بات کی آپ نے؟“

”وہ کسی صورت نہیں مانتی کورٹ میں جپر۔“

”تو پھر امی کا کہا مان لیں۔“

”نا ممکن۔“

”تو پھر؟“

”تو پھر میں نے ایک اور فیصلہ کیا ہے۔“

”کیا؟“ ولید سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔



”دو تین دن بعد بتاؤں گا۔ اب مجھے نیند آرہی ہے۔ تم بھی جاؤ۔“ وہ خشک لہجے میں بولے۔  
ایک ہفتے بعد انہوں نے عقدہ کھولا۔

”ولید! میں اپنی کمپنی کی طرف سے جدہ جا رہا ہوں ڈیپوٹیشن پر شاید مستقل وہیں رہ جاؤں۔“ ان کا لہجہ مضبوط تھا۔

”وہ وہاں جا کر دکھائے۔ مری ہوئی ماں کا چہرہ بھی نہیں دیکھے گا وصیت کر جاؤں گی۔ جابتادے اسے۔“ تائی جی سن کر گرج کر بولیں۔

بتانے کی نوبت ہی نہ آئی کہ اسی رات تائی جی کے سینے میں درد ہوا انہیں انجانا کا انیک ہوا تھا۔ ان کی ہائے وائے کی پکار اور پیلے زرد رنگ نے ابرار بھائی سے ان کی ساری قوت مدافعت پھین لی۔ وہ ایک رات ایک دن ہاسپٹل میں رہیں۔ اگلی شام گھر آ گئیں۔ ابرار بھائی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے منہ پھیر لیا وہ چپ چاپ ان کے بستر کے بائیں کنارے ٹک گئے۔ کتنے لمحے چپ چاپ گزر گئے۔ تایا جی بیوی اور بیٹے دونوں کے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہ رہے تھے کہ ابرار بھائی بول اٹھے۔

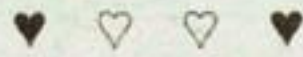
”آئی ایم سوری امی! میں کہیں نہیں جاؤں گا اور وہی کروں گا جو آپ کہیں گی۔“ ان کا سر جھکا ہوا تھا اور آواز کسی گڑھے میں سے آرہی تھی۔

اماں جی کا چہرہ کھل اٹھا، انہوں نے ذرا سا اٹھ کر ان کا چہرہ چوم لیا۔  
”میرا بچہ سدا خوش رہو۔“ ابرار بھائی کا سر اور جھک گیا۔

”مڈل کلاس شریف مردوں کا ایک المیہ ہوتا ہے ابرار صاحب! وہ ساری عمر ماما زبوائے بنے رہنے میں ہی اطمینان پاتے ہیں۔ مجھ سے شادی کر کے آپ کا ضمیر آپ کو کہیں چین نہیں لینے دے گا اتنی بڑی سزا اپنے لیے تجویز نہ کریں اس دنیا کا برنخ ضمیر کی عدالت ہے جو ایک بار اس کے کٹہرے میں کھڑا ہو گیا۔ وہ تمام عمر کسی خوشی میں لذت نہیں پاسکتا۔ آج یا کل آپ کو بہر حال اپنی ماں ہی کا کہنا ماننا ہو گا۔ اس لیے میرا خیال دل سے نکال دیں۔“

ایک ہفتہ پہلے حنا ان کی آفس ٹیبل پر کھتی ہوئی رونے لگی اور پھر اٹھ کر چلی گئی، اسی دن انہوں نے باہر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور آج؟

وہ واقعی ماما زبوائے تھے۔ ماں کی حکم عدولی کم از کم اس زندگی میں نہیں کر سکتے تھے اور نظریہ آواگون پر ان کا یقین نہیں تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا یہ جھکا ہوا سر اب کبھی نہیں اٹھ سکے گا۔



چھوٹا سا کوارٹر جس کی چھت بمشکل اس کے قد جتنی ہوگی۔ اس کی دیواریں سیلن زدہ تھیں انہیں دیکھ کر گیلی بن کا احساس ہوتا تھا جیسے رات بھر بارش ان دیواروں سے لپٹ کر روتی رہی ہے یا ان پر ابھی کسی نے پانی کا چھڑکاؤ کیا ہو۔ کالے گیلے سیمنٹ پر کہیں کہیں سفیدہ سا جھلک رہا تھا۔ اس کا فرش اینٹوں کا تھا، ایک کوٹھڑی نما کمرہ جس کے آگے صحن یا برآمدہ تھا جس پر چھت تھی اس کوٹھڑی میں ایک کھڑکی کھلتی تھی جہاں سے مٹی کا پہلے والا کمرہ صاف نظر آتا تھا۔ فرامیسی سفید فریچر اور سفید پردوں والا کمرہ اور اس کوٹھڑی میں رہنے والا یا نیا آنے والا یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کوٹھڑی میں اس درجہ پسماندہ کوارٹر بھی ہو سکتا ہے۔ عیدل نے کہا تھا وہ کوارٹر نیا بنا ہے حالانکہ نئے کوارٹر اس کوٹھڑی سے ہیٹ کر کوئی دس بارہ گز کے فاصلے پر تھے جہاں کوٹھڑی کے دیگر ملازمین رہتے تھے۔ یہ سرونٹ کوارٹر شاید اس کوٹھڑی کی تعمیر سے پہلے بنایا گیا تھا، صحن میں مٹی کے تیل کا چولہا بڑا تھا۔ تام چینی کی دو گندی پلیٹیں، ایک اسٹیل کا گلاس دو مٹی کی پیالیاں اور سلور کی دیگھی اس کوارٹر کے کچن کی کل کائنات تھے۔ کوٹھڑی کے اندر



بان کی چارپائی تھی جس پر میلا سا ایک بستر بچھا تھا اور تیز رنگوں والے پرنٹ کا لحاف پڑا تھا۔

رات تو اس نے جیسے پیسے گزار دی تھی ہوتے ہی اس کو ارٹھر کے ماحول کو دیکھتے ہی اس کو ابائی آنے لگی۔ صحن میں لگے نلکے سے اس نے پانی کے دو تین چھلکے منہ پر مارے بالوں پر اناسیدھا کنگھا کیا اور کوارٹر کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ باہر ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ سرما کی نرم گرم دھوپ اس کے سر سے ٹھنڈے ہوئے وجود کو جیسے ایک دم سے سکون کا احساس ہوا۔ وہ ست قدموں سے چلتی ہوئی گونگی کے اندر آگئی۔ ڈانٹنگ نیبل پر ناشتہ ہو رہا تھا۔ گرم گرم آلیٹ اور فرائی انڈوں کی مہک ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اس کی بھوک چمک اٹھی۔ عاکف پچا سے دیکھ کر ذرا سا مسکرائے نرگس آنٹی کا چہرہ درشت سا ہو گیا اور سارہ نے دودھ کا گلاس اٹھاتے ہوئے ایک سرسری سی نگاہ اس کے بے وقعت وجود پر ڈالی۔

”آجاؤ۔ فضلہ! ناشتہ کرلو۔“ عاکف پچا نے اسے دعوت دی۔

”وہ کر لے گی خود ہی، سارا دن اور اس نے یہاں رہ کر کیا کرنا ہوتا ہے روٹیاں ہی تو ٹوٹی ہوتی ہیں۔ آپ ذرا جلدی کریں آفس سے دیر ہو رہی ہے۔“ نرگس آنٹی نے بڑی نزاکت سے نشوونما سے اپنے لپ اسٹک زدہ ہونٹوں کے کنارے صاف کیے۔ مٹی جیسی ریفائنڈ عورت کی بیٹی اکثر کتنی جاہلانہ گفتگو کرتی تھی۔ فضلہ نے سوچا۔

”ہاں۔ بس میں نے تو کر لیا ہے چار بار ہوں میں تو۔ فضلہ! ادھر آجاؤ تم میری چیر پر۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ہو نہ! نرگس آنٹی ان کے چو پھلوں پر منہ بنا کر کھڑی ہو گئیں اور عاکف پچا سے پہلے باہر کی طرف برہہ گئیں۔

”عاکف پچا! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ ان کے پاس آکر بولی۔

”ہاں کرو۔“ وہ جاتے جاتے رک گئے۔

”مجھے کراچی بھجوا دیں پلیز ای می آپنی کے پاس۔ مجھے یہاں نہیں رہنا پلینز پچا جان!“ وہ بڑا حوصلہ کر کے بولی تھی پھر بھی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”گڑیا! ابھی تو می کا سوئم ہوا ہے۔ اتنی جلدی تو میں کہیں نہیں جاسکتا۔ ہاں آئی پر امس میں ایک دو ہفتوں میں تمہیں خود کراچی لے چلوں گا پھر تمہاری مرضی تم وہاں رہنا یا یہاں آجانا۔ فی الحال تھوڑا انتظار کرلو۔ میں آج کل ذرا بڑی ہوں، ٹھیک ہے۔ اب تم ناشتہ کرو۔“ ان کا لہجہ خلاف معمول نرم تھا۔

”عاکف پچا! مجھے اس کو ارٹھر میں نہیں رہنا۔ مجھے وہاں سے خوف آتا ہے پلیز۔ مجھے ادھر ہی رکھ لیں۔“ وہ ان کے کوٹ کا بازو تھام کر منت سے بولی۔

”کون سے کو ارٹھر۔ کو ارٹھر میں ہو تم؟ تم ادھر ہی رہو نا۔ ادھر کہاں رہ رہی ہو تم؟ میں می کا کمرہ ٹھیک کروا دیتا ہوں تمہارے لیے وہاں کوئی بھی نہیں ہوتا۔ میں جاتے ہوئے عبدل سے کہہ دوں گا۔ تم وہیں رہنا دو گے۔ اب میں چلتا ہوں تم ناشتہ کرو۔“

وہ جلدی میں تھے ہمیشہ کی طرح جلدی جلدی اس کی تشفی کر کے بولے۔ سارہ ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز اخبار دیکھتے ہوئے گھونٹ گھونٹ دودھ پی رہی تھی۔

”عاکف! اب آج بھی جاؤ۔ گھنٹے سے میں ویٹ کر رہی ہوں۔“ نرگس آنٹی دوبارہ اندر آکر دھڑکیں تو عاکف پچا کو جیسے جانے کا راستہ بھول گیا گھبرا کر ہر طرف لپکے۔

”اور سنو فضلہ! شام کو می کی تعزیت کے لیے میرے کچھ خاص مہمان آنے ہیں ان کے کھانے کا انتظام ادھر ہی ہو گا۔ ڈانٹنگ نیبل میں تم شریفان اور بٹلر کے ساتھ کوکٹ کر لینا، یوں منہ اٹھا کر فارغ نہ گھوما کرو کوئی کام بھی کر لیا کرو۔ می کی آڑ میں تم نے بہت عرصہ آرام سے ہاتھ پاؤں توڑ کر کھائی لیا ہے اب ذرا خود سے بھی کچھ کرنا سیکھ لو پھر

کل کو تمہارے بیک ورڈ رشتہ دار کہیں گے تمہیں میں نے پھوٹڑ رکھا۔ شریفان سے کچھ نہ کچھ سیکھ لو یہ تمہاری کلاس کا تقاضا بھی ہے انڈر اسٹینڈ اور بات بات پر پچا کے آگے رونا دھونا چھوڑ دو۔ (تم اب ایک بچی نہیں ہو) Girl You are a grooming۔“ وہ کہہ کر ٹک ٹک کرتی باہر نکل گئیں۔

”یو آر نو مور اے چائلڈ فضلہ ڈارلنگ!“ سارہ ہنستے ہوئے ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ”انڈر اسٹینڈ۔“ وہ شرارت سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ ”تم نے کراچی جانا ہے تو جاؤ نا پلیز میں تو تمہیں دیکھ دیکھ کر بور ہو گئی ہوں۔“ ریلی تم اس قدر ڈل اور ان اٹریکٹو ہو کہ تمہیں خود اپنے ساتھ چند دن گزارنے پر جائیں تو تم خود بور ہو جاؤ۔ تھنک گاڈ ایک آدھ ہفتے بعد میرے ایگزام شروع ہو جائیں گے۔ ایگزام کے بعد ہم کہیں نہ کہیں فلائی کر جائیں گے۔ تمہاری پوری ریت سے جان چھوٹ جائے گی۔“ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے تقریباً ”چھلٹے ہوئے باہر نکل گئی۔

”ایگزام۔“ می نے کہا تھا فضلہ جان مجھ سے راس کر کہ تم میٹرک کا ایگزام ضرور دو گی۔ میں نے تمہارا ایڈمیشن بھجوا دیا ہے۔“ اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ ”سرزیر کا فون نمبر کہاں ہے۔ ان سے پتا کرتی ہوں۔“ وہ واپس کوارٹر کی طرف بھاگی۔ اس کا سارا سامان ادھر ہی تھا۔

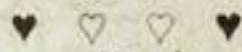
سرزیر نے اسے بتایا کہ اس کا داخلہ واقعی جا چکا ہے اور ان کے پاس اس کی رول نمبر سلپ بھی آچکی ہے۔ ”گلے ہفتے سے ایگزام شروع ہونے والے ہیں پیپر زدے دو۔“

ناشتہ کرتے ہی وہ کوارٹر میں چلی آئی۔ ادھر سے اپنی کتابیں اٹھائیں ان کی گرد جھاڑی اور انہیں لے کر وہ کوارٹر کے پچھلی طرف دھوپ میں چلی آئی شام کو آنٹی نرگس کے گیسٹ آنے ہیں وہ قطعی بھول چکی تھی۔ شام ڈھلنے تک وہ وہیں بیٹھی پڑھتی رہی۔ درمیان میں بھوک لگی وہ نظر انداز کر گئی۔

”ایک ہفتہ تو ہے بیچ میں۔ شام کو سر آجائیں گے رول نمبر سلپ اور ڈیٹ شیٹ لے کر۔“ اس نے خود کو سمجھایا۔ شام کو وہ مغرب سے پہلے ہی جا کر شریفان سے کھانا لے آئی اور کوارٹر میں بیٹھ کر کھانے لگی۔

”یہاں کم از کم سکون تو ہے کوٹھی میں کس قدر ہنگامہ ہے۔ مہمان آنے والے ہیں نوکروں کی کم بختی آئی ہوئی ہے۔ شکر ہے نرگس آنٹی کی مجھ پر نظر نہیں پڑی ورنہ میری شامت آجاتی۔“ وہ کھانا کھاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”چائے منے کو دل چاہ رہا ہے۔ چستی آجائے گی رات کو دیر تک پڑھوں گی کراچی جانے سے پہلے ایگزام تو دے دوں۔ وہیں کالج میں ایڈمیشن لے لوں گی ای می آپنی اور عبیدہ آپنی رفون پر پوچھتی ہیں۔“ فضلہ اسکول جاری ہوا اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں۔“ اب میں انہیں کیا بتاؤں کہ میں نے تو اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ میرا میٹرک کا رزلٹ اچھا آگیا تو دونوں خوش ہو جائیں گی ابھی تو دس بارہ دن ہیں ایگزام میں۔“ وہ پھر سے کتابیں لے کر دت گئی۔



گھر میں ابراہیمائی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ تائی جی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ساری خدائی بیچ کر ابراہیمائی کی بری میں لگا دیں۔ تیا جی کی بڑی بڑی بیٹی ان کا تملانا تائی جی پر کچھ اثر نہیں کر رہا تھا۔ شادی کی تیاریوں میں

گھر فرسٹ از سر نو گھر کی تعمیر و مرمت شامل تھی۔ ابراہیمائی کا کمرہ چھوٹا تھا اس کے ساتھ اسٹور روم خاصا بڑا تھا تائی جی نے اسٹور کو کمرے میں شامل کروا کے اسے لکڑی بیڈ روم کی شکل دے دی تھی۔ سارے گھر میں پینٹ ہو رہا تھا پچھلے صحن کی بھی قسمت جاگ اٹھی تھی۔ سارا صحن صاف کروا کے نئے گمے اور پودے لگائے گئے تھے کبوتروں کے در بے نئے منگوائے گئے تھے ان پر پینٹ کروایا تھا۔ کچن کی سادہ سلیب پروائٹ فارمیکا کے کینٹ لگوائے گئے نیا سنگ نئی کھڑکیاں اور دروازہ کچن کی شکل ہی بدل گئی تھی باہر کے اجڑے ہوئے لان کو سنوارا گیا تیا جی نے ایک ملا کر کچن ہی دونوں میں ہر ابھر لان آنکھوں کو تراوٹ بخشنے لگا۔



”ہوں لگ رہا ہے مصر کی قلوبطرہ آ رہی ہے گھر کی انپکشن پر۔ چلو اسی بہانے ہم بھی کچھ عرصہ اچھی اور پر آسائش زندگی کے مزے لوٹ لیں گے۔“

ولید آتے جاتے تائی جی کو سنا تا وہ ان سنی کر دیتیں۔ آج کل انہیں اپنے گھنٹوں اور جوڑوں کا درد بھی بھولا ہوا تھا۔ منجانب بچے اٹھ جاتیں پھر سارا دن ایک پل کو بستر سے کمر نہ نکالتیں۔ سارا دن ریشمی کپڑوں، چائنا سلک کے دوپٹوں، جارحٹ اور شیفون اور ویلوٹ کی نئی ورائٹی میں الجھی رہتیں۔ آج کل ان کا رویہ ایمن سے بہت اچھا ہو گیا تھا۔ سارا کام اسی سے کرواتیں اندر باہر کے چکر درزی کے مشورے، جیولر کے پھیرے سب میں ایمن کی شرکت لازمی ہوتی تھی اور ولید ان کا ڈرائیور بنا ہوا تھا۔

”تم پاگل ہو رہی ہو انیسس! ان فضول کے بکھیروں اور اسراف میں۔ میں کہتا ہوں کچھ خدا کا خوف کرو۔ کچھ ہمارے کھانے پینے کے لیے بعد میں بھی رہنے دو، کیوں ہم سب کا دیوالیہ کروانا ہے۔ آج یہ سب کر لو گی کل ولید کی دفعہ ہمارے پاس اتنا نہ ہوا تو۔ پھر ایمن بھی تو ہے سب بچوں کا خیال رکھو کیوں ایک ہی کی خوشی پر سب کچھ لٹا رہی ہو۔“ تایا جی تبھی پیار سے کبھی منت سے تائی جی کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔

”نہ ولید کے ابو! مجھے ایک بات بتاؤ کیا میں اس قدر بے وقوف ہوں جو سب کچھ اندھے کنوئیں میں جھونک دوں گی آخر مجھے کچھ نظر آ رہا ہے تو میں کر رہی ہوں نا۔ میرے گھر میں سو نہیں آ رہی۔ لکشمی آ رہی ہے۔ تم اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتے آج اگر میں اس کے چاہتیں کروں گی تو کل کو اپنے سنے پورے کروں گی۔ یہ دو تین لاکھ کا خرچ انشا اللہ بمعہ سود میں چالیس سے زائد کی صورت میں پورا ہو جائے گا۔ اتنی سمجھ تو آپ کو بھی ہے۔“ وہ بڑے زیرک انداز میں کہتیں۔

”اتنی سمجھ مجھے ہے پر تمہیں نہیں ہے۔ تم جو خواب دیکھ رہی ہو۔ اس کا انجام اگر الٹ ہو گیا تو سوچو ذرا کیا ہو گا ہمارے پاس کیا بچ جائے گا۔ اپنے نقصان کا حساب لگانے کے لیے حواس بھی نہیں رہیں گے۔ تم سوچو ذرا کیا لگیل اتنا بے وقوف ہے کہ سب کچھ اٹھا کر تمہاری جھولی میں ڈال دے گا۔ اس نے خود ساری زندگی ایک بیٹے کی طرح گزاری ہے روپے کی جگہ اس نے دھیلا خرچ کیا ہے۔ پیسے سے اتنا پیار کرنے والا کیا پونہی سب کچھ تمہارے حوالے کر دے گا۔ درنایاب اس کی بیٹی ہے اور پھر تمہاری بھانج۔ جس نے ساری زندگی تم سے ٹھیک طریقے سے بات نہیں کی، کیا اب وہ اتنی آسانی سے یہ سب ہو جانے دے گی۔ پیسے کی ترسیل وہ کم از کم تمہاری طرف نہیں ہونے دے گی۔ یہ سب کچھ سوچ لو۔“ تایا جی انہیں ڈراتے۔

”ہاں یہ باتیں تو کبھی کبھی مجھے بھی خوفزدہ کرتی ہیں، لیکن انسان کو کبھی منفی سوچ نہیں رکھنی چاہیے آگے آ جاتی ہے میں بھی پونہی دل کو سمجھا لیتی ہوں تو ٹھیک ہو جاتا ہے پھر بھی خدا نخواستہ اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہو اب تین چار لاکھ لگا رہی ہوں۔ نارمل حالات میں بھی تو ڈیڑھ دو لاکھ لگ ہی جاتے ہیں نہ کچھ ہاتھ آیا تو نہ سسی اور دونوں بچوں کی دفعہ اللہ مالک ہے۔ میری خوشی کو کرنا نہ کریں۔ یہ ہولناک نقشے کھینچ کھینچ کر۔ میں ذرا بازار جا رہی ہوں۔ ولید کہاں ہے۔ اسے ذرا میرے پاس جیجی میں بچن میں ہوں دیکھوں ایمن نے کھانا تیار کر لیا ہے تو ذرا میرے ساتھ چلے۔“

وہ اٹھنے لگیں۔

”ارے خدا کی بندی! اس وقت تو بیٹھو۔ سات بج رہے ہیں۔ بازار بند ہونے کو ہیں کل چلی جانا اور اس بچی کو بھی کچھ بڑھ لینے دو۔ اس کے فائنل امتحان سر رہیں سارا دن یہ ہانڈی چولہا اور تمہارے بازاروں کے چونچلے اس کا

کتنا حرج ہو رہا ہے تمہیں کچھ تو خیال کرنا چاہیے۔“

”خیال ہی تو کر رہی ہوں۔ یہ موار بھالی کا کاٹمٹا اس سال ختم ہو جائے گا تو کل اس نے یہی کام کرنے ہیں۔ دعا کریں اس دوران ہی کہیں اچھا رشتہ نظر آجائے تو میں ایک دن کی دیر نہ لگاؤں۔ پڑھ کے اس نے کیا کرنا ہے تو کری کر لی ہے کوئی۔ دو چار سالوں بعد سب پڑھا لکھا چوٹ ہو جاتا ہے۔ پھر یہی ہانڈی چولہا اور کپڑے لٹے کی سمجھداری کام آتی ہے۔ میں اسی کام میں اسے ماہر کر رہی ہوں۔ دیکھیے گا جس گھر میں جائے گی ان کاموں میں مات نہیں کھائے گی، یہی چیزیں کام والی ہیں یہ ڈگریاں تو الماریوں کے پچھلے خانوں میں کہیں پڑی سڑتی ہیں، ان کو کون پوچھتا ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ”کھانا بھجواؤں آپ کے لیے؟“

”نہیں ابھی نہیں، میں کہتا ہوں پھر تو ایمن جس گھر میں جائے گی۔ اس کے تو نصیب جاگ جائیں گے بقول تمہارے۔ امور خانہ داری میں اس قدر ماہر ہو کر دیا ہے تم نے اسے۔“ تایا جی پونہی بولے۔

”ہاں تو میں غلط کہہ رہی ہوں۔ دیکھیے گا آپ کیما سسرال میں نام کرے گی جا کر میری تربیت کوئی ایسی ویسی ہے۔“ وہ فخریہ انداز میں بولیں۔

”بڑی خوش قسمت ہو گی پھر تو ایمن کی سسرال۔ ہے نا؟“ وہ مسکرا رہے تھے۔

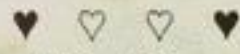
”ظاہر ہے اس میں کیا شک ہے۔“ تائی جی ان کے انداز کو سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔

”اب یاد رکھنا اس بات کو بلکہ قائم رہنا اس بات پر۔“ وہ کھڑے ہو کر ہنستے ہوئے بولے۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ رک کر ذرا ٹھیکے چٹون سے بولیں۔

”کوئی مطلب نہیں۔ تم جاؤ دیر ہو رہی ہے۔ میں ولید کو دیکھتا ہوں اور جلدی آ جانا میں اتنی دیر کھانے کا انتظار نہیں کر سکتا۔“ وہ باہر کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ ابھی کھالیں۔ ہمیں دیر ہو جائے گی۔“ تائی جی بڑبڑاتیں وہ ان سنی کر کے باہر نکل گئے۔



اس کے ایگزٹام اس کی توقع کے خلاف اچھے ہوئے تھے۔ آخری پیر دے کر وہ بہت خوش خوش سوئی تھی۔ ”آج تو جو مرضی ہو جائے میں چچا جان سے کہوں گی۔ اب مجھے کراچی بھجوا دیں یا مجھے ٹرین میں بٹھادیں۔ میں خود ہی پہنچ جاؤں گی۔ ایڈریس مجھے لکھ دیں۔“ وہ منصوبے بناتی عاکف چچا کے کمرے کی طرف آئی۔

”شریفان! عاکف چچا اندر ہیں؟“ پاس سے گزرتی شریفان سے اس نے پوچھا۔

”نہیں جی۔ صاحب جی تو کل سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔“ وہ ذرا رک کر بولی۔

”کب تک آجائیں گے؟“ بھلا اس نوکرانی کو بے چاری کو کیا معلوم پھر بھی وہ پوچھ بیٹھی۔





۴  
چوتھی قسط

”پتا نہیں جی شاید دو تین دن لگیں گے۔ کافی بھاری سوٹ یس لے کر گئے تھے اور آج بیگم صاحبہ بھی چلی گئی ہیں سارہ بی بی کو لے کر۔“

”اوہ! تو اس کا مطلب ہے میں کوٹھی میں اکیلی ہوں اور مجھے کسی نے بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ مرے مرے قدموں سے واپس لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

عاکف چچا واقعی تین دن کے بعد آئے۔ وہ تین دن ادھر ہی رہی کوارٹر میں جاتے ڈر لگ رہا تھا۔ اکیلے پن کا احساس بڑھ گیا تھا۔

”عاکف چچا! آپ مجھے بتا کر بھی نہیں گئے کہ اسلام آباد جا رہے ہیں۔“ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے وہ فوراً آگے بڑھ کر شکایتا بولی۔

”چلو اب تم رہ گئی ہو جسے میں بتا کر آیا جایا کروں۔“ وہ غصے سے بگڑ کر بولے۔

”مجھے کراچی جانا تھا اس لیے۔ میرے ایگزام کتنے دن پہلے ختم ہو گئے ہیں۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ مجھے لے جائیں گے۔“ وہ ان کے غصے سے ذرا سہم کر بولی۔

”ہاں کہا تھا۔ غلطی ہو گئی۔ پورا نہیں کیا۔ اب میں بے حد تھکا ہوا ہوں، نہیں تو تمہیں ابھی لے جاتا کراچی۔ کراچی میں پھول بتاشے بٹ رہے ہیں وہاں جاؤ گی تو سارا شوق ہوا ہو جائے گا۔ یہاں کا آرام تم سے سہا نہیں جا رہا۔ اب جب جاؤں گا لے جاؤں گا۔ مجھے اب کچھ آرام کرنے دو۔ میں ابھی اتنے لمبے سفر سے لوٹا ہوں۔“

وہ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھے ان کا مزاج بے حد بگڑا ہوا تھا۔ اس کی مزید بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

پھر کتنے دن اور چپکے سے سرک گئے۔ اس کا میٹرک کارزلٹ بھی آگیا وہ فرسٹ ڈویژن سے پاس ہو گئی۔

”عاکف چچا! مجھے کالج میں ایڈمیشن لینا ہے۔“ انسان بڑی ڈھیٹ چیز ہے، فرمائش کرنے سے نہیں باز رہتا۔

دھتکار نے کے باوجود۔

”ہاں لے لینا۔ میں کہہ دوں گا اشرف سے تمہارا داخلہ کروادے۔“ انہوں نے اپنے منیجر کا نام لیا وہ خوش ہو



گئی۔

پھر ان ہی دنوں تایا جی کراچی سے ابراہمائی کی شادی کا کارڈ لے کر آگئے اس سے بڑی محبت سے ملے۔  
 ”تایا جی! مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔“ ان کے محبت بھرے رویے سے متاثر ہو کر وہ پھر سے فرمائش کر بیٹھی۔  
 ”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم چلو میرے ساتھ۔ ایمن تمہیں بہت یاد کرتی ہے اور تمہاری تائی جی بھی۔ اب تم میرے ساتھ ہی چلنا۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔ اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔  
 ”عائف کو تو تاؤم نہیں ملتا پیچی کو بہنوں سے ملوالائے دنیا جہان کے لوگ کاروبار کرتے ہیں۔ لیکن تمہارا کاروبار ساری دنیا سے نرالا ہے۔ جس سے ذرا سا بھی وقت نہیں ملتا کہ کبھی فون کر کے ہی خیر خبر لے لے۔“ وہ عائف چچا سے بولے۔

”سوری بھائی جان! بس کیا کروں ایسا الجھا ہوں اس بزنس میں کہ کیا بتاؤں مجھ سے فضلہ نے کتنی بار کہا ہے کہ میں اسے کراچی لے جاؤں پھر وہی وقت کی کمی۔ کراچی جاتا بھی ہوں۔ بھاگم بھاگم میں ہی وقت گزر جاتا ہے، لیکن اب انشاء اللہ شادی میں ضرور آؤں گا۔ میرا آپ سے پکا وعدہ ہے اور فضلہ کو بھی ضرور لاؤں گا۔“ اسے معلوم تھا کہ ان کا وعدہ پہلے وعدوں جیسا ”پکا“ ہے۔

”خیر تمہاری مرضی۔ تم آنا یا نہ آنا لیکن فضلہ کو میں لے کر جا رہا ہوں۔ ایمن نے مجھے تاکید کی تھی۔ اب میں تو پیچی کا دل نہیں توڑ سکتا اور اس فضلہ کی طرف دیکھا ہے تم نے کس قدر کمزور ہو گئی ہے اور رنگ بھی کیسا دم سہا ہو گیا ہے۔“

”بس بھائی جان! کیا کروں اتنی تو کوشش کرتا ہوں حتی الامکان جب بھی وقت ملے۔ اس کا خیال رکھوں۔ بس مصروف بندہ ہوں۔ بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا اپنا گھر ہے۔ یہ اپنا خیال خود رکھ لیا کرے۔ کوئی اسے منع کرتا ہے۔ یہ خود ہی ابھی تک جھجکتی ہے۔“ وہ روایتی لہجے میں بول رہے تھے۔  
 ”اور تمہاری بیوی۔ اس کو کیوں بھول جاتے ہو۔ وہ یہاں کسی کو اپنی اجازت کے بغیر سانس لینے دیتی ہے جو اسے خیر بہر حال اب تو میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ تم فضلہ! تیاری کرو مجھے ایک دو جگہ کارڈ دینے جانا ہے۔ ایک تو تمہاری تائی جی کی بہن کے گھر اور ایک دو رشتہ داروں کی طرف اور پھر میں رات کو یا کل صبح آؤں گا اور تمہیں لے جاؤں گا۔“

وہ فضلہ سے بولے تو وہ سر ہلانے لگی۔

”اور عائف میاں! آجائے تم بھی۔ دو گھڑی کو اپنی مصروف زندگی سے وقت نکال کر ہم غریبوں کے لیے بھی ہو سکے تو اپنی بیٹی کو بھی لے آنا پیسہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ رشتے ناتے تو نہیں خرید کر دے سکتا۔ یہ تو خدا کے عطا کیے ہوتے ہیں اسے اپنے رشتہ داروں کی پہچان کرنا اور نہ ماں کی طرح وہ بھی زندگی کسی آدم بیزار کی طرح ہی گزار دے گی۔ اسے شادی میں ضرور لے کر آنا۔ سفینہ بھی آئے گی۔ سب سے ملاقات کرانا اس کی۔“ عائف چچا اثبات میں سر ہلانے لگے۔

”اچھا میں چلتا ہوں۔ رات کو یا کل صبح آؤں گا۔ فضلہ! تم تیار رہنا۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

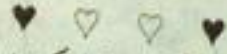
”بھائی جان! اکل چلے جائے گا۔ آج آرام کریں۔“ عائف چچا تکلفاً بولے۔

”نہیں بھی! آرام کا وقت نہیں ہے۔ ابھی بہت سے کام کرنا ہیں۔ تمہیں بہر حال تاکید ہے آجائے یا دے۔“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

UrduPhoto.com

فضلہ خوشی خوشی جا کر اپنا سوٹ کیس تیار کرنے لگی۔ کپڑے اس کے پاس کون سے ڈھنگ کے تھے وہی جو نرگس آنٹی کبھی کبھی سارہ کے نئے پرانے نکال کر دیتیں ان ہی سے اس کا گزارا ہوتا تھا۔ کئی سالوں سے اس کے نئے کپڑے نہیں بنے تھے۔ ہاں قہمی کو کبھی خیال آ جاتا تو وہ کسی نوکر کے ہاتھ اس کا نیا سوٹ منگوا لیتیں اور نوکر کا پسند کیا ہوا سوٹ بھی عجیب سا ہی ہوتا تھا۔ مہی کو افسوس ہوتا مگر وہ کیا کر سکتی تھیں اور نرگس آنٹی عید تہوار پر سارے گھر کے نوکروں کے کپڑے سلواتیں۔ اسے ہمیشہ بھول جاتیں۔ عائف چچا کو بھی عید کے روزیاد آتا تو محض اس کو چند سو

روپے دے کر فرض سے سبکدوش ہو جاتے اور اسے تو ضد کرنا آتا ہی نہ تھا۔  
 اس نے جلدی جلدی سوٹ کیس بند کیا اور لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی اسے بیٹھے رات کے اٹھ بج گئے تایا جی آئے ہی نہیں۔ اس نے تنگ آکر کھانا بھی کھا لیا۔ چچا بھی گھر پر نہیں تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی اور اگلی صبح بھی ہو گئی۔ گیارہ بجے امید کی شمع بالکل ہی گل ہو گئی۔ تایا جی اسے بھول گئے تھے یا جان بوجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ اسے لگا اب وہ اس نفس سے کہیں بھی نہیں جاسکے گی۔ رات صوفے پر سونے کی وجہ سے اس کا جسم اکڑ سا گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اسے بخار ہو جائے گا۔ کل سے نزلہ زکام اور کھانسی بھی تھی پھر اوپر سے یہ دکھ۔ اس کا دل جیسے ٹوٹ سا گیا۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر کوارٹر میں آکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



درنایاب واقعی درنایاب تھی۔ اگر تائی جی اس کے استقبال کی خاطر یوں تن من دھن کی بازی لگائے بیٹھی تھیں تو کچھ غلط نہ تھا۔ وہ واقعی قدرت کی صنای کا منہ پوتا شاہکار تھی۔ جیسے سنگ مرمر کا تراشا ہوا حقیقی مجسمہ جو چھم سے تائی جی کی کسی نیکی کے انعام کے طور پر ان کے گھر آگن میں آنازل ہوا تھا۔ پتلی دلی نازک سی اور رنگ اتنا سرخ و سفید کہ ہاتھ لگاتے بھی ڈر گئے کہ کہیں میلی نہ ہو جائے۔ باداموں جیسی بڑی بڑی براؤن آنکھیں، لائٹ براؤن گندم کے خوشوں جیسے گھٹکھریا لے بال اور اوپر سے شد سے میٹھا لہجہ کو نکل سی سریلی آواز۔

ایمن جتنی دیر اس کے پاس بیٹھی رہی، یہی سوچتی رہی کہ کہیں تو قدرت نے کوئی کمی چھوڑی ہوگی لیکن فی الحال اپنی کوشش کے باوجود وہ کوئی ایسی خامی تلاش نہ کر سکی۔ تائی جی اس کے واری صدقے جاری تھیں۔ اسے اپنے گھر میں دیکھ دیکھ کر ان کا جیسے خون بڑھ رہا تھا۔ ساری بیماری ساری بیماری انہیں بھول گئی تھی۔ خلاف توقع تایا جی بھی بے حد خوش تھے اور خوش کیوں نہ ہوتے۔ درنایاب کی گاڑی کے پیچھے سامان سے لدے پھندے دوڑک جو آئے تھے، جن کو خالی کرنے میں ہی پوری رات گزر گئی تھی اور پندرہ دن تائی جی کو اس سامان کو ٹھکانے لگانے میں لگے تھے۔

ویسے تو سارا کچھ درنایاب کا ہی تھا، لیکن پھر بھی کفیل ماموں نے دینے کی حد کر دی تھی۔ تائی جی کو جو سیٹ انہوں نے دیا تھا وہ دس تو لے کا تھا۔ کتنی راتیں انہیں نیند نہیں آئی تھی۔ رات گئے تک وہ سیٹ پہنے رکھتیں ہر آئے گئے کو کانوں اور گلے سے اتارنا کر دکھاتیں۔

”دیکھو تو وزن پورے دس تو لے کا ہے اور یہ بازو کے کٹن بھی تین تین تو لے کے ہیں، خالص سونے کی لشکارے مارتی چمک دمک دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ کر دیتی اور تائی جی کا سر فخر سے اور اونچا ہو جاتا۔ تایا جی کی سونے کی انگوٹھی اور چین دونوں تائی جی نے سنبھال لی تھیں۔

”آپ نے اس عمر میں سونا پسین کر کیا کرنا ہے۔ ویسے بھی مرد کو سونا حرام ہے۔“ انہوں نے دونوں چیزیں اپنے قبضے میں کر لیں۔



اس قدر حسین و جمیل اور صاحب ثروت و لمن کو پا کر ابرار بھائی۔ جیسے سارے رونے بھول گئے تھے۔ اس جیسی درنایاب پر ایک حنا کیا اس جیسی دس حنائیں بھی بڑے آرام سے قربان کی جاسکتی تھیں بارات والے دن تک جو ان کا منہ سو جا ہوا تھا۔ پیشانی پر شکنوں کا جو جال پچھلے چار پانچ ماہ سے تباہ ہوا تھا اب ایک ایسی اس کی جگہ خوشی و انبساط، محبت اور بہت کچھ پالنے کی انہونی مسرت نے جگہ لے لی تھی۔ ماں سے ان کے سارے گلے شکوے جاتے رہے تھے۔ درنایاب نے جیسے ان کے وجود ان کے خیال اور محبت سے محرومی جیسے سارے خلا پر کر دیے تھے۔ انہیں اب اس کے بغیر ایک مل چین نہیں آتا تھا۔ سارا دن وہ دونوں اپنے کمرے میں ہی رہتے تھے۔ دونوں صرف دو ٹائم کا کھانا کھانے باہر نکلتے تھے۔ ناشتہ اپنے کمرے میں ہی کرتے تھے۔

کفیل ماموں نے بیٹی کی خدمت کے لیے نوکرانی ساتھ دی تھی۔ جسے ہر وقت بی بی کی ڈانٹ کا غم ستا رہا تھا۔ ناشتہ اور کھانا درنایاب کی پسند کے مطابق ہی بناتا تھا۔ یہ ایمن کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔ اس کے فاسل ایگزام سر پر تھے۔ پہلے شادی کی تیاریوں میں اور بعد میں شادی کی مصروفیات میں اس کی پر بھائی کا بڑا حرج ہو چکا تھا۔ وہ اب زینت کو چمن میں لگا کر خود پڑھنے بیٹھ جاتی۔ تائی جی کو بھی ساری عمر کی مشقت کے بعد جیسے اب ہی چین ملا تھا۔ وہ سارا دن بستر پر پڑی اینٹھتی رہتیں یا پھر بونٹی اٹھ کے پورے گھر کا چکر لگاتیں اور بچے سجائے کمرے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرتیں۔

”دیکھنا تو ولید! میں تمہارے لیے بھی ایسی ہی دلہن ڈھونڈوں گی۔ بس تم ذرا نوکری سے لگ جاؤ۔“ وہ ولید کو خوش کرنے کے لیے کہتیں۔

”سچ امی! واقعی ابرار بھائی کو تو دنیا میں ہی جنت اور حور و دونوں مل گئے۔ پتا نہیں اپنی ایسی قسمت ہے کہ نہیں۔ وہ امی کہتے ہیں جس نے اس دنیا میں جنت کے مزے لوٹ لیے، اسے آخرت میں کچھ نہیں ملے گا اور یہ دنیا تو چند روزہ ہے اس لیے جنت کی خاص ضرورت تو نہیں۔ میں تو یہ سب اگلی دنیا میں ہی لوں گا۔“ وہ یونہی ہانکنے لگتا۔

”فضول نہ بکا کرو، جنت تو انسان کو اپنے اعمال کی وجہ سے ملتی ہے۔ دنیا کے سارے امیر کبیر لوگ برے نہیں ہوتے۔ بہت زیادہ اچھے اور نیک بھی ہوتے ہیں۔ ان کے نیک اعمال کے بدلے ہی میں تو ان کو اس دنیا میں آسائش ملتی ہیں جو ان کی نیکیوں کی جزا کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ باقی کا آخرت میں ملے گا۔ یہ سب فضول باتیں ہیں کہ جس کو یہاں جنت مل گئی۔ آگے کچھ نہیں ملے گا۔ دیکھنا تو انشاء اللہ تمہارے لیے بھی ایسی ہی حور تلاش کروں گی میں۔“ ولید کے روشن مستقبل کا سوچ کر ہی تائی جی کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔

”امی جان! یہ ابرار بھائی آفس کب سے جانا شروع کریں گے؟ ان کی چھٹی لمبی نہیں ہو گئی؟“ اس نے موضوع بدلا۔

”اے لو بھلا اب اسے آفس جانے کی کیا ضرورت۔ نوکری سے تو اس نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اب ذرا اپنی مومن سے فارغ ہو آئیں پھر تمہارے ماموں کے آفس جایا کریں گے۔ گلاس فیکٹری انہوں نے اس کے نام کر دی ہے۔ بس جا کر وہاں کا انتظام سنبھالے گا۔“ تائی جی کے انکشاف نے کتاب پڑھتی ایمن کو بھی حیران کر دیا۔

”وہ اس کا مطلب ہے اب وہ بھابھی کے لیے ایک روپیہ بھی لائیں گے تو وہ بھی ان کے باپ کے مال میں سے۔ ویری سیڈ امی جان! یہ تو انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اپنی مردانگی ختم کر لی۔ آپ نے بھائی جان کو ختم کر دیا۔ اب وہ ساری زندگی اپنی مرضی سے اپنی خوشی سے کچھ بھی نہیں کر سکیں گے، سب کچھ بھابھی کی وجہ سے بھابھی کے دم سے اور بھابھی کے حکم سے ہو گا۔ امی! آپ نے بڑے کھانے کا سودا کیا ہے۔ اب خود کو ان چند روزہ خوشیوں کا

## قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی بے معلومت میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے مرتی سے محفوظ رکھیں

تاوان دینے کے لیے بھی تیار لیں۔ اس کا چہرہ حد درجہ سنجیدہ اور افسردہ ہو گیا تھا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو۔ ابرار کی جگہ کوئی بھی ہوتا جو بھی نایاب سے شادی کرتا، سارا کچھ اسی کا ہونا تھا اور اس میں کیا برائی ہے۔ انہوں نے ہمیں اپنی بیٹی بھی تو دی ہے۔ اب اگر ہمارا بیٹا ان کا بازو بنے گا تو ہمیں اس بات کی خوشی ہونی چاہیے۔“

”امی جان! آپ کو کچھ بھی اندازہ نہیں۔ کیا ابرار بھائی اب یہاں رہ سکیں گے، کبھی نہیں۔ ماموں نے ان کو خرید لیا ہے اور آپ نے بڑی خوشی سے انہیں بیچ دیا ہے۔ امی! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، ایک تو پہلے ان کی خواہش اور خوشی کا گلا گھونٹا آپ نے دوسرے ان کے ساتھ یہ ظلم کر دیا۔“ وہ افسوس سے سر ہلائے جا رہا تھا۔

”ماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا، اگر انہوں نے ابرار کو گھر دامادی بنانا ہوتا تو بیٹی کو ادھر رخصت کر کے بھیجتے۔ بے وقوف!“

”صرف اس لیے کہ اب ابرار بھائی اپنی خوشی اور مرضی سے بھابھی کے ساتھ وہاں جائیں گے اور ماموں پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔ وہ اتنے بڑے بڑے بزنس میں ہیں، زندگی کا اتنا بڑا جوا انہوں نے یونہی تو نہیں کھیلا اور آپ کی آنکھیں ان کی چمک دمک میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکیں۔ کچھ بھی نہیں سمجھ سکیں اور حیرت ہے ابو نے آپ کو یہ سب کہیے کرنے دیا۔“ اب اس کا لہجہ عصبیلا ہو چلا تھا۔

”فضول بکواس کیے جا رہے ہو۔ اتنی بڑی نعمت، ہضم نہیں ہو رہی۔ خدا نے بیٹھے بٹھائے سن لی۔ کشمی نے سارے گھر کو روشن کر دیا اور تم جاہلوں کی طرح اپنی مردانگی کا رونا روئے جا رہے ہو۔ پیسے سے بڑھ کر آج کل کوئی مردانگی نہیں جس کے پاس پیسہ ہے۔ دلیری اور بہادری بھی اسی کی ہے ورنہ تو تم جیسے مرد بھی کیڑے مکوڑوں کی طرح دو دو ٹکوں کی نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ان کی مردانگی کا دن رات مذاق اڑایا جاتا ہے۔ کوئی ان کو منہ نہیں لگاتا، تم کس مردانگی کی بات کرتے ہو پیسے کے بغیر خالی جش، یہ ذیل ڈول کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میدان عمل میں نکلو گے تو ماں کی باتوں کو سمجھو گے۔ ابھی تو یہ سب پیٹ بھرے کی باتیں ہیں۔ آنتیں بھوک سے بل کھا رہی ہوں تو یہ سب لفاظی بکواس لگتی ہے۔ ہاتھ میں روٹی نہ ہو تو لوگوں کا ایمان سے یقین اٹھ جاتا ہے۔ لوگ خدا کو بھول جاتے ہیں وہ کیا کہا ہے کسی نے

پھر رکن اسلام اے چھپواں نک

جے نہ ہوئے چھپواں بچوں جان دے مک  
(اسلام کے پانچ رکن ہیں اور چھٹا روٹی اگر روٹی نہ ہو تو ان پانچوں کا وجود ختم ہو جاتا ہے) شکر کرو اللہ کا جس نے گھر بیٹھے بٹھائے اتنے دھن دولت سے نوازا دیا ہے۔ فقیری تو بندے کو کفر کے نزدیک لے جاتی ہے اور آج کل کی سفید پوشی، اللہ میری توبہ اس سے اچھا انسان مر جائے۔“



تائی جی کی آواز بلند ہو گئی تھی اور غصہ ان کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔  
 ”چاہے بھوک کفر کے نزدیک لے جائے یا موت کے۔ میں ایسی روٹی ایسے رزق سے مرنے کو ترجیح دوں گا جو  
 بیوی کے توسط سے مجھ تک پہنچے۔ آپ یہ بات میری لکھ لیجیے۔ چاہے کچھ ہو جائے مجھے ایسی جگہ شادی نہیں  
 کرنی۔ جہاں اپنا آپ بیچ کر چھ مال ملے اور آپ بھی میرے لیے ایسی کوئی کوشش نہ کیجیے گا۔ ایک بیٹے کے  
 بدلے جتنا مال مل گیا ہے۔ وہ آپ کی باقی زندگی کے لیے کافی ہے۔ اسی کو غنیمت سمجھیے گا۔ جیسے اپنے زور بازو کی  
 کمائی چاہیے اور کچھ نہیں۔“ وہ غصے میں آکر کھڑا ہو گیا۔

”دیکھوں گی۔ اس زور بازو کا مان کتنے دن رہے گا۔ ذرا امتحان دے لو۔ نوکری کے لیے جوتیاں چٹخانی پر دیں گی تو خود  
 ہی دماغ ٹھکانے آجائے گا۔“ وہ بھی دوبدو بولیں۔  
 اندر فون کی گھنٹی کافی دیر سے بج رہی تھی وہ ان ماں بیٹے کو یونہی الجھتا چھوڑ کر اندر بھاگی۔  
 ”ہیلو! اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

”ایمن! میں عبیرہ! ایمن! میرا رزلٹ آگیا ہے۔ ایف ایس سی کا۔ سیکنڈ پوزیشن آئی ہے۔ حیدر آباد بورڈ میں۔  
 ابھی بورڈ کے آفس سے آئی ہوں، کل کے اخبار میں تصویر بھی آئے گی۔ چاندی کا میڈل ملا ہے۔ ایمن! میرا میرٹ بن  
 گیا ہے میڈیکل کا۔ ہائے ایمن! آئی ایم سوہیپی۔ میں کیسے بتاؤں تمہیں؟“ عبیرہ نے ایک ہی سانس میں سب کچھ  
 کہہ ڈالا۔

”واقعی! ریٹی عبیرہ! مبارک ہو۔ بہت بہت۔ ہائے میں نے کتنی دعائیں مانگی تھیں کہ تمہارا میرٹ بن جائے۔  
 پاپا کی کتنی خواہش تھی کہ ان کی کوئی بیٹی ڈاکٹر ضرور بنے۔ خدا نے ہماری سن لی، تمہیں پھر مبارک ہو۔“ وہ اونچی اونچی  
 آواز میں خوشی سے بول رہی تھی۔

”ہاں ایمن! خدا نے سن لی ہے۔ اتنی مدت کے بعد خوشی ملی ہے غزالہ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ وہ سب کی دعوت  
 کریں گی اس خوشی میں! ایک دو روز میں۔ تایا جی اور تائی جی کو بتا دینا۔ ضرور آنا ہے اچھا۔“ وہ بہت خوش تھی۔  
 ”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ بالکل آؤں گی۔ عبیرہ! تم فضلہ کو بھی فون کر دینا اور اسے آنے کے لیے بھی کہنا۔ شادی  
 میں بھی نہیں آئی کتنا تایا جی نے اصرار کیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہی چلے۔ عاکف چچا نے ٹال دیا کہ وہ خود اسے کراچی  
 لائیں گے اور خود عین شادی والے دن سنگاپور سے سیدھا ادھر آگئے۔ مجھے اس قدر غصہ آیا کہ بتا نہیں سکتی۔“ وہ  
 ان کے سامنے بول پڑی تھی۔

”عاکف چچا! لاہور کیا دنیا کے نقشے سے باہر ہے۔ آپ نے تو حد کر دی ہے، ہم تو اپنی بہن کی شکل کو ترس گئے  
 ہیں۔ آخر کیا قصور ہے اس کا؟“ وہ سفینہ پھوپھو اور تایا جی کا لحاظ کیے بغیر عاکف چچا سے الجھ پڑی تھی۔  
 ”سوری بیٹا! انیکسٹ ٹائم انشا اللہ چند ہی دنوں میں اسے ضرور لے آؤں گا، تمہیں پتا ہے میں تو بڑی ہوتا ہوں  
 بہت۔ بھائی جان آپ ہی ایمن وغیرہ کو لے آئیں، میں نے تو اتنی دفعہ کہا ہے۔ اب میرا کیا قصور۔“ وہ فوراً ہی اپنے  
 کپڑے جھاڑ کر بے قصور بن گئے۔

”ہاں بھائی! یہ تو زیادتی ہے۔ میں بھی تو مومن کو اتنی دور سے لائی ہوں بہنوں سے ملوانے کے لیے۔ بچے ایک  
 دوسرے کو دیکھ کر ذرا مطمئن ہو جاتے ہیں اور آپ تو ایک بار بھی فضلہ کو یہاں نہیں لائے، ہے نا ایمن۔“ سفینہ  
 پھوپھو نے فوراً اس کی حمایت کی۔ وہ غصے کی وجہ سے ان کی ہاں میں ہاں بھی نہ ملا سکی اور عاکف چچا محض آئیں  
 بائیں شاہیں کرتے رہ گئے۔



”ہاں کروں گی فون فضا کو۔ وہ اٹینڈ کرے گی تو تب ہے نا۔ ستر تو ان کے ملازم ہیں بلائے میں ہی آواہنہ لگا دیتے ہیں پھر بھی آئی سے کہوں گی۔“

”اور مون کو بھی بتاؤ گی۔“ وہ کچھ اٹک کر بولی ایک تو اتنی دور فون کرنا خاصا بڑا خرچہ تھا۔ کم از کم غزالہ آنٹی کے لیے دوسرے شادی میں بھی مون کا رویہ کچھ اجنبی سا کچھ نارمل سا تھا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی اس نے پیپا کی طرح اپنا قد کاٹھ نکالا تھا کہ ایمن نے تو نظر بھر کر نہ اسے دیکھا۔ دوریاں رنگ لے آئی تھیں اس کے رویے میں بہت کرجوشی نہ تھی۔ پھوپھو کو وہ ماما کہتا تھا اور نیناں اور تانیہ کا دلوانہ تھا۔ ایمن کو اچھا نہیں لگا تھا۔

”مون کا مشکل ہے ایسی! پھوپھو کا فون آئے گا تو میں کہہ دوں گی ویسے بھی وہ ابھی تو شادی سے ہو کر گئی ہیں اتنی جلدی اسے کہاں لائیں گی۔“

”چلو ٹھیک ہے“ میں ذرا تائی جی کو بتا کر آؤں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ تم بھی اب بند کرو ٹھیک ہے۔“ اس نے عبیہ کو احساس دلایا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔“ عبیہ نے بھی جلدی سے کہا۔

”خدا حافظ۔“ اس نے ریسیور رکھا اور جلدی سے باہر تائی جی کو بتانے کے لیے باہر کی طرف لپکی۔

♥ ♥ ♥ ♥

اس روز واقعی پارٹی بڑی زبردست ہوئی تھی سب ہی آئے تھے سوائے فضا اور مون کے۔ تایا جی اور تائی جی اور ایمن تینوں درنایاب کی پہچانی گاڑی میں بیٹھ کر آئے تھے۔ لمبی سی گاڑی اور تائی جی کا دور سے لشکر مارے تائیٹ اور کنگن گلوپر سے ان کا رویہ خاصا ڈینٹ سا ہو گیا تھا۔

پارٹی میں سب ہی لوگ ان سے متاثر ہو رہے تھے اور ویسے بھی غزالہ آنٹی کے حلقہ احباب میں کون سے رئیس ابن رئیس آتے تھے۔ اساتذہ کی برادری کب اتنی پر آسائش زندگی گزارتی ہے سفید پوشی کا بھرم ان کے چروں سے عیاں ہوتا ہے۔ کتے ہیں علم کو بہت شرف ہے ایک عالم سو جاہل پر بھاری ہوتا ہے لیکن یہ پرانے زمانوں کی باتیں ہیں۔ آج کل ایک دولت مند صاحب ثروت سو عالم فاضل پر بھاری ہوتا ہے اور عالم تو اپنے مسکین اور سکرے سنے چیلے کی وجہ سے دور ہی سے پہچانا جاتا ہے اور جو دولت اسے کتابیں عطا کرتی ہیں۔ وہ سکے آج کے زمانے میں رائج الوقت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے لیے سوائے شرمندگی کے اور کچھ عطا نہیں کرتے۔ اعلا گریڈ پر فائز پروفیسر اور لیکچرار تو پھر بھی اس Status Conscious Society (سٹیٹس کو آہمیت دینے والی سوسائٹی) میں Move کرنے کے قابل ہوتے ہیں، لیکن عام سرکاری اسکول ٹیچر اپنے بچوں کو سفید پوشی میں لپی عزت کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتے۔ غزالہ آنٹی اور انکل جمال دونوں کی سروس اس بھرم کو قائم رکھنے کے لیے کوشاں تھی۔

شام گئے سب رخصت ہو گئے اسے بہت سے تحائف اکٹھے ہوئے تھے۔ غزالہ آنٹی کی پانچوں بیٹیوں نے علیحدہ علیحدہ گفٹ دیے تھے اسے۔ اس نے بہت چاہا تھا کہ ایمن رات کو رک جائے وہ دونوں ڈھیر ساری باتیں کریں گی لیکن تائی جی نے انکار کر دیا۔ ”پھر اسے لینے کون آئے گا پھر آجائے گی۔ غزالہ! تم عبیہ کو کسی دن لے آنا اور۔“ اب تو ویسے بھی اس کا داخلہ ہو جائے گا اور ہاسٹل میں رہے گی تو کیا شہر تو ایک ہی ہو جائے گا پھر مل لینا۔“

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر گاڑی میں جا بیٹھیں تو ایمن بھی بدولی سے عبیہ سے مل کر ان کے ساتھ جا بیٹھی۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ عبیہ کے مارکس بہت اچھے آئے ہیں۔ اس نے محنت بھی بہت کی تھی۔ خدا نے محنت کا پھل دے دیا اب آگے کی سوچو۔ غزالہ! کیا اس کا میڈیکل میں ایڈمیشن ہم انورڈ کر سکتے ہیں۔“ وہ غزالہ آنٹی کو

بلائے آئی تھی کہ مل کر تحائف کھولتے ہیں دروازے کے باہر ہی انکل جمال کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ ”وہ تو جمال ٹھیک ہے، ہم انورڈ نہیں کر سکتے لیکن یہ بھی تو دیکھیں نا بچی نے کس قدر محنت کی ہے۔ اس کو اگر داخلہ نہ ملا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا اتنی محنت کا نتیجہ یوں لا حاصل تو نہیں ہونا چاہیے۔“ غزالہ آنٹی بولیں۔

”لا حاصل کیوں میڈیکل کے علاوہ بھی تو بے تحاشا فیلڈ ہیں ایم ایس سی ہے۔ لیکچرر شپ ہے۔ میڈیسن کا شعبہ ہے۔ ایم فارمیسی ہے۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر کی فیلڈ ہے۔ جس میں چاہے گریجویشن کے بعد آگے پڑھ سکتی ہے۔ تمہیں پتا ہے نائڈیشن کے لیے پیسوں کی نہیں ہزاروں روپوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہاسٹل کے اخراجات اور کتابوں کا خرچ ہم کیسے برداشت کریں گے۔ پھر ریجہ کی شادی بھی کرنی ہے دو چار ماہ میں۔ آخر ہم اس کے سسرال والوں کو کب تک ٹال سکتے ہیں، چھ بیٹیاں ہیں۔ اب تک تو کم از کم دو تین کی شادیاں کر دینی چاہیے تھیں۔ ریجہ کو گریجویشن کیے چار سال ہو گئے ہیں۔ اس نے پرائیویٹ ایم اے بھی کر لیا ہے اور ہم ابھی تک اس قابل نہیں ہو سکے کہ کم از کم اس کے ہی ہاتھ پیسے کر سکیں۔ اب جو کچھ اس کے لیے جمع جھٹا ہے۔ وہ ہم عبیہ کی پڑھائی پر لگا دیں تو کیا ریجہ کو ساری عمر کے لیے گھر میں بٹھالیں۔ ریجہ کے بعد تانیہ سال ہونے کو آیا۔ اس کے ایم اے کو اور اب ٹوبیہ گریجویشن کر رہی ہے۔ تم خود سوچو ان کی تعلیم کے اخراجات اور شادیوں کے اخراجات ایک طرف اور عبیہ کی پڑھائی کے اخراجات ایک طرف یا تو چاروں پانچوں کی قربانی دے دو صرف عبیہ کی خاطر۔“

جمال انکل پھر دو راہ پر کھڑے تھے جہاں سات سال پہلے کھڑے تھے۔ ایک طرف اکیلی عبیہ کے مستقبل کا سوال اور دوسری طرف ان کی پانچوں بیٹیوں کے مستقبل کا۔ اور وہ اتنے بے وقوف تو نہیں تھے کہ اس کی خاطر اپنی بچیوں کے مستقبل کو تباہ کر دیتے۔ غزالہ آنٹی بھی خاموش تھیں۔

”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“ وہ کچھ دیر بعد پھر بولے۔

”نہیں آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔“ غزالہ آنٹی کی آواز بے جان تھی جیسے کھینچ کر نکال رہی ہوں۔ ”آج بھی ریجہ کی ساس پوچھ رہی تھی کہ کب ڈیٹ لینے آؤں۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ چند دن تک میں فون کر کے بتا دوں گی۔“

”مٹنی کو دو سال ہونے کو آئے وہ بھی کب تک صبر کریں۔“

”میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ عبیہ مجھے بہت پیاری ہے اور پھر جس طرح اس نے ان سات سالوں میں ہمارے گھر میں خود کو ایڈجسٹ کیا ہے۔ سب گرمی سردی سہی ہے پھر پڑھائی میں بغیر ٹوشن اور کسی قسم کی مدد کے خود ہی اتنے اچھے مارکس لے لیے ہیں۔ وہ مجھے اپنی بچیوں سے زیادہ عزیز ہو گئی ہے۔ ان پانچوں نے ماں باپ کی شفقت اور محبت کے ہوتے ہوئے بھی اسٹڈیز میں کتنی کوئی نمایاں کارکردگی نہیں دکھائی اور عبیہ نے اتنی بڑی محرومی کا جس بہادری سے مقابلہ کیا ہے۔ میں اس بچی کا دل سے قدر دان ہو گیا ہوں لیکن غزالہ! میں کیا کروں۔ میں مجبور ہوں۔ میرے پاس فقط یہ تین کمروں کا گھر ہے اس کے علاوہ اگر کچھ ہو تا تو میں عبیہ کے مستقبل پر قربان کر دیتا۔ بٹ آئی ایم رینلی سوری۔“ ان کا لہجہ حقیقتاً ”افسردہ تھا عبیہ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔“

”کاش ہم اس کی صحیح سے قدر کر سکتے۔“ غزالہ آنٹی آہستہ سے بولیں۔

”تم نے بھائی صاحب سے بات کرنی تھی۔ اپنی مجبوری کا حوالہ دینا تھا۔ تھوڑا بہت وہ ہمیں سپورٹ کریں اس سلسلے میں۔ کچھ ہم جھیل لیں گے میں ایک ڈیویشنز اور کر لوں گا۔ چند سالوں کی وقت ہوگی۔ آگے انشا اللہ حالات بہتر ہو جائیں گے اور کچھ نہیں تو وہ ہاسٹل کے بجائے عبیہ کو اپنے گھر میں رکھ لیں تو بھی خاصا خرچ بچ جائے گا۔“

جمال انکل نے کچھ دیر بعد کہا۔



”آپ کے کہنے سے پہلے میں دونوں سے بات کر چکی ہوں، انہوں نے صاف ہی کہہ دیا ہے کہ غزالہ یہ بات طے تھی کہ سب اپنا اپنا بوجھ خود اٹھائیں گے۔ میں نے تو خود ابھی ابرار کی شادی کی ہے، اس میں ہی لاکھوں روپے اٹھ گئے ہیں۔ اب تو میرے پاس کچھ نہیں۔ دوسرے ایمین کی بات اور ہے، وہ شروع سے رہ رہی ہے، میرا بیٹوں والا گھر ہے ایمین کی بھی ٹکرانی اس کی تائی سائے کی طرح کرتی ہے۔ اس پر عبیدہ کا آجانا۔ سوری تم خود ہی کچھ کر لو۔ باشل میں اگر وہ رہے تو زیادہ اچھا ہے ہمارے حق میں بھی اور اس کے حق میں بھی۔“ غزالہ آنٹی نے شام کو کتنی دیر تلیا جی سے علیحدگی میں بیٹھ کر یہی باتیں کی تھیں۔

”ہوں تو ان سے کہتا تھا کہ وہ سکندر کے گھر کا کرایہ ہے اتنے سال ہونے کو آئے اسی میں سے کچھ کر دیں۔ اتنے سالوں سے بھی تو وہی وصول کر رہے ہیں، ہم نے کبھی پوچھا تنگی ترشی کے باوجود۔“

”میں نے یہ بھی کہا تھا کہ لگے ہاؤس بلڈنگ والوں کی قسطیں ابھی تک ادا کر رہا ہوں۔ سارا تو اس میں نکل جاتا ہے پھر تین بار گھر کی مرمت کروائی ہے، دوبار گھر کو پینٹ کروایا ہے۔ مجھے تو اپنے پتے سے لگانا پڑ رہا ہے۔ اس سے تو اچھا تھا میں اسے بیچ ہی دیتا۔ کچھ ہاتھ تو آتا۔ میں تو خود پریشان ہوں۔ تمہاری کیا مدد کروں گا۔ آج کل میں ریشائزڈ ہونے والا ہوں، ابرار نوکری سے استعفیٰ دے بیٹھا ہے۔ پتا نہیں اب کیا کرے گا۔ ولید کی پڑھائی کا ایک سال باقی ہے۔ تم میری پریشانی کا اندازہ کر سکتی ہو۔ میں کسے اپنے دکھ سناؤں؟ میں تو پھر چپ کر کے اٹھ گئی۔“ غزالہ آنٹی بولیں۔

”پھر؟“ جمال انکل کا لہجہ سوالیہ تھا۔

”پھر کیا؟“ وہ لا جواب ہو کر بولیں۔

”کوئی صورت نہیں ہے اور۔“ وہ خود سے بولے۔

”اگلے ہفتے تک ربیعہ کی ساس پھر فون کر دے گی اور اب کے میں اسے ٹال نہیں سکوں گی۔“ کتنے جان لیوا مسائل تھے۔ اسے تو کچھ خبر نہ تھی۔

”پھر وہی مسائل۔ کسی ایک کے مستقبل کے لیے ہم ان پانچوں کے مستقبل کو تاریک نہیں کر سکتے۔ تم کل پرسوں خود ہی ربیعہ کی ساس کو فون کر کے آنے کا کہہ دو۔ کم از کم ایک فرض سے تو بسکدوش ہوں۔ میرا تو ان ہی سوچوں نے دماغ خراب کر دیا ہے اب سب کام اللہ پر چھوڑ دو۔ عبیدہ سے کہو وہ سیدھا سیدھا الیس سی میں ایڈمیشن لے لے، بے شک اسے سب صورت حال بتا دینا۔ سمجھ دار ہے مان جائے گی۔“

کیا صرف وہی سمجھ دار تھی۔ کیا سارے سمجھ دار ہی عذابوں سے گزرتے ہیں۔ پہلے کتنے جبر کے دوزخ تھے جن سے وہ گزر کر آئی تھی۔ اب خوشی کا کوئی جھوٹا آقا محسوس ہوا تھا تو حکم ہوا کہ ہوا کا ادھر سے گزر ہی بند کر دیا جائے۔ اگر کوئی آس کوئی امید کھلنا بھی چاہے تو ہوا کے بغیر دم گھٹ کے مر جائے۔

وہ مرے مرے قدموں سے اوپر بنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت وہی کمرہ خالی مل سکتا تھا۔ نیچے تو وہ پانچوں سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ خوش گپیوں کا دور چل رہا تھا۔ وہ اس وقت کسی کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔

اور ہوا چل رہی تھی۔ وہ آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ آسمان تاروں سے جگمگا رہا تھا۔

”خوشی بڑی خوشی، اتنا بڑا خواب جو پورا ہونے کے نزدیک آیا تو اسے یوں اپنے ہی قدموں تلے پھل دوں۔ اسے ٹھوکر مار دوں۔ اپنی ہی خواہش کا مذاق اڑاؤں۔ اسی چھت پر ان ہی سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں نے آدھی آدھی رات تک اپنا مغز کھپایا تھا، کتابیں رٹ رٹ کر آنکھوں کے کٹنے ہی خواب سجالیے تھے اور جب ان خوابوں کے حقیقت ہونے کا وقت آیا تو میں خود ہی دستبردار ہو جاؤں۔“

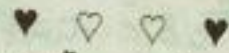
میرے اللہ یہ کیا امتحان ہے؟“ اس کی آنکھیں بھر آئیں، اس نے سر اٹھا کر ستاروں بھرے آسمان کو شکایتا

دیکھا۔

یہ محض آٹونہ کھانے کی بات تو نہیں یا طبیعت پر جبر کر کے وال کھانے کی بات تو نہیں۔ زمین پر سونے کا معاملہ بھی نہیں۔ اگر پیار سے نفس کو، جسم کو سمجھایا جائے تو جسم بہت سی قربانیاں دینے پر رضامند ہو جاتا ہے لیکن اگر نفس کی خواہش کو ہی برباد کرنے کا حکم دے دیا جائے تو بہت دور تک اور بہت دیر تک توڑ پھوڑ ہوتی رہتی ہے اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ توڑ پھوڑ کے بعد اندرونی بندہ جی بھی سکے گا یا نہیں، یا وہ اپنی مسخ شدہ شکل سے گھبرا کر خود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا۔ اتنی بڑی خوشی سے دستبرداری کے بعد کیا میں اتنی زندہ دلی اتنی ولولہ انگیزی سے جی سکوں گی؟ کبھی نہیں۔

”میرے خدا میں کیسے خود کو تیار کروں اس قربانی کے لیے۔ پانچوں کے لیے ایک کے مستقبل کو تاریک کر دیا جائے آخر میں ہی کیوں؟ میری ہی خواہشوں کو پیار مصلوب کیا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ میرے ماں باپ نہیں۔ کوئی ایسا خیر خواہ نہیں تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ میرے اللہ مجھ سے تو یہ کہا گیا تھا کہ محنت کرو پھل ملے گا میں نے تو پوری نیک نیتی خلوص دل سے محنت کی اور مجھے یہ پھل مل رہا ہے کہ نعمت دے کر مجھ سے چھینی جا رہی ہے، بلکہ اپنی خوشی سے لوٹا دینے کو کہا جا رہا ہے۔ میرے اللہ کوئی رستہ نکال کوئی سبیل، کوئی آس میری خوشی میری خواہش پوری کرنے کا پھر میں آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔ اپنے لیے تو بالکل نہیں۔“ وہ دعا کرتے کرتے رونے لگی۔

”مجھے اپنے پیارے بندوں کا واسطہ میری دعا قبول فرمائے، وہ کر دے جو میرے حق میں بہتر ہے۔ میری خواہش پوری فرمادے۔ کہیں سے اتنے پیسے آجائیں کہ مجھے داخلہ مل جائے، اللہ میاں میری دعا پوری فرمادینا۔“ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر آنسوؤں کی بہتی لڑیوں کے ساتھ دعا مانگنے لگی۔



”عبیدہ! کون سے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لے رہی ہو۔ تم نے بتایا ہی نہیں اتنے دن ہو گئے میں انتظار ہی کرتی رہی۔ آج بھی بڑی مشکل سے تائی جی کی منت کر کے ان کے ساتھ آئی ہوں۔ تمہیں تو ذرا خیال نہیں آیا اور فون بھی تو غزالہ آنٹی کا ٹھیک نہیں تھا۔“

تمنائی ملتے ہی ایمین بولتی چلی گئی، آدھ گھنٹہ پہلے ہی وہ تائی جی کے ساتھ آئی تھی۔ چائے پی کر اس نے کوئی دس دفعہ عبیدہ کو اشارے سے کہا باہر چلو۔ عبیدہ ڈھیٹ بن کر بیٹھی رہی جیسے اسے ان اشاروں کو سمجھ ہی نہ پڑ رہی ہو، آخر تنگ آکر وہ خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور غزالہ آنٹی سے کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔

”تمہیں پتا ہے تائی جی مجھے صرف ایک گھنٹے کے لیے لائی ہیں۔ ابھی وہ جانے کے لیے شور مچا دیں گی۔ اور تم انجان بن کر بیٹھی ہوئی تھیں۔“ وہ باہر آکر خفگی سے بولی۔

”اے بی! تمہیں پتا ہے اگلے ماہ ربیعہ کی شادی ہے۔ پچیس تاریخ کی ڈیٹ رکھی ہے، بڑی مصروفیت رہی ہے اسی لیے تو فون نہ کر سکی اور آگے بھی مصروفیت ہے۔“ وہ اس کی باتوں کو نظر انداز کر کے بولی۔

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ ابھی تو غزالہ آنٹی بتا رہی تھیں تمہارے سامنے تائی جی کو۔ ویسے انہوں نے فون کر کے بھی بتا دیا تھا۔ اس میں کون سی نئی بات ہے بھلا؟“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”میں کیا پوچھ رہی ہوں تم وہ بتاؤ کون سے کالج میں ایڈمیشن لے رہی ہو۔ میں آج اسی لیے آئی ہوں۔ میں نے تائی جان سے بات کر لی ہے، وہ تمہیں اپنے گھر میں رکھنے پر راضی ہو گئی ہیں۔ اب تمہیں باشل میں نہیں رہنا پڑے گا کیسا؟“ وہ خوش ہو کر اس کے آگے ہاتھ پھیلا کر بولی کہ عبیدہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارے۔

”بے کار!“ وہ اس کا ہاتھ نظر انداز کر کے لاپرواہی سے بولی۔



”کیا مطلب؟“ ایمن نے آنکھیں پھیلانیں۔  
 ”اس لیے کہ میں کسی میڈیکل کالج میں ایڈمیشن نہیں لے رہی۔ ادھر اپنے ہی کالج میں بی ایس سی میں ایڈمیشن لے چکی ہوں۔ اب تو کلاسز بھی شروع ہو چکی ہیں۔“ وہ بڑے آرام سے بولی۔  
 ”عبیرہ! تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا، کیا بکواس کر رہی ہو۔“ ایمن اچھل ہی پڑی غصے سے اونچی آواز میں بولی۔

”آہستہ بولو! ایسا کیا غضب ہو گیا کہ تم اچھل ہی پڑی ہو۔“ عبیرہ کچھ ناگواری سے بولی۔  
 ”غضب؟ ابھی کیا غضب میں کسرا رہی ہے۔ تم کیا کہہ رہی ہو کہ تم نے میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں لینا۔ تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے کیا مجھے غلط سنائی دیا ہے۔“ وہ تیز لہجے میں بولتی چلی گئی۔  
 ”نہ تو میرا دماغ خراب ہوا ہے نہ تمہیں غلط سنائی دیا ہے۔ کیونکہ مجھے میرٹ بنانے کا شوق تھا، لیکن میڈیکل میں آگے جانے کا شوق نہیں تھا۔ بی ایس سی کے بعد میں ایم فارمیسی کروں گی۔ مجھے میڈیسن کی لائن پسند ہے۔ ویری سہل۔“ اس کا لہجہ ہنوز بے نیاز سا تھا ایمن کو غصہ آگیا۔

”عبیرہ! دیکھو! میرا دماغ الٹ جائے گا۔ مجھ سے صاف بات کرو کہ کیا بات ہے۔ تم کیوں ایڈمیشن نہیں لے رہیں۔ کیا تمہیں غزالہ اتنی نے منع کیا ہے یا انکل جمال نے۔ مجھے سب بتاؤ۔“  
 ”مجھے کوئی کیوں منع کرے گا بھلا۔ تم تو پاگل ہو ای! دیکھو جو بات ہے وہ میں نے تمہیں بتادی ہے۔ یقین کرو میں خود یہ سب چاہ رہی ہوں میڈیسن مجھے پسند ہے۔ ایم بی بی ایس کر بھی لوں تو پھر ماؤس جاب کی خواری وہ بھی ہو گیا تو جاب کا مسئلہ تمہیں پتا ہے آج کل سب سے زیادہ بے روزگار ڈاکٹرز ہیں۔ اتنا سرمایہ جھونک کر اگر مجھے دھکے ہی کھانے ہیں تو کیا فائدہ؟ اس لیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے؟“ اس کا انداز حتمی تھا۔

”عبیرہ! مجھے تنگ نہیں کرو مجھے صاف بات بتاؤ۔ تم اتنا بڑا ظلم خود پر مجھ پر کیوں کر رہی ہو اور جہاں تک تمہارے شوق کا سوال ہے۔ مجھے معلوم ہے نامعلوم کتنے سالوں سے تمہاری آنکھیں یہ خواب بن رہی تھیں کہ تم ڈاکٹر بنو گی۔ پیپا کا خواب پورا کرو گی اور جس روز رزلٹ کا تم نے مجھے فون پر بتایا۔ اس روز بھی تم نے اس خواب کے پورا ہونے پر خدا کا شکر ادا کر رہی تھیں پھر یہ اچانک فیصلہ اور خواب میں تبدیلی کیونکر؟ تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟ مجھے صاف صاف بتاؤ۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر ذرا نرم آواز میں اس کے پاس بیٹھ کر بولی۔

”ای! میری بہن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی مجھے مجبور نہیں کر رہا۔ میں اپنی خوشی سے اپنے ارادے سے ایسا کرنا چاہ رہی ہوں اور ضروری ہے کہ مرے ہوؤں کی سب خواہشیں پوری کی جائیں۔ زندہ لوگوں کے اور زندگی کے بھی بہت سے تقاضے ہوتے ہیں جو مرے ہوؤں کی خواہشوں سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔“ اس کی آواز مدہم تھی۔

”بکواس کر رہی ہو تم۔ تم ایسا اپنی خوشی سے نہیں کر رہیں تمہاری خواہش کو اپنی مرضی سے ٹھوکر نہیں لگا سکتیں اور میں تمہیں ایسا کرنے بھی نہیں دوں گی۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں آج کے بعد تمہاری شکل بھی نہیں دیکھوں گی۔ یہ تم سوچ لو۔ تم سب کچھ کی جگہ کے تحت کسی مجبوری کی وجہ سے کر رہی ہو۔ اگر تم مجھے کچھ نہیں بتاؤ گی تو قسم سے میں تمہاری شکل آج کے بعد نہیں دیکھوں گی اور نہ تم مجھے دیکھ سکو گی بولو۔“ وہ یکدم جوش اور غصے سے کھڑی ہو گئی۔

”ای! کیا ہو گیا ہے تمہیں بات بات پر قسم کھانا، جھوٹوں کا شیوہ ہوتا ہے اور ایسی کیا بات ہے جو میں تم سے چھپاؤں گی۔ میرا تمہارا رشتہ ایسا ہے جو مر کر بھی نہیں ٹوٹ سکتا کہ مرنے کے بعد بھی لوگ ہمیں ایک دوسرے کی بہن کے نام ہی سے پکارتے ہیں۔ اس لیے ایسی جذباتی گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔“ اس کا لہجہ ہنوز ٹھنڈا تھا جو

ایمن کو سلگا گیا۔  
 ”مگر تم مجھے نہیں بتانا چاہتیں تو پھر گو ٹو ہیل۔ آج کے بعد مجھ سے کلام نہ کرنا۔ میں کہہ رہی ہوں اگر تمہیں میرا پایا کا ماما کا ذرا بھی خیال ہے تو تم اپنے فیصلے کو بدل لو گی کل مجھے فون کر کے بتا دینا۔ میں جا رہی ہوں اگر تم نے ایسا نہ کیا تو دوبارہ ادھر کبھی نہیں آؤں گی۔ خدا حافظ۔“  
 وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ عبیرہ نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش نہیں کی۔ اسے پتا تھا کہ وہ اس وقت شدید غصے میں ہے اس کی ایک نہیں سننے کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد تائی جی اور آنٹی غزالہ کے الوداعی کلمات باہر سے سنائی دیے اور وہ تو کرسی پر کسی بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ خاموشی سے ان کے جاتے قدموں کی آہٹ سنتی رہی اور جب دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے کرسی کی پشت سے سر نکالا دیا۔

عاکف چچا سنا پور گئے تھے شادی کی تاریخ آئی بھی اور گزر بھی گئی۔ وہ اگلے روز واپس آئے وہ اداس و ملول لان میں بیٹھی تھی جب ان کی گاڑی پورچ میں آکر رکی۔ اگرچہ دل تو نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی وہ یونہی اٹھ کر ان کی طرف چل پڑی۔  
 ”اے السلام علیکم عاکف چچا!“ اس نے کچھ بے دلی سے سلام کر کے پاس سے گزر جانا چاہا۔  
 ”و علیکم السلام کیسی ہو فضہ! ٹھیک ہو؟ ایسے کیوں بیٹھی تھیں لان میں اندر چل کر بیٹھو۔“ ان کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔

”بس یونہی۔“ وہ جب خوش ہوتے تھے تو ایسے ہی اس کی فکر کرتے تھے۔  
 ”کھانا کھا لیا تم نے۔“ وہ جب خوش ہوتے تھے سنا پور۔ ”ان کی مسکراہٹ اس کا حوصلہ بڑھا گئی۔  
 ”نہیں ابھی تو نہیں۔ آپ کہاں گئے ہوئے تھے سنا پور۔“ ان کی مسکراہٹ اس کا حوصلہ بڑھا گئی۔  
 ”ہاں وہیں گیا ہوا تھا، کل صبح اچانک یاد آیا کہ آج تو ابراہار کی شادی ہے بھائی صاحب تو سخت خفا ہوں گے۔ بس مت بوجھو جس طرح ٹکٹ ملی رات آٹھ بجے کی فلائٹ سے کراچی پہنچا۔ بارات روانہ ہو رہی تھی پھر بھی شکر ہے ٹائم پر پہنچ گیا۔ سب ہی آئے ہوئے تھے سب نے تمہارا پوچھا میں نے کہا مجبوری تھی میں خود آنا بھول چکا تھا ورنہ تمہیں ضرور لے کر آتا۔ ایمن تو باقاعدہ مجھ سے لڑنے لگی۔ وہ شروع ہی سے منہ پھٹ اور ذرا بد لحاظ سی ہے سفینہ نے اسے ڈانٹا۔ میں اس سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ انشا اللہ چند ایک روز میں تمہیں لے کر ضرور آؤں گا کراچی۔  
 اب تم تیاری رکھنا کسی روز چلیں گے۔ چلو آؤ کھانا کھاتے ہیں بڑی بھوک لگی ہوئی ہے۔“

وہ اپنی روانی میں اسے سب کچھ بتاتے ہوئے اندر کی طرف بڑھے اور وہ تو پتھر کی طرح ساکت ہو چکی تھی۔ عاکف چچا کراچی سے ہو بھی آئے مجھے لیے بغیر ایک پھانس اس کے حلق میں انک گئی۔ آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ وہ بے حس کھڑی انہیں جاتا دیکھتی رہی وہ پیچھے آتے ڈرائیور سے معمول کے انداز میں باتیں کرتے ہوئے اندر چلے گئے۔ کھڑے کھڑے ایک دم سے اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ گلا خشک ہو گیا۔ ٹانگوں سے جیسے جان نکل گئی۔  
 ”پانی۔ کہیں سے پانی مل جائے۔“ اس نے بڑی کوشش سے گردن ادھر ادھر گھما کر دیکھا۔ خشک حلق سے سانس کی آمدورفت بھی دشوار ہو گئی۔ ایک دم سے اسے زور سے کھانسی آئی اور ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ وہ وہیں پورچ میں گاڑی سے ٹیک لگا کر بے تحاشا کھانستے ہوئے رونے لگی۔ اسے جیسے اپنے اوپر اختیار نہ رہا تھا۔ ہر عمل جیسے بے قابو سا ہو رہا تھا۔ کافی دیر رونے سے اس کا جی تو ہلکا نہ ہوا۔ البتہ وقفہ وقفہ سے کھانسنے کی وجہ سے اس کے جسم میں اکڑاؤ سا پیدا ہو گیا۔ وہ خود کو گھٹیتے ہوئے کوارٹر تک لے آئی۔ شام تک وہ بستر میں بے سدھ



بڑی رہی۔ شام تک اسے بخار ہو گیا تھا۔ پہلے ہی تین چار دن سے سر بھاری اور نزلہ زکام ہو رہا تھا۔ ایک دم سے بخار  
 بجھی ہو گیا، رات کو عبدل کسی کام کے سلسلے میں اسے بلانے آیا تو اسے بے سدھ بڑے دیکھ کر شریفان کو اپنے ساتھ  
 لے آیا۔ وہ اسے زبردستی اٹھا کر اندر کوٹھی میں لے گئی۔ عاکف چچا تو گھر پر نہیں تھے، عبدل ہی جا کر ڈاکٹر سے زبانی بتا  
 کر دوا لے آیا۔

وہ دو تین دن ادھر ہی رہی، دوا کھانے سے خاصا افاقہ ہوا تھا۔ بخار بھی اتر گیا تھا اور کھانسی زکام بھی بہتر ہو گیا تھا۔  
 عاکف چچا ایک دو دفعہ اس سے طبیعت کا پوچھنے آئے تھے، باقی اور کون تھا جس کی اسے فکر تھی۔  
 ”اب میں کبھی کوئی آس، کوئی امید نہیں لگاؤں گی اور نہ کسی سے کوئی فرمائش کروں گی اور کراچی کو بھول جاؤں  
 گی۔“ بیماری کے دوران ہی اس نے خود سے عہد کر لیا۔

اس عہد کی پہلی آزمائش چند روز بعد ہی ہو گئی جب کالج میں ایڈمیشن ہونے لگے۔ عاکف چچا حسب عادت بھول  
 گئے۔ اپنے منیجر سے کہنا اور اس نے بھی انہیں یاد نہ کروایا اور اچھا ہی ہوا یاد نہ کروایا اگر اس کا داخلہ ہو جاتا تو نرگس  
 آنٹی نے خدا جانے کیا طوفان اٹھانا تھا۔ اس کی بیماری اور اداسی برترس کھا کر عاکف چچا نے سنگاپور سے لائے ہوئے  
 سارہ کے لیے چار جوڑوں میں سے ایک اسے دے دیا۔ نرگس آنٹی کو خبر ہو گئی، انہوں نے اس کی حد سے زیادہ بے  
 عزتی کی کہ وہ خاموشی سے سوٹ وہیں کمرے میں رکھ کر واپس کوارٹر میں آگئی۔

اب تو اس اجاڑ ویران اور خوفناک سے ماحول والے کوٹھڑی نما کوارٹر سے اس کو انیسیت ہو چلی تھی۔ یہیں آکر  
 سکون ملتا تھا۔ اگرچہ باہر سے آنے والا اس کے سیلن زدہ ماحول سے گھبرا اٹھتا تھا، لیکن تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ بھی  
 عادی سا ہو جاتا تھا اور اسے تو اب اتنے دن ہو چکے تھے رہتے ہوئے۔

اور دنوں کا کیا ہے۔ وہ تو گزر رہے ہی چلے جاتے ہیں۔ سو دن گزرتے چلے گئے۔ اس کی محرومیوں اور تنہائیوں میں  
 اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اب تو کراچی سے فون آنا بھی کافی کم ہو گئے تھے۔ ہر کوئی اپنی زندگی میں مصروف ہو کر رہ گیا تھا۔  
 اس کے لیے کس کے پاس وقت تھا۔ وہ انیکسی سے مٹی کی کتابیں اٹھالائی تھیں اور ڈکسنری بھی۔ اردو کی ان کی جتنی  
 کلیکشن تھی وہ سب اس نے چند دنوں پڑھ ڈالی تھی۔ بعد میں عبدل کی منت کر کے اس نے انیکسی کھلوائی تھی  
 اور وہاں سے انگریزی کی کتابیں اٹھالائی تھیں۔ شروع شروع میں پڑھنے میں خاصی دقت ہوئی تھی اس کی انگریزی  
 اتنی کون سی رواں تھی ایک ایک لائن پڑھتے ہوئے دس بار ڈکسنری کھولنی پڑتی پھر بھی کئی لفظوں کا مطلب معلوم  
 ہونے کے باوجود جملے کا مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا اور تنہائی میں کچھ اور کرنے کو بھی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ دوسری  
 زبان کے لفظوں اور احساسات کا یہ ہیر پھیر اسے دلچسپ مشغلہ لگا تھا۔ تھوڑی دیر کو اکتاتی اس کے بعد پھر کھول کر  
 بیٹھ جاتی۔ زبان دانی کا مسئلہ اس کے شوق کے آگے زیادہ دیر تک نہ حائل ہو سکا۔

ایک ایک کر کے اس نے انگلش کی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ انگلش لٹریچر انسانی فطرت میں چھپے ابدی دکھوں  
 اور احساسات کی کتنی صحیح ترجمانی کرتا تھا۔ اس کا اندازہ ان ساری کتابوں کو پڑھنے کے بعد اسے ہوا تھا۔ ہارڈی کے  
 ناولز شیکسپیر کے ڈرامے اور کیٹس کی پوسٹری اسے بے تحاشا اپنی طرف کھینچنے لگے تھے۔ وہ بار بار ان کتابوں کو  
 پڑھتی اور ہر بار نیا لطف اٹھاتی۔ انسانوں سے دوری نے اس کی احتیاجات کو بھی خاصا محدود کر دیا تھا۔ اسے اب کئی  
 کئی ہفتے گزر جاتے۔ عاکف چچا سے ملے ان سے بات کیے ہوئے اور اب دل اس بات کی خواہش بھی نہیں کرتا تھا۔  
 اسے انسانوں سے جیسے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ دو ٹائم جا کر وہ شریفان سے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتی  
 اور بس۔ نرگس آنٹی جب اس کی کلاس لیتیں تو وہ دو تین گھنٹے شریفان کے ساتھ کچن میں گزار لیتی، جس طرح  
 دوسروں کی نظر میں اس کی زندگی کا کچھ مقصد نہ تھا۔ اسی طرح دوسروں کی زندگیوں اور ان کے معمولات کا اس کی نظر  
 میں کچھ مقصد نہ تھا۔



سارہ نے انٹر کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ نرگس آنٹی نے اس خوشی میں زبردست فنکشن ارجن کیا تھا۔ وہ رنگ و نور کے سیلاب میں ڈوبے اس نجوم کو وارٹر کی تاریک فضاؤں سے دیکھتی رہی۔ ہلا گلہ شور ہنگامہ زندگی اور زندہ لوگوں کی علامت ہوتی ہے اور وہ تو خود کو جیتے جی مردہ تصور کر چکی تھی۔ پھر ان چیزوں میں اسے کیا پرہیزی کیا کشش محسوس ہو سکتی تھی اور وہ کسی سنڈریلا کی طرح ایسے فنکشن میں جانے کے لیے بے تاب بھی نہ تھی۔

ہاں اگلے روز نرگس آنٹی نے اسے خوب ڈانٹا کہ اس نے رات کا فنکشن کیوں مس کیا۔ اس کے چچا کو اس کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

”میں اور سارہ گیارہ بجے کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہے ہیں، کل شام تک آجائیں گے۔ گھر میں کچھ مہمان ہیں تم ان کا خیال رکھنا اور جا کر اس حجرے میں نہ کھس جانا۔ نوکروں کو من بانیاں کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور اب میں نے سنا کہ تم نے مہمانوں کو ٹھیک طرح سے انٹرٹین نہیں کیا اور اس کو ٹھڑی میں چلی گئیں تو پھر دیکھنا۔ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ حد ہوتی ہے بے حسی اور ہٹلے پن کی بھی۔ پتا نہیں کیا چیز ہو نہ زندوں میں نہ مردوں میں۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی پرس جھلاتی یا ہر چلی گئیں تو وہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

”یہ دنیا کسی کو کسی حال میں کیوں جینے نہیں دیتی؟“ اس نے افسردگی سے سوچا۔ وہ پھر نرگس آنٹی کی بدایت کے مطابق کوٹھی میں رہی۔ ”شریقاں! سب مہمانوں نے کھانا کھالیا؟“ وہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے تھک گئی تو آکٹا کر کچن میں چلی گئی۔

”ہاں جی۔ سب نے کھالیا ہے۔ میں اب برتن اٹھانے جا رہی ہوں۔ وہ ایک مہمان ہیں بیگم صاحب کے وہ انیکسی میں ہیں۔ وہ کچھ دن وہیں رہیں گے انہوں نے کہا تھا کہ ان کا کھانا وہیں پہنچا دیا جائے۔ میں بھول گئی اب یاد آیا ہے۔ آپ بی بی جی! ذرا مہربانی کر دو۔ یہ کھانا انہیں دے آؤ۔“ وہ لجاجت سے بولی۔ بوڑھی ہڈیاں کام کر کر کے تھک گئی تھیں۔ اسے ترس سا آگیا۔ انیکسی کا فاصلہ بھی تو کافی تھا۔ اس نے رُے پکڑ لیا۔

”پتا نہیں کون سا مہمان ہے جو کچھ دن رہے گا۔ خیر مجھے کیا اچھا ہے ادھر آگئی۔ اب جا کر آرام کرتی ہوں۔ فضول ادھر ادھر کے کاموں نے تھکا دیا ہے۔“ وہ سوچتی ہوئی انیکسی کی طرف چلی گئی۔

اس کی دستک پر جس نے دروازہ کھولا اسے دیکھ کر وہ ذرا جھک کر پیچھے ہٹ گئی۔ براؤن پینٹ شرٹ میں ملبوس وہ ایک خوش شکل ہینڈ سم نوجوان تھا۔ اسے بھی شاید ایسی کوئی توقع نہ تھی۔ وہ بھی کچھ حیرانی اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

”یہ کھانا جی!“ اس کی نظروں سے گھبرا کر اس نے رُے آگے کر دی۔

”یہ کھانے کا نام ہے اتنی دیر سے۔ یہاں مہمانوں کی یہی تواضع کی جاتی ہے۔“ وہ خواجہ بگڑ کر بولا۔

”آئی دیر تو نہیں ہوئی۔“ وہ کچھ گھبرا گئی۔ نرگس آنٹی کی دھمکی یاد آگئی تھی۔

”ہاں دیر تو واقعی نہیں ہوئی۔ آپ کون ہیں یہاں ملازمہ ہیں؟“ اس کے سوال پر وہ کنفیوز سی ہو گئی۔ تعارف کے لیے تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے رُے اس کے ہاتھ میں تھمائی اور واپس پلٹ گئی۔ وہ حیران نظروں سے اسے جانتے دیکھتا رہا۔

”عجیب لڑکی ہے۔ کوئی جواب ہی نہیں دیا۔“ اس نے کندھے اچکا کر دروازہ بند کر لیا۔

گھر کا ماحول کچھ دنوں سے کھنچا کھنچا سا تھا۔ تائی جی کا مزاج اب ہر وقت برہم سا رہنے لگا تھا۔ تائی جی کی خاموشی میں لمبے وقفے آنے لگے تھے۔ وہ چپ بیٹھے کئی گھنٹے گزار دیتے۔ ان کی چائے کی پکار بھی خاصی کم ہو گئی تھی کیونکہ اس

پکار کی تکمیل کرنے والوں کی تیوریاں چڑھی رہتی تھیں۔ شادی کو تقریباً دو سال ہونے کو آئے تھے۔ درنایاب کے زیادہ دن اب میکے میں گزرتے تھے جس کی وجہ سے ابرار بھائی بھی اب گھر پر کم ہی نظر آتے تھے۔ دوسرے جب سے انہوں نے کفیل ماموں کا بزنس سنبھالا تھا۔ ان کے پاس وقت خاصا کم ہو گیا تھا۔ سارا دن فیکٹری اور آفس میں گزر جاتا۔ باقی کا وقت کفیل ماموں کی طرف۔ وہ اب گھر کم ہی آتے تھے۔ درنایاب جاتی تو اس کی ملازمہ بھی ساتھ ہی چلی جاتی۔ وہ جاتے ہوئے اپنے لاکھوں کے سامان سے آراستہ بیڈروم کو لاک کر جاتی۔ ویسے اس طرح ہر دوسرے دن میکے جانا کوئی نئی بات تو نہ تھی کیونکہ وہ تو شادی کے شروع دنوں ہی سے ایسے جا رہی تھی اور تائی جی اسے بڑے شوق سے بھیجا کرتی تھیں۔

”بچی کبھی ماں باپ سے علیحدہ نہیں ہوئی۔ او اس ہو جاتی ہے پھر اکلوتی ہے۔ ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اچھا ہے ذرا چلی جاتی ہے۔ تینوں کا دل بہل جاتا ہے۔ والدین کون سا شہر سے باہر ہیں۔ صبح ہے ابرار! تم لے جایا کرو نایاب کو۔“

اور نایاب کو جانے کے لیے ابرار کی محتاجی کب تھی یاوردی ڈرائیور ہمہ وقت لمبی مرسدیز گھر کے گیٹ کے آگے کھڑا رہتا تھا۔ چلو یہ تو شروع کے دن تھے۔ اب تو دو سال ہونے کو آئے۔ اب تو نایاب کو گھر کے ماحول میں مگس ہونا چاہیے یہ تائی جی کا خیال تھا لیکن وہ ابھی تک مہمانوں کی طرح آتی اور چلی جاتی تھی۔ اس کے اس بے حس اور سرد رویے سے تائی جی آکٹانے لگی تھیں۔ کئی بار وہ اسے دیکھ کر بھی نہ دیکھ پاتیں۔ اپنا دھیان خواجہ ادھر ادھر کر لیتیں اسے بھی شاید تائی جی کے اسی رویے کا انتظار تھا۔ اس کا میکے میں قیام طویل ہونے لگا۔ اس نے آتے جاتے اب تائی جی سے پوچھنے کا تکلف بھی چھوڑ دیا اور ابرار آفس سے ہی فون کر کے پوچھ لیتا کہ نایاب کہاں ہے۔ وہ جہاں ہوتی وہ وہاں ہی چلے جاتے۔

ولید کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی لیکن ابھی جاب نہیں ملی تھی۔ تائی جی اگلے سال ریٹائرڈ ہو رہے تھے ابرار بھائی نے جب سے نوکری چھوڑی تھی تب سے وہ بالکل ہی فارغ ہو گئے تھے ہر قسم کے احساس ذمہ داری سے۔

گھر کی کمائی میں فرق آیا تھا۔ کھانے والوں میں تو کوئی کمی نہ ہوئی تھی لیکن کابجٹ تائی جی کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ بجٹ قابو میں آجاتا تو بجلی گیس اور فون کے بل بس سے باہر ہو جاتے اور وہ سب کچھ مین مین رکھنے میں لپکاں ہو جاتے۔ اٹھتے بیٹھتے ابرار کو سناتیں وہ اس کان سے سنتے دوسرے سے اڑا دیتے۔ سونے کی کان پر بیٹھ کر وہ نوالوں کو ترسنے لگی تھیں۔ پہلے ابرار بھائی آٹھ نو ہزار پہلی کی پہلی ان کی ہتھیلی پر لا دھرتے تھے اب نظریں ملانے سے بھی گئے تھے کتنے مہینوں سے انہوں نے تائی جی کو ایک روپیہ بھی نہیں دیا تھا۔ ولید کی بے کاری بڑے بیٹے کی لا پرواہی تائی جی کو بیمار کرنے کے لیے کافی تھی۔

اور بے چارے ابرار بھائی کا بھی کیا قصور تھا۔ ان کے نیچے دس لاکھ کی گاڑی ہوتی اور ذہن میں لاکھوں کے کاروباری پراجیکٹس اور پرافٹ کے کھاتے اور والٹ میں دو تین سو سے زائد کچھ نہ ہوتا تھا۔ انہیں چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا چیک کیش کروانے کے لیے نایاب کے سامن درکار ہوتے تھے اور درنایاب کسی بھی چیک کی وجہ تصرف جانے بغیر سامن نہیں کرتی تھی۔ اس محتاجی نے جیسے انہیں اندر ہی اندر سے توڑ ڈالا تھا۔ کہاں ہزاروں کی نوکری تھی اپنے ہاتھ کا راج تھا اور کہاں اب ایک ایک دھیلے کے لیے انہیں بیوی کی جنبش قلم کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ اس وقت انہیں اپنا آپ بے حد چھوٹا اور ذلیل محسوس ہوتا تھا اور جب تائی جی کی نظریں ان سے سوال کرتیں تو کندھوں کے ساتھ ان کا سر مزید جھک جاتا۔ اسی شرمندگی سے بچنے کے لیے انہوں نے زیادہ تر کفیل ماموں کی طرف ہی رہنا شروع کر دیا تھا۔

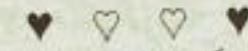
ان ہی دنوں کفیل ماموں نے انہیں اپنے گھر کے ساتھ ڈیفنس کی کوٹھی کی چابیاں دی تھیں۔ جو نایاب کے نام



تھی۔ نایاب اور ماموں کے اصرار پر وہ ان دنوں اس کوٹھی میں شفٹ ہونے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ مگر تائی جی سے بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اور تائی جی کی آنکھوں میں اب ہلکے ہلکے پچھتاوے ہلکورے لینے لگے تھے انہیں اب صاف نظر آ رہا تھا کہ انہوں نے گھائے کا سودا کیا ہے۔ ہاتھ تو کچھ آنا نظر نہیں آ رہا تھا۔ الٹا بیٹا بھی ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ وہ دن بدن چڑچڑی ہوتی جا رہی تھیں، ان کی چڑچڑاہٹ کا شکار ایمن ہی ہو رہی تھی۔ تائی جی کی وجہ سے اس نے پچھلے سال یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لیا تھا۔ اب جو گھر کے حالات اچھے خاصے تناؤ کا شکار تھے۔ اس نے چپکے سے نایاب جی سے کہہ کر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ تائی جی کو پتا چلا تو وہ خوب برہم ہوئیں۔ سب کا غصہ انہوں نے اس پر اتارا۔ وہ بھی چپنہ رہی۔

یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے جو میں ڈروں۔ ڈریں وہ جو کوئی جرم کرتے ہیں یا گناہ کرتے ہیں، آپ ہر بات کا غصہ مجھ پر نہ اتارا کریں۔ میرا کوئی پوچھنے والا نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں آپ بالکل ہی مجھے ذلیل کر کے رکھ دیں۔ جتنا کام یہاں رہنے کے بدلے میں آپ مجھ سے کروائی ہیں۔ اتنے میں آپ کو دو تین ملازم رکھنے پڑ جائیں تو پھر پتا چلے اگر مجھے رکھ رہی ہیں یا سرپرستی کر رہی ہیں تو مجھ پر کوئی احسان نہیں کر رہیں ہونہ۔

وہ زور زور سے کہتے ہوئے پیرٹ کر کمرے سے چلی گئی اور تائی جی حیرت اور غصے سے اس بے زبان ایمن کو دیکھتی رہ گئی۔ جس نے کتنے سالوں بعد ان کے آگے زبان چلائی تھی اور وہ جواباً اس جتنا چیخ بھی نہ سکی تھیں نہ دوڑ کر اسے پکڑ کر دو ہاتھ ہی لگا سکی تھیں وقت وقت کی بات ہے جب اپنی ہی اولاد منہ کو آ رہی ہے تو یہ تو پھر...؟ انہوں نے تھک کر گہرا سانس لیا۔



اس کا نام رہبر بردانی تھا وہ آنٹی نرگس کے کسی کزن کا بیٹا تھا۔ سی ایس ایس کے پیر زدینے ادھر آیا تھا۔ تقریباً مہینہ بھر اس کا رہنے کا ارادہ تھا۔ نرگس آنٹی اور عاکف چچا اس کے آگے کچھ بچہ جا رہے تھے۔ ان سب باتوں کا پتا اسے اگلی رات کھانے کے دوران پتا چلا وہ شریفان کے ساتھ پکن میں کام کروا رہی تھی۔ کھانا سرو کر دیا گیا تھا اس نے چپکے سے اپنا کھانا نکالا اور ٹرے میں رکھ کر اس نے شریفان کو بتایا اور پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ یہ تو بارش شروع ہو گئی۔ آسمان بادلوں سے اٹا پڑا تھا اور دھواں دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔ سرما کی پہلی بارش تھی اس نے بھاگ کر لان عبور کیا۔ کوارٹر تک جاتے جاتے وہ مکمل طور پر بھگ چکی تھی اس کے کپڑے بارش میں شرابور ہو چکے تھے۔ اندر کوٹھڑی کا بلب بھی فیوز تھا اس نے ٹرے چارپائی پر رکھی اور ٹرنک میں سے کپڑے نٹولنے لگی۔

کپڑے بدلتے بدلتے اس کا جسم سردی سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ پرانی روٹی کا بے جان سالخاف اس کے سرد جسم کو گرم کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ لحاف کے اندر وہ کپکپا رہی تھی۔ سردی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ کوارٹر کی کھڑکی بھی کھلی تھی جس میں سے شائیں شائیں ہوا آ رہی تھی اور اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر اسے بند ہی کرے۔

”یا اللہ کوئی آجائے۔“ اس نے کانپتے ہوئے دعا کی قبولیت کی گھڑی تھی اسی وقت کوارٹر کا دروازہ کھول کر عبدل اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کرنا بھی بھول گئی تھی۔

”فضہ! فضہ! کراچی سے تمہارا فون آیا ہے۔“ عبدل نے اسے پکارا۔ وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہے پکارا پھر واپس جائے لگا جب اس نے بمشکل آواز دی۔

”عبدل چاچا! میں ادھر ہوں۔“

”میں کب سے تمہیں بلا رہا ہوں۔ تمہارا فون آیا ہے۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ مجھے یہاں سے لے جاؤ۔“ اس کے وانت بج رہے تھے۔

”تو کس پاگل نے کہا تھا۔ اس بارش میں ادھر آنے کو۔ میں شریفان کو لے کر آتا ہوں۔ ویسے چلنا ہے تو میرے پاس چھتری ہے۔“ اس نے کچھ جواب نہ دیا تو وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

جب شریفان اسے سہارا دے کر اندر لائی فون بند ہو چکا تھا، عاکف چچا اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

”کیا ہوا فضہ کیا ہوا؟“

”پتا نہیں صاحب جی! سردی سے تھر تھر کانپ رہی ہے۔ نیلی ہوئی پڑی ہے۔“ شریفان بولی۔

”بارش میں بھیگی ہوگی۔“ وہ تشویش سے بولے۔

”کووارٹر میں جو گئی تھی۔ ابھی تو ٹھیک ٹھاک تھی۔ میرے سامنے گئی ہے۔ عبدل بلائے گیا تھا تو یہ حالت تھی۔“

”ہزار بار کہو اس کی ہے۔ ادھر نہ جایا کرو۔ وہ کوئی انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے پر بڑی ڈھیٹ ہو۔ سنتیں نہیں۔“

چلو اسے ابھی مئی والے کمرے میں لے جاؤ۔“ وہ شریفان سے بولے۔

عبدل ڈرائیور کے ساتھ جاکر ڈاکٹر کو لے آیا۔ تھوڑی دیر میں وہ بخار میں بے سدھ پڑی تھی۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح چیک اپ کیا۔ دوائیں دیں انجکشن لگانے کی وجہ سے تھوڑی دیر بعد اس کا جسم کچھ نارمل ہو گیا۔ اگلے دن بخار کی وجہ سے اس کا دن سوتے جاگے گزرا۔ شام تک اس کی حالت سنبھل گئی۔ عاکف چچا دوبار اس کا پوچھنے آئے تھے۔ ابھی شریفان اسے سوپ پلا کر گئی تھی۔ وہ دوا کھا کر لیٹ گئی۔

یہ وہی کمرہ ہے جہاں اس نے مئی کے ساتھ کتنے سال گزارے تھے۔ اس گھر میں آنے کے پہلے روز سے لے کر انیکسی میں شفٹ ہونے تک۔ اسے مئی یاد آنے لگیں۔ اس سے کتنی محبت کرتی تھیں۔ اس کا کتنا خیال رکھتی تھیں ”اور اب کون ہے۔ مجھ سے محبت کرنے والا۔“ اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔

سامنے کی دیوار پر مئی کی جبو سا زین تصویر لگی تھی۔ سفید لباس پہنے وہ ہیل چیر بریشی مسکرا رہی تھیں۔

”فضہ! آئی لو یو ڈارلنگ! مئی نے دھیرے سے کہا۔

”مئی ٹو مئی۔“ دو آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکے۔

اسے مری کی وہ شام یاد آنے لگی جب موسم کی پہلی برف باری ہوئی تھی اور مئی نے برف کا سفید کفن اوڑھ لیا تھا، انہیں سفید رنگ سے عشق تھا۔ اسے ایک دم سے لگا مئی کا سفید لباس برف سے بنا ہے برف کا سفید براق کفن۔ اسے جھرجھری سی آگئی۔ مئی آنکھیں جھپکنے لگی تھیں۔ وہ مسکرا رہی تھیں پھر ایک دم سے وہ ہنسنے لگیں۔

”فضہ جان! آجاؤ۔ ڈارلنگ میرے پاس آجاؤ۔“ وہ ہنستے ہنستے بولیں۔

اسے لگا۔ مئی کو کھانسی شروع ہو گئی ہے۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگیں۔ ساتھ ہی خون اگلنے لگیں۔ انہیں خون کی ایکائی آئی سرخ سرخ گرم خون۔ ان کا سفید لباس جگہ جگہ سے سرخ ہو کر دیکھنے لگا۔

”آؤ فضہ جان! آجاؤ میرے پاس۔ میں تمہا ہوں جان۔ ادھر بہت اندھیرا ہے۔ میرے پاس آجاؤ۔ تم تو ہمیشہ میرے پاس رہتی تھیں آج اتنے دنوں بعد اپنی مئی سے ملنے آئی ہو۔ مائی سویٹ ہارٹ آئی لو یو۔ وہ کھانسی کی پروا کیے بغیر بولتی جا رہی تھیں ایک دم سے وہ تصویر کے چوکھٹے سے باہر نکل آئیں اور بائیں پھیلا کر اس کی طرف بڑھیں۔

”نہیں نہیں۔“ اس نے لحاف اچھا کر ایک طرف پھینکا۔

”آجاؤ فضہ! میرے پاس تم بھی تنہا ہو میں بھی۔ آؤ ہم ایک دوسرے کی تمنائیاں بانٹ لیں۔ فضہ ڈارلنگ ڈرو نہیں۔ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔“ وہ اب دیوار سے اتر کر قدم قدم و ہیل چیر کے بغیر اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔



”نہیں نہیں۔ میں نہیں آؤں گی۔“ وہ چیختی۔ دوپٹے لیے بغیر وہ باہر کی طرف بھاگی۔ اس نے پاگلوں کی طرح دروازہ کھولا۔ باہر کارڈور میں مکمل اندھیرا تھا۔ ڈر سے اس کی اور چیخ نکل گئی۔

”بچاؤ بچاؤ۔“ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ مئی بائیس پھیلائیں خون آلود کفن کے ساتھ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ دیوانہ وار باہر کی طرف بھاگی۔

باہر پھر بارش ہو رہی تھی وہ اندھا دھند باہر گیٹ کی طرف بھاگتی جا رہی تھی جب دو ہاتھوں نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

”نہیں۔ بچاؤ میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ زور زور سے چیخنے لگی۔  
”فضہ فضہ کیا ہوا ہے؟“ بارش اور گیٹ کی ٹیالی روشنی میں اس نے بمشکل دیکھا۔ وہ رہبر زوانی تھا۔ اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا وہ اس کی بانہوں میں بے ہوش ہو چکی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥

”عبیرہ! کتنے بچے کالج سے آؤں گی آج تم؟“ وہ ناشتہ کر رہی تھی جب غزالہ آنٹی نے اس سے پوچھا۔  
”ٹیٹ ہو جاؤں گی آنٹی! ایک تو بائی کی کارڈیکل ہے دوسرے اس کے بعد آپ کو پتا ہے مجھے کمپیوٹر کلاس کے لیے جانا ہوتا ہے وہی چار ساڑھے چار بج جائیں گے۔“

”آج رہنے دو کمپیوٹر کلاس۔ تم کالج کے بعد سیدھی آ جانا گھر۔“ انہوں نے چائے کا کپ اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ آپ کو پتا ہے پچھلے ہفتے بخار کی وجہ سے میری تین چار کلاسیں مس ہو گئی تھیں۔ اب مجھے کوئی چھٹی نہیں کرنی ہے۔“ اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔  
”بیٹا! کام ہے نا گھر میں۔“ وہ اس کے پاس آ بیٹھیں۔

”خیریت آنٹی! ایسا کیا کام ہے جس کے لیے میرا گھر آنا ضروری ہے۔“ اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا کر گھونٹ بھرا ”اور آپ آج اسکول نہیں جا رہیں؟“

”نہیں۔ آج میں نے چھٹی لی ہے اصل میں تانیہ کو دیکھنے شام کو کچھ لوگ آرہے ہیں۔ وہ ربیعہ کے شوہر سلیمان کے بڑے اچھے جاننے والی ہیں، لڑکا کراچی اسپتال مل میں انجینئر ہے۔ بس دو بسن بھائی ہیں اور ماں ہے۔ بسن کی شادی ہو چکی ہے کراچی میں ہوتے ہیں وہ لوگ اور جلدی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ ربیعہ مل چکی ہے ان سے۔ اسے بہت پسند آیا ہے لڑکا بھی اور فیملی بھی۔ انشاء اللہ امید تو ہے کہ ان کو تانیہ بھی پسند آجائے گی۔ تمہارے انکل بھی چاہ رہے ہیں کہ جلد سے جلد ان فرانس سے سبکدوش ہوں۔ اسی سال تو میری ریٹائرمنٹ ہو جائے گی اور اگلے سال ان کی اس دوران اگر تانیہ اور ثوبیہ کا ہو جائے تو بہتر ہے۔ آگے جو اللہ کو منظور۔“ وہ کہہ کر چپ کر گئیں۔  
وہ توجہ سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

”چائے پو تم ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ وہ اس کا انکاب توڑتے ہوئے بولیں۔  
”آنٹی! اگر یہ بات ہے تو مجھے میرے آنے کی بجھلایا ضرورت ہے۔ تانیہ ہے نا گھر پر۔“ اس نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔

”وہ تو ہے لیکن ایک تو گھر کی صفائی وغیرہ ذرا اچھی طرح کرنا ہے دوسرے شام کی چائے کی تیاری بھی کرنی ہے۔ تانیہ کو خود سے تیار ہونا کہاں آتا ہے۔ یونہی سر جھاڑ پھرتی رہے گی پھر اوپر تلے کچھ ایسے عجیب سے پروزلز آئے ہیں کہ وہ اس سلسلے سے ہی اچھی خاصی فیذاپ ہو گئی ہیں۔ میں نے ابھی اس سے کھل کر بات نہیں کی۔ یونہی بھڑک

اٹھتی۔ صرف اشارہ ”ذکر کیا تھا۔ باقی باتیں تم اس سے کر لینا تمہاری بات ذرا زیادہ سمجھتی ہے اور مان بھی لے گی۔ تمہارے جلدی آنے سے مجھے بھی سہولت رہے گی، ثوبیہ کے تو ایگزٹ ہونے والے ہیں۔ اس نے تو ہر کام سے صاف جواب دے دیا ہے اور دونوں چھوٹیاں ویسے ہی لاپرواہ ہیں۔ ربیعہ کی ساس بیارہے ورنہ وہ آجاتی۔“ انہوں نے وضاحت کی۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر میں کمپیوٹر کلاس نہیں لوں گی۔ جلدی آجاؤں گی۔ اب میں جاؤں مجھے کافی دیر ہو گئی ہے۔“ اچانک اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو کمپ ہاتھ سے رکھ کر فوراً ”کھڑی ہو گئی۔“

”چائے تولی جاؤ۔“  
”نہیں آنٹی! پہلے ہی خاصی دیر ہو گئی ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ خدا حافظ۔“ اس نے کرسی کی بیک سے لٹکا کالج

بیک کندھے پر ڈالا اور چادر کھولتے ہوئے باہر نکل گئی۔  
وہ پریکٹیکل سے فارغ ہو کر تقریباً ”تین بجے گھر پہنچی گھر آئینے کی طرح جگہ گاہا تھا اس نے گیراج سے گزر کر ایک نظر ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ ڈرائنگ روم صاف ستھرا تھا۔ صوفیوں پر دھلے ہوئے کورز تھے۔ سینئر ٹیبل اور باقی فرنیچر بھی بالکل صاف ستھرا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے چھینچ کیے اور باہر نکل آئی۔

غزالہ آنٹی اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم کی طرف جا رہی تھیں۔  
”السلام علیکم آنٹی! میں سمجھی آپ نہایت ہیں۔“ اس نے انہیں سلام کیا۔  
”وعلیکم السلام۔ میں نہانے ہی جا رہی ہوں۔ تمہارا کھانا میں نے گرم کر دیا ہے۔ تم کھا کر ذرا تانیہ کی خبر لو۔ وہ سارا کام میرے ساتھ کروا کر اب مزے سے کوئی کتاب لے کر پڑھ رہی ہے۔ ان لوگوں نے ساڑھے چار بجے تک آنا ہے۔ سواتین تو ہو چکے ہیں۔“ انہوں نے سامنے لگے کلاک کو ایک نظر دیکھا اور جلدی سے ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئیں۔

”آنٹی! آپ نے اور تانیہ نے کھانا کھالیا ہے؟“ اس نے انہیں پیچھے سے آواز دی۔  
”ہاں، ہم سب نے کھالیا ہے۔ ثوبیہ اوپر پڑھ رہی ہے۔ اس کو چائے بنا کر بھیج دینا گڑیا اور صائمہ یوشن چلی گئی ہیں۔“ وہ کہہ کر ہاتھ روم میں گم ہو گئیں۔

اس نے بچن میں جا کر چوہے پر چائے کا پانی ہلکی آنچ پر رکھا اور خود کھانا لے کر کھانے لگی، کھانے کے بعد چائے کا ایک کپ وہ اوپر ثوبیہ کو دے آئی۔ اپنا اور تانیہ کا لے کر اندر آ گئی۔  
”ہیلو کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے بظاہر کتاب میں مگن تانیہ کو خوش دلی سے پکارا، حالانکہ اسے معلوم تھا کہ ایسی چویشن میں کوئی کم از کم کتاب نہیں پڑھ سکتا۔

”کچھ بھی نہیں۔ ویسے ہی یہ لے کر بیٹھ گئی تھی۔“ اس نے مشتاق احمد یوسفی کی ”آب گم“ بند کر دی۔  
”یہ لیں چائے۔“ اس نے کپ اس کی طرف بڑھایا۔  
”آج جلدی آگئیں تم۔“ اس نے چائے کا گھونٹ بھر کر پوچھا۔

”ہاں کمپیوٹر کلاس نہیں لی اس لیے۔ آپ نے اپنے کپڑے پر پیس کر لیے۔“ اس نے ادھر ادھر یونی نگاہ دوڑائی۔  
”نہیں۔“ تانیہ نے مدھم آواز میں کہا۔

”اچھا چائے پی کر نکال دیں۔ میں کر دیتی ہوں۔ کون سے پنیں گی؟“  
”میں ایسے ہی ٹھیک ہوں عبیرہ پلیز۔“ اس نے اپنے کپڑوں کی شانیں ہاتھ سے مٹاتے کرتے ہوئے کہا۔



”اونہ آپی! بری بات۔ ہر موقع کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ آپ تو مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ وہ آپ پر براؤن شیشوں کی کڑھائی والا سوٹ بڑا اچھا لگتا ہے۔ وہی پریس کر دوں؟“

”رہنے دو یہی ٹھیک ہیں نا۔“ وہ اصرار سے بولی۔

”پھر وہی بات آپ کو تو سب پتا ہے۔ آنٹی بے چاری صبح سے لگی ہوئی ہیں اب آپ اس طرح کریں گی تو ان کا دل برا ہو گا انہیں کی خاطر۔“

”ان ہی کی خاطر تو ہر بار خود کو اس بے ہودہ نمائش کے لیے تیار کر لیتی ہوں ورنہ۔“ وہ تلخی سے جملہ ادھورا چھوڑ کر بولی۔

”تو بس پھر بات ختم۔ ان کی خاطر آج ذرا دل سے تیار ہو جائیں کہ ان کا دل بھی خوش ہو جائے میں وہی کپڑے نکال دوں پھر۔“ وہ چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔ وہی کر دو۔“ اس نے کہہ کر پھر سے کتاب کھول لی۔

وہ لوگ واقعی وقت کے پابند نکلے۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے غزالہ آنٹی! انہیں اندر لا رہی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی خوش شکل عورت تھی اور دوسری شکل و صورت سے اس کی بیٹی لگ رہی تھی۔ ان دونوں کے پیچھے وائٹ شرٹ اور براؤن پینٹ میں ایک لڑکا تھا۔ انہیں اندر بٹھانے کے تھوڑی دیر بعد غزالہ آنٹی کچن میں آکر انہیں چائے لانے کا کہہ گئیں چائے کی ٹرائی تیار تھی صرف چائے دم پر رکھی تھی۔ عبیدہ نے جلدی سے کیتلی میں چائے ڈالی۔ اس کے اوپر پی کوزی رکھی۔

”چلیں۔ میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“ وہ تانیہ سے کہہ کر ٹرائی لے کر آگے بڑھی۔

”السلام و علیکم!“ ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر دونوں نے آہستہ آواز میں سلام کیا باتیں کرتے وہ لوگ انہیں دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

”وعلیکم السلام۔“ ادھیڑ عمر عورت نے ذرا مسکرا کر جواب دیا۔

”او بیٹا! بیٹھو۔“ اس نے دونوں کو مخاطب کر کے اپنے بالمقابل پڑے صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ تانیہ آہستگی سے آگے بڑھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ٹرائی سے پلیٹیں نکال کر سینٹر ٹیبل پر رکھنے لگی۔

”ماشاء اللہ بڑی پیاری بچیاں ہیں۔ اللہ ان کے نصیب اچھے کرے دونوں آپ کی بیٹیاں ہیں۔“ انہوں نے غزالہ آنٹی سے پوچھا۔

”جی دونوں میری بیٹیاں ہیں۔“

”میں مسز حق ہوں۔ یہ میری بیٹی عاصمہ ہے اور یہ میرا داماد سہیل۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ ہم لوگ کیوں آئے ہیں ہے نا۔“ وہ بے تکلف لہجے میں مسکراتے ہوئے بول رہی تھیں۔ تانیہ کا سر مزید جھک گیا۔ عبیدہ بھی چائے بناتے ہوئے مسکراتے ہوئے لگی۔

”آپ کا کیا نام ہے بیٹا؟“ انہوں نے تانیہ سے پوچھا۔

”جی تانیہ جمال۔“ تانیہ بمشکل بولی۔

”اچھا نام ہے۔ کیا تعلیم ہے آپ کی؟“

”ایم اے اردو۔“

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)





۵  
پانچویں قسط

”ہمول اور بیٹا! آپ کا کیا نام ہے؟“ انہوں نے کپ اپنے آگے رکھتی عبیرہ سے پوچھا تو وہ کچھ حیران سی ہو گئی۔  
”عبیرہ۔“ وہ کہہ کر پلٹ گئی۔  
”ماشا اللہ پیارا نام ہے۔ آپ پڑھتی ہیں۔“

”جی۔“ اس نے مختصراً کہا۔  
”کون سی کلاس میں۔“  
”بی ایس سی تھرڈ ایئر میں۔“  
”کون سے سبجیکٹس۔“ ہیں بی ایس سی میں؟“ عاصمہ نے کپ تھامتے ہوئے پوچھا۔  
”بائنٹی اور کیمسٹری۔“  
”اور کیا مشاغل ہیں آپ کے؟“ اسے ان سوالوں سے الجھن ہونے لگی۔  
”کمپیوٹر کورس کر رہی ہوں ساتھ۔“

”اچھی بات ہے ادھر ذرا میرے پاس تو آکر بیٹھیں۔“ مسز حق کی فرمائش پر اس نے سوالیہ نظروں سے غزالہ آنٹی کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں بھی الجھن تیر رہی تھی سب دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے زبردستی مسکراتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ جا کر مسز حق کے دائیں طرف بیٹھ گئی۔  
”بڑی پیاری بچی ہے آپ کی مسز جمال۔“ وہ اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولیں۔  
”جی! غزالہ آنٹی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا وہ پزل سی ہو رہی تھیں۔ تانیہ سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی تھی۔“  
”ایک سیوڑی آنٹی! مجھے ذرا کچن میں کچھ کام ہے۔“ وہ ماحول کے کھنچاؤ سے گھبرا کر دوسرے ہی لمحے کھڑی ہو گئی اور باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد تانیہ بھی باہر آ گئی۔ اس کے تاثرات ہنوز سپاٹ تھے۔  
”عبیرہ! اندر سے برتن لے آؤ۔ امی کہہ رہی ہیں کچھ دیر بعد۔“ وہ کہہ کر چھپاک سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ خواجوا شرمندہ سی ہو گئی۔  
”درا اصل عبیرہ میری مرحومہ بہن کی بیٹی ہے۔ ماں باپ دونوں بچپن ہی میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گئے تھے اس کی دو بہنیں اور ایک بھائی اور ہے۔ وہ اپنے دو سرے رشتہ داروں کے پاس رہتے ہیں۔ یہ بچپن سے



میرے پاس ہے۔" وہ جو برتن لینے اندر جا رہی تھی باہر ہی ٹھٹھک کر رک گئی۔  
 "وہ بڑا افسوس ہوا آپ کی بہن کے بارے میں جان کر۔" مسز حق بولیں۔  
 "بہر حال ہمیں تو آپ جانتی ہی ہیں سلیمان اور ربیعہ کے توسط سے۔ میرے بچے سے بڑے اچھے تعلقات ہیں  
 سلیمان کے۔ ہمیں آپ کے گھر کا بہن سمن پسند آیا ہے۔ ہے نا عاصمہ بیٹا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔" وہ بیٹی سے  
 مخاطب ہوئیں۔

"جی امی بالکل۔ ہم جیسے لوگ چاہ رہے تھے آپ ویسے ہی ہیں۔" عاصمہ جواباً بولی۔  
 "آپ اب کب آئیں گی سہیل کو دیکھنے؟" وہ غزالہ آنٹی سے بولیں۔  
 "جب آپ کہیں۔" خوشی ان کے لہجے سے عیاں تھی۔  
 "میرا خیال ہے۔ اگلا جمعہ ٹھیک رہے گا۔" عاصمہ؟  
 "جی آنٹی! امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" بیٹی ضرورت سے زیادہ سعادت مند تھی۔  
 "جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

"میرا بیٹا بھی انشا اللہ آپ کو پسند آئے گا اور میرا گھر بھی اور گھر پر تو ہم دونوں ماں بیٹا ہی ہوتے ہیں۔ عاصمہ کی  
 شادی کے بعد سو کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ اس لیے شادی بھی ہمیں جلدی کرنی ہے اور بہن صاف بات  
 ہے ہمیں نہ جینز چاہیے اور نہ دوسری فضول رسموں کی میں قائل ہوں میں اور میرے بچے سادگی پسند ہیں۔  
 نمودار نمائش سے ذرا دور رہی بھاگتے ہیں۔"  
 "جی یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" غزالہ آنٹی بے حد خوش لگ رہی تھیں۔

"چلیں۔ میرا خیال ہے سہیل بیٹا۔" وہ بولیں۔

"جی امی چلتے ہیں۔" وہ تینوں شاید کھڑے ہو گئے تھے۔

"لو کی کا اصل جینز تو اس کی اچھی تربیت اور تعلیم ہوتے ہیں جس کا آج کل فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے آپ کے  
 گھرانے کی یہی بات اچھی لگی ہے۔ ربیعہ کی تعریفیں اس کے سسرال والے کرتے ہیں تو یونہی نہیں کرتے۔ ظاہر  
 ہے آپ کی تربیت ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے باہر آگئے۔ عبیدہ جلدی سے کچن میں چلی گئی۔

"اچھا غزالہ بہن! اب اجازت دیں۔" وہ صحن میں آکر رک گئیں۔

"جی بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ امید ہے آپ دوبارہ بھی آئیں گی۔" غزالہ آنٹی خوش دلی سے بولیں۔

"جی کیوں نہیں انشا اللہ اب ہم ملتے رہیں گے۔ ذرا عبیدہ بیٹی کو تو بلا میں میں جاتے ہوئے اسے پار تو کر لوں۔"  
 یہ جملہ تھا یا کوڑے کا سا نسا جو وہائیں سے صحن میں کھڑی غزالہ آنٹی کچن میں برتنوں سے الجھتی عبیدہ اور کمرے کی  
 گھڑکی کے پیچھے کھڑی تانیہ کی سماعتوں پر پڑا تھا۔

"جی! کانی دیر بعد غزالہ آنٹی کی آواز نکلی۔

"عبیدہ کو بلا میں ذرا۔" وہ پھر بولیں۔

"عبیدہ! ادھر آؤ۔" غزالہ آنٹی کی مری مری بکار اسے عائی دی وہ کچھ دیر بعد مردہ قدموں سے باہر نکلی۔

"جی! اس کا جی" وہ خود ہی سن سکی تھی۔

"بیٹا! ادھر آئیں میرے پاس۔" مسز حق دونوں کی کیفیات سے بے نیاز اسی لگاؤ سے بولیں۔ وہ گمن گمن کر قدم

برمھاتی ان کی طرف بڑھی۔

"اچھا بیٹا! ہم پھر آئیں گے۔ میرے اللہ نے چاہا تو آپ کو لینے۔" وہ اس کا ماتھا چوم کر محبت سے بولیں۔  
 انہوں نے پرس سے ہزار کانوٹ نکال کر عبیدہ کے ہاتھ میں دینا چاہا۔ اسے جیسے کرنٹ سا لگا۔ وہ بدک کر پیچھے  
 ہٹی۔

"نہیں مسز حق! یہ نہیں۔ اتنی جلدی۔" غزالہ آنٹی بھی گھبرا گئیں۔

"مسز جمال! یہ ہماری خوشی ہے بچی کو سوکھا پیار تو نہیں دے سکتی تائیں یہ لومینا رکھ لو۔" انہوں نے زبردستی نوٹ  
 پھر اس کی طرف برمھایا وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

"پھر سسی مسز حق پلیز۔ ابھی نہیں۔ میں جمال سے مشورہ تو کر لوں۔" غزالہ آنٹی ذرا حتمی لہجے میں بولیں۔

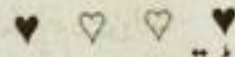
"جوڑے بے شک آسمانوں پر بنے ہیں، لیکن عبیدہ میری بیٹی تو بن سکتی ہے اتنی پیاری بیٹی سے پہلی بار مل کر میں  
 یونہی تو نہیں جاسکتی نا۔ رکھ لو بیٹا! ایک ماں کی طرف سے اپنی بیٹی کے لیے۔" انہوں نے اتنی محبت سے کہہ کر نوٹ  
 اس کے ہاتھ میں دیا کہ وہ انکار ہی نہ کر سکی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

وہ اسے پیار کر کے باہر کی طرف بڑھ گئیں۔ غزالہ آنٹی ان کو چھوڑنے گیٹ تک گئیں وہ حیرانی سے نوٹ کو دیکھنے  
 لگی۔

"غزالہ آنٹی! یہ۔۔۔۔۔" جب غزالہ آنٹی دروازہ بند کر کے واپس آئیں تو اس نے نوٹ ان کی طرف برمھایا۔ ان کا  
 چہرے بے تاثر تھا اور قدم بے حدست!

"رکھ لو۔ تمہیں دے کر گئی ہیں۔"

وہ رکھائی سے کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں تو اسے جیسے شاگ سا لگا وہ دکھ اور حیرت سے غزالہ آنٹی کی  
 طرف دیکھتی رہ گئی۔



سوتے میں اس کی بند آنکھوں کے بند پونے تھوڑی دیر بعد پھر پھڑا رہے تھے۔ باوامی بڑی بڑی روشن آنکھیں  
 جن میں ایک دنیا حسرتوں اور امیدوں کی آباد تھی۔ ان پونوں کے پیچھے بے خبر بڑی سوری تھیں ان باوامی آنکھوں کا  
 سنگھار لائٹ براؤن تیرکمان جیسے ابرو، جن کے اوپر کشادہ روشن پیشانی (جو خوش بختی کی علامت سمجھی جاتی ہے  
 یہاں صرف حسن کا ضمنی صفحہ تھی) سے نیچے جاتی چھوٹی سی تیکھی ناک اس کے چہرے کی سب سے معصوم گواہ۔  
 جس کے نیچے دو خم شدہ سرخ ہونٹوں کا جوڑا تھے سے دبانے میں سمٹا ہوا تھا۔ ابھرے ابھرے سے سفید رخسار اور  
 کانوں کی لوہوں تک باوامی ہلکے ہلکے بال، اس خوبصورت حسین دنیا کا جیسے احاطہ کیے ہوئے تھے اور وہ صورت جیسی  
 صورت نازک سی پتلی گردن پر ایستادہ تھی اور چھوٹی چھوٹی سی مخروطی انگلیوں والے سفید نازک ہاتھ سینے تک  
 بوڑھے کبل پر دھرے تھے۔ وہ حسن کی ایک مربوط کتاب تھی ان چھوٹی ان پڑھی۔ جس طرح وہ خود اپنے حسن کے  
 اس انمول خزانے سے بے خبر تھی اسی طرح اس کے ارد گرد کا ماحول بھی قدرت کے اس شاہکار سے بے پروا تھا۔  
 برف سے حسن تلے دبے خزانے کی آج دھیرے دھیرے جیسے رہبرزدانی کو پکھلا رہی تھی اس کی انگلیاں اس  
 کے لمس کو محسوس کرنا چاہ رہی تھیں۔

اندرونی اضطراب سے بے قرار ہو کر اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں کو چائے کے کپ کے کناروں پر پھیرنا شروع  
 کر دیا۔ سویا ہوا انمول شاہکار اسے عجب طرح کے کرب میں مبتلا کیے دے رہا تھا۔ وہ اپنی ہی بے خود کیفیات سے  
 مجرا کر کھڑا ہو گیا اور جا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ رات جب وہ اس کی بانہوں میں بے ہوش ہوئی تھی تو اسے



پریشانی کی وجہ سے اور کچھ نہ سوجھا وہ اسے انیکسی میں لے آیا تھا اور بستر پر لیٹا کر کونکھی کی طرف دوڑا وہاں سے  
تشریفاں اور بتول کو بلا کر لایا۔ عاکف انکل تو گھر پر نہیں تھے نرسنگس آنٹی سوچکی تھیں اس نے ڈرائیور کو بھیج کر ڈاکٹر  
کو بلایا جس نے بڑی اچھی طرح اس کا چیک اپ کیا تھا۔

”یہ کسی چیز سے خوفزدہ ہو گئی تھیں دہشت سے بے ہوش ہو گئی ہیں۔ میں نے انجکشن لگا دیا ہے ابھی کچھ دیر  
میں ہوش آجائے گا تو انہیں گرم دودھ کے ساتھ یہ دوائیں دے دیں۔ انشا اللہ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گی۔“  
ڈاکٹر نے نسخہ لکھ کر اس کی طرف بڑھایا رات اس کے پاس بتول سوئی تھی خود وہ اندر کونکھی میں جا کر سو گیا تھا اور  
اب صبح اس کا پتا کرنے آیا تھا۔ وہ ہوش و خرد سے بے گانہ سو رہی تھی جب وہ اس کے خدو خال کو حرف حرف پڑھنے  
بیٹھ گیا تھا اور یہ صرف اس کی آنکھوں کے رستے دل پر نقش ہو گئے تھے۔ ان نقوش کا اثر کتنا دیر پا ہے اسے معلوم  
نہیں تھا لیکن اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وقت ختم جائے اور وہ اس کے سامنے اسی طرح بے جبر لیٹی رہے اور وہ  
ان حروف کو اپنی بصارتوں میں سمواتا رہے۔

اس نے ذرا سا کراہ کر کروشلی اور آنکھیں کھول دیں۔  
وہ اپنی بے خود حالت سے جیسے باہر آکر متوجہ ہوا وہ آنکھیں جھپک جھپک کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اس  
کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ دوسرے لمحے جیسے پہچان کے لمحے اس کی آنکھوں میں آکر ٹھہر گئے۔ وہ گہرا کراٹھنے  
لگی۔

”ارے لیٹی رہو آرام سے۔ ڈاکٹر نے تمہیں آرام کرنے کو کہا ہے۔“ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر بولا۔ وہ ان سنی  
کر کے اٹھ بیٹھی۔ اپنے ہاتھوں سے بکھرے بالوں کو سنوارنے لگی۔  
”میں کہاں ہوں؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”انیکسی میں۔“ وہ جیسے خود ہی حیران ہو گئی۔  
”میں یہاں کیسے آئی؟“  
”اڑ کر۔“ وہ اس کے پاس کرسی پر بیٹھتے ہوئے آرام سے بولا۔

”کیا مطلب؟“ بھنوراسی آنکھیں الجھ کر بولیں۔  
”تمہیں نہیں پتا۔ تم یہاں کیسے آئیں؟“ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔  
”کیسے؟“ وہ مدھم لہجے میں جیسے خود سے بولی اور کچھ سوچنے لگی۔ اسے گزشتہ رات کا منظر یاد آنے لگا جب می  
تصویر سے نکل کر اس کا تعاقب کرنے لگی تھیں۔

”اوہو!“ اس کے منہ سے اس منظر کا خیال ہی سے سسکی سی نکل گئی۔  
”میں ڈر گئی تھی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔  
”تی بڑی ہو کر بھی ڈرتی ہو تم؟“ پتا نہیں کیسے وہ خود بخود ”تم“ پر آگیا تھا۔  
”کیوں کیا بڑے ہو کر نہیں ڈرتے۔“ وہ ناگواری سے بولی۔

”جھا تمہارا خیال ہے تم بڑی ہو چکی ہو۔“ وہ اس کے مہین سے سراپے کو نظروں میں تولتے ہوئے بولا۔  
”مجھے یہاں کون لایا تھا؟“ وہ اس کا سوال اور نظرس نظر انداز کر کے بولی۔  
”یاد کرو ہوش کا آخری منظر۔“ وہ جیسے سوچ میں پڑ گئی۔ وہ کن اکھیوں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔  
”اوہ! میں بے ہوش ہوئی تھی آپ۔“ اس نے زبان دانتوں تلے دبائی ”میں رات سے یہاں ہوں۔“ اس کی

”ظاہر ہے۔“ وہ اس کی حالت کا مزہ لے رہا تھا۔

”رنگی! اس نے آنکھیں پھیلائیں۔ ”اور آپ؟“

”میں بھی۔“ وہ مسکراتے ہوئے ڈھٹائی سے بولا۔

”وہاٹ!“ وہ حیرت سے چلائی ”نہیں“ وہ بستر سے اترنے لگی۔

”کیا ہوا ہے کہاں جا رہی ہو۔“ وہ اس کا ارادہ بھانپ کر بولا۔

”کہیں نہیں۔“ وہ کمبل ہٹا کر ٹانگیں نیچے اتارتے ہوئے بولی۔

”بھئی۔“ میں تو اندر سویا تھا کونکھی میں اور تمہارے پاس یہاں بتول سوئی تھی وہ اب تمہارا ناشتہ لینے گئی ہے۔ میں

تو ابھی آیا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا مبادا وہ اٹھ کر نہ چل پڑے۔

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں؟“ وہ مشکوک لہجے میں بولی۔

”میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔ تم ابھی بتول آتی ہے۔ اس سے پوچھ لینا۔“

”عاکف چچا کو پتا نہیں چلا۔“ وہ پست لہجے میں بولی۔

”وہ رات کو شاید لیٹ آئے تھے اور صبح جلدی چلے گئے۔ ویسے کیا واقعی وہ تمہارے سکے انکل ہیں؟“

”کیوں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“ وہ ابرو اچکا کر بولی۔

”لگتے تو نہیں۔ اچھے خاصے غیر غیر سے لگتے ہیں۔ اس دن ڈنر پر انہوں نے تمہیں کھانے کے لیے بلایا ہی

نہیں۔“ وہ اسے جتا کر بولا۔

”یہ ایسے ہی ہیں۔ کبھی مہمان کبھی اجنبی۔ وہ کیا ہیں شاید انہیں خود بھی پتا نہیں۔“ وہ شاید اپنے آپ سے کہہ  
رہی تھی۔

”ویری ٹائٹس۔ شاعرانہ لب و لہجہ۔ کون سی کلاس میں پڑھتی ہو؟“

”کسی میں بھی نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”میٹرک کا پرائیوٹ امتحان پاس کیا ہے اور بس تعلیمی بیک گراؤنڈ تو یہی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“

”رنگی اس زمانے میں اور ایڈوانس فیملی کی ممبر ہو کر تمہاری اکیڈمک پرفارمنس اتنی بوگس ہے۔“ وہ حیرت سے  
بولا۔

”کسی بھی فرد کی قسمت اس کو کچھ بھی بنانے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے نہ کہ ماحول اور فیملی۔“

”یہ کیا دقیانوسی باتیں کر رہی ہو۔ اکیسویں صدی میں قسمت فرد ہے وہ خود ہی اپنی قسمت بناتا ہے بزدل اور  
ناکارہ لوگ یہ قسمت اور نصیب جیسے ایشو کو لے کر بیٹھے رہتے ہیں۔“

”آپ کہہ سکتے ہیں ایسی بات۔ جس تن لاگے وہ تن جانے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔ جس تن لاگے وہ تن جانے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا  
کہ وہ اندر تک پھل گئی۔ گہرا کر جانے کو مڑی۔

”قضہ!“ اس نے دھیمی آواز میں اسے پکارا وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکی۔

”میں اب چلتی ہوں۔“ وہ بوتلے خاموش لمحوں سے گہرا کر جیسے خود سے بولی۔

”قضہ! مجھ سے دوستی کرو گی۔ رہبر بزدانی سے۔“ وہ ایک دم سے اس کے سامنے آکر اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا



وہ جیسے حیران رہ گئی اس نے تو اپنی اٹھارہ سالہ حقیقی زندگی میں تو یہ لفظ ہی پہلی بار سنا تھا۔  
”فضہ! مجھ سے دوستی کرو گی؟“ اسے حیران دیکھ کر وہ پھر بولا۔  
”نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

”کیوں؟“

”یونہی۔“ اسے کچھ جواب سمجھ میں نہ آیا۔

”کیا میں تمہاری دوستی کے قابل نہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”تو پھر؟“ وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اس کی قربت سے اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

”میں اب چلتی ہوں۔“ وہ ایک قدم باہر کی طرف بڑھا کر بولی۔

”تم جب تک اس پھیلے ہوئے ہاتھ کو تھام نہیں لو گی۔ میں یونہی کھڑا ہوں گا فضہ تا عمر۔“ وہ ایک جذب کے عالم میں بولا تو وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ بھلا ایسا کیا ہے اس کی دوستی میں۔

”سوری رہر صاحب! میرا کبھی کسی سے ایسا کوئی رشتہ نہیں رہا۔“ وہ کہہ کر باہر کی طرف بڑھ گئی۔

دروازے سے نکل کر اس نے ایک نظر مڑ کر دیکھا وہ اسی طرح ہاتھ پھیلائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا فضہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اندر آ گئی۔

”میں نہیں جانتی یہ دوستی وغیرہ کیا چیز ہوتی ہے۔ آپ یہاں مہمان ہیں وہ تو حالانکہ میں بھی ہوں پھر بھی آپ کے گیسٹ ہونے کا خیال کر کے۔“ اس نے آہستگی سے اپنا مناسا ہاتھ اس کے پھیلے ہوئے مضبوط مردانہ ہاتھ پر رکھ دیا جسے اس نے زور سے بھیج لیا۔ وہ گھبرا کر ہاتھ چھڑانے لگی۔

”تھینک یو فضہ! میں تمہاری دوستی کا مان رکھوں گا۔ تمہیں اس کا مفہوم سمجھاؤں گا تھینک یو۔“ اس نے کہتے ہوئے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”خدا حافظ۔“ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

”خدا حافظ؟“ اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں اسے جاتے دیکھ کر کہا۔

♥ ♥ ♥ ♥

”ہاں تو کیا قصور ہے میرا یہی ناکہ آپ کا کہا جاتا ہے جیسا آپ نے کہا ویسا کیا ہے۔ اب آپ کو کیا اعتراض ہے؟“ ابرار بھائی کی اوچی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ دوپہر کو بہت کم سوئی تھی آج یونیورسٹی سے آکر بڑی تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کھانا کھاتے ہی سو گئی۔ اب ایک دم سے اتنی اوچی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی ابرار بھائی تو ہمیشہ ہی بہت مدہم آواز میں بات کیا کرتے تھے۔

”ہاں تو یہ بھی میں نے کہا تھا کہ شادی کے بعد یوں بندر کی طرح بیوی کے اشاروں پر ناچنا۔ وہ رات کو دن کے تم دن کے دن کے اشتادہ بھی نہیں کرتی اور تم دوڑ پڑتے ہو۔ کھو کھو دو نوں میاں بیوی نے سرائے بنا رکھا ہے ایک دن آتے ہو چند دن سسرال میں گزارتے ہو۔ میں پوچھتی ہوں ابرار! کیا ہو گیا تیری غیرت اور شرم وحیا۔ کو تو آپا تو نہ تھا۔“ مجھے ماں کی فکر ہی ہے نہ باپ کی پروا۔ کئی کئی بٹے گزر جاتے ہیں تیری شکل دیکھے مجھے تو اب ماں نظر ہی نہیں آتی ہائے میں نے اس دن کے لیے بیابا تھا مجھے کہ ایک چھت تلے رہتے ہوئے مجھے دیکھنے کو ترس

UrduPhoto.com

جاؤں۔“ تائی جی اوچی آواز میں واویلا کر رہی تھیں وہ اٹھ کر کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی۔

”یہ رستہ بھی آپ ہی کا منتخب کیا ہوا ہے ای! کیا آپ کو پتا نہیں تھا کہ جو کچھ آپ کرنے جا رہی ہیں اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اور میری شرم و غیرت کا جنازہ تو اسی دن آپ نے نکال دیا تھا جب ایک کروڑ پتی کی بیٹی سے مجھے بیابا تھا اور یہ بھی تو آپ ہی کا حکم تھا کہ نوکری چھوڑ کر مکمل طور پر اس کی غلامی اختیار کر لوں۔ اس کے باپ کا زر خرید بن جاؤں۔ میں نے تو آپ کا ہر حکم مانا ہے کہ کہیں آپ کی دل شکنی کا مرتکب نہ ہو جاؤں اب آپ کو کیوں گلہ ہے کس بات کی شکایت ہے۔“ وہ بڑے آرام سے ان کے ہر الزام کا جواب دیتے ہوئے اپنے پرانے مدہم لہجے میں بولے۔

”یہ بھی میں نے کہا تھا کہ جاکر سسرال میں گھر بسالے۔ اپنے ماں باپ کو ہی بھول جا، ان کی چاکری میں تجھے یہ بھی ہوش نہیں کہ ہم کن حالوں سے گزر رہے ہیں۔ تو عیش کر تجھے اس سے کیا چاہے ہم جنیں چاہے مریں۔“ وہ رونے لگیں۔

”ای! آپ بھول رہی ہیں جو کھلاتا ہے وہ آنکھیں بھی دکھاتا ہے اور آنکھیں دیکھ کر میں نے اپنی زندگی کو کانٹوں کی دلدل نہیں بنانا۔ اب اگر میں بقول آپ کے یہ چاکری بھی چھوڑ دوں تو اس عمر میں اب کون مجھے دوبارہ نوکری دے گا اور اگر نوکری مل بھی گئی تو اس طرح کی آسائش بھری زندگی کہاں سے ملے گی مجھے تو ان آسائشوں کی لت لگ گئی ہے۔ پہلے میں ان کا عادی نہیں تھا تو سات آٹھ ہزار میں آرام سے گزارا کر لیتا تھا اور اب اگر میں مر سبز کے علاوہ چار قدم چلوں تو میرا ساساں پھولنے لگتا ہے۔ مجھے بتائیں مجھے اس کی لت کس نے لگائی؟ ای! دولت کے نشے سے بڑا نشہ اس دنیا میں کوئی نہیں۔

ای! میں تھوڑے پیسے کما تا تھا لیکن چین سکون کی نیند تو سوتا تھا، آپ کے حقوق بھی پورے کرتا تھا۔ مجھے اپنے ہونے پر فخر تھا کہ میرا وجود کار آمد ہے، پانا کا وہ کسی پر بوجھ نہیں۔ یہ اطمینان ہر انسان کی زندگی کا سرمایہ ہوتا ہے، آپ نے مجھ سے یہ سرمایہ چھین کر مجھے کنگال کر دیا۔ مجھے معذور بھکاری بنادیا، مجھے دوسروں سے مانگ کر کھانے کا عادی بنادیا۔ اب میں کسی وفادار کتے کی طرح ان کے گھر کی راکھی کرتا ہوں تو یہ شاندار زندگی کا راتب کھا رہا ہوں۔ آج میں کوئی اکڑ کھاؤں تو کس برتے پر۔ وہ کہیں گے ہمارا کھاتے ہو ہم ہی کو آنکھیں دکھاتے ہو۔ ای! آپ نے مجھے توڑ پھوڑ کر اپنی ہی نظروں میں قابلِ نفرت بنادیا ہے۔

سوئے چاندی کے یہ طوق جو میری غلامی کی نشانی ہیں، آپ کو کہیں نظر نہیں آتے اور کوئی غلام کسی دوسرے کے کیا حقوق ادا کر سکتا ہے۔ مجھے تو اب ہر دم اپنے آقا کی خوشنودی کی فکر ستاتی ہے، آپ کی فکر کہاں سے کروں۔ میں اب چاہوں بھی تو یہ زنجیریں نہیں توڑ سکتا، آپ کو مجھ سے گلہ کرنے کا اب کوئی حق نہیں۔ آپ نے تو میرا سودا کیا تھا۔ اس لکڑی کے کاٹھ کباڑ اور سوئے چاندی کے بدلے اب میرا مطالبہ کیوں کرتی ہیں اب میں جیسے زندگی کے دن گزار رہا ہوں، مجھے گزارنے دیں۔ اگر آپ کی نظر میں میں زندہ ہوں تو یہ آپ کی بھول ہے ای! میں تو اسی دن مر گیا تھا جس دن آپ نے میری بولی لگائی تھی۔ اپنے کروڑ پتی بھائی کے دربار میں۔ بکے ہوئے مال کا مطالبہ نہیں کیا کرتے۔

ای! اب مجھے بھول جائیں مر گیا آپ کا ابرار، مر گیا۔“ وہ زور زور سے چلاتے باہر نکل گئے۔ ان کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور آنکھوں کے آگے دھند کی چادر۔

اپنے منہ سے اپنی موت کا اعلان کرنا آسان کا نہیں ہے اور پھر دوسروں کے ساتھ خود کو بھی اس انہونی کا یقین دلانا قیامت خیز ہوتا ہے۔ کسی پل صراط سے گزرنے کے مترادف اور وہ اس تنگی تلواری سے گزر گئے تھے۔ پھر قدم کیسے



ساتھ دیتے اور تائی جی جو پہلے ہکا بکا ان کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ ان کے جاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔  
 ”امی! اب کیوں روتی ہیں؟ میں نے سمجھایا تھا نا آپ کو کہ کیا کرنے جا رہی ہیں آپ۔ مگر آپ تو کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہ رہی تھیں، اب رونے دھونے سے کیا فائدہ؟“ ولید بتا نہیں کب ان کے پاس آ بیٹھا تھا۔ افسردگی سے کہنے لگا۔

”دیکھا آپ نے بھائی کو۔ کیا حال ہو گیا ہے ان کا۔ امی! آپ نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا، بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔ کوئی ماں اپنی اولاد کو بھی بیچا کرتی ہے۔“

”ہاں ہاں، تم بھی پتھر اٹھا کر میرے سر پر مارو۔ جاؤ باہر جا کر دو چار کو اور بلا لاؤ۔ سارے مجھے پتھر مارو، میں ظالم ہوں، قاتل ہوں، اپنے بیٹے کی تمہاری تم سب کی۔ مجھے سارے مارو۔ مجھے مورد الزام ٹھہراؤ کیا برا سوچا تھا میں نے اس کا۔ اس کی بہتری چاہی تھی، خوب صورت حسین لکھتی بیوی لا کر دی اسے۔ یہ تو — نہیں کہا تھا کہ اس کا زر خرید بن جانا، آنکھیں بند کر کے اس کے اشاروں پر ناچنا، ارے اسے خود چسکا پڑ گیا ہے یہ عالیشان زندگی گزارنے کا۔“

اب وہ ہمیں اپنی اس شاندار زندگی سے نکال دینا چاہتا ہے، میں نہیں مانتی اس کی باتوں کو، وہ اب ہم سے الگ ہونا چاہتا ہے۔ یہ سب ڈرامہ کر رہا ہے وہ یہاں سے جانے کا۔ ارے کون سا شوہر ہے دنیا کا، جو خود پر بیوی کو اس درجہ حاوی ہونے دے گا، شوہر چھوٹ نہ دے تو بیوی کی کیا مجال کہ دم بھی مار سکے۔ انتہائی تنگ ہے اس آسائشوں بھری زندگی سے تو لات مار دے ان کو۔ پھر دیکھتی ہوں کون باندھتا ہے اسے اس کا خود دل نہیں چاہتا سب کچھ چھوڑنے کو۔ جاو کر دیا ہے اس حسین چڑیل نے اس پر۔ اب وہ ویسے ہی ہم سے دامن چھڑانا چاہتا ہے، بہانے ڈھونڈ رہا ہے اس کی بہتری چاہنے والی اسے یہ حسین زندگی دینے والی اب اس کی دشمن ہو گئی۔ دیکھا تم نے، یہ ہوتا ہے اولاد کی محبت میں خوار ہونے والے ماں باپ کا انجام۔“ وہ حسب عادت بابا کا رچا کر اپنی بات کا پلڑا اونچا کر رہی تھیں۔

”وہ دامن چھڑالیں ان سے، لات مار آئیں اس سلطنت کو آپ نے امی! پندرہ لاکھ کا جو حق مر لکھ دیا تھا کون ادا کرے گا وہ۔ یہ گھر ہے پندرہ لاکھ کا۔ سارا کیا دھرا آپ کا ہے، ہاتھ پاؤں کاٹ دیے ہیں آپ نے ان کے۔ اب کیوں روتی ہیں، آپ جیسے نانا قبت اندیش والدین پہلے اولاد کی تباہی کا سامان کرتے ہیں پھر سارا الزام اولاد کے سر ہی لگاتے ہیں کہ اس نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ اب وہ جیسی زندگی گزار رہے ہیں، گزارنے دیں انہیں۔ مت ان کا پیچھا کریں، اس سے سوائے اپنا خون جلانے کے اور کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یہ مان لیں کہ آپ سب کچھ کھو چکی ہیں اپنے ہاتھوں سے۔“ وہ تیز تیز بولتا ان پر افسوس بھری نظر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اور تائی جی واقعی اپنی دونوں ہتھیلیاں کھول کر انہیں غور سے دیکھنے لگیں، جیسے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنے نقصان کا ازالہ ڈھونڈ رہی ہوں۔

”ہیلو! وہ جو نرگس آنٹی کی نظر بچا کر چن کے پچھلے دروازے سے دبے پاؤں باہر نکل رہی تھی، رہبرزدانی کی اچانک ”ہیلو“ پر اچھل ہی پڑی۔ اپنے زور زور سے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر اس نے خائف نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”یہ تم چوروں کی طرح دبے پاؤں کہاں فرار ہو رہی تھیں؟“ وہ دلچسپی سے اس کے چہرے کا اڑا اڑا سا رنگ دیکھ کر بولا۔

”یہ کوئی طریقہ ہوتا ہے کسی کو بلانے کا۔ اگر میرا ہارٹ فیل ہو جاتا تو۔“ وہ خفگی سے کہہ کر آگے بڑھی۔  
 ”مختصر! اگر صرف ہیلو کہنے سے کسی کا ہارٹ فیل ہو سکتا ہے تو دن میں لاکھوں کروڑوں ٹیلی فون اٹینڈ کرنے والے لوگوں کو مرجانا چاہیے۔“ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔  
 ”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے، میں فون اٹینڈ نہیں کر رہی تھی، اپنے دھیان میں جا رہی تھی۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”اپنے دھیان میں یا کسی اور کے دھیان میں۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا ”کیونکہ اپنے دھیان میں انسان اس قدر گم ہو کر نہیں چل سکتا۔“

”گم ہونے کے لیے کسی کے دھیان کی ضرورت نہیں، انسان چلتے چلتے اپنے اندر بھی گم ہو سکتا ہے۔“  
 ”اچھی بات کہی تم نے گڈ ویسے تم اتنے دنوں سے ہو کہاں؟“ وہ بڑی بے تکلفی سے بولا۔  
 ”یہیں بھی میں کہاں جا سکتی ہوں۔“ وہ دونوں آگے پیچھے لان میں داخل ہوئے۔ ”یہاں کہاں مجھے تو نظر نہیں آئیں حالانکہ میں رات کو روزانہ ڈرائنگ ہال ہی میں کرتا رہا ہوں۔ تم تو وہاں نہیں ہوتی تھیں۔“ اس کی خواہ مخواہ کی جرح اسے چڑا گئی۔

”کیوں آپ کو کوئی کام تھا مجھ سے؟“ وہ ابرو اچکا کر بولی۔  
 ”کیوں اگر صرف کام ہو تو کوئی کسی کو ڈھونڈتا ہے۔“ اس نے انسا سوال جڑا۔

”اس کے علاوہ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں بننا کیونکہ ادھر میری یاد کسی کو اسی وقت آتی ہے جب کسی کو کوئی کام ہوتا ہے۔“ وہ سبز گھاس پر نظریں جما کر چل رہی تھی۔  
 ”ایسی تو کوئی بات نہیں، دنیا تمہارے زور بازو پر نہیں چل رہی۔“  
 ”یہ میں نے کب کہا۔“ وہ ایک دم سے اداس ہو کر بولی۔

”اچھا چھوڑو۔ فضا، تم ادھر کب سے ہو، میرا مطلب ہے اپنے انکل کے پاس۔“  
 ”بچپن سے۔“ وہ اسی اداس ٹون میں بولی۔  
 ”تمہارے والدین۔“ وہ کچھ جھجک کر بولا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

لان کے اس حصے میں کوئی پیر کوئی درخت نہیں تھا۔ جہاں سے سرونٹ کو اترنے کی حد شروع ہوتی تھی۔ اسے الگ کرنے کے لیے سفیدے کے درختوں کی ایک قطار سی تھی اور ان سے ذرا آگے ایک ہی نیم کا درخت تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس درخت کے پاس جا کر کھڑی ہوئی، وہ اسی طرح اس کے پیچھے آ رہا تھا۔  
 ”تمہارے پیرنس فضا؟“ اس نے اپنا سوال دہرایا۔

”جب وہ دونوں روڈ ایکسپریس میں فوت ہوئے تو عاکف چچا مجھے یہاں لے آئے تھے۔“ وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

”تمہارا اور کوئی بہن بھائی نہیں۔“ اس کے اس سوال پر ترتب کر اسے دیکھا۔  
 ”ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔“ اس کی آنکھیں بھینگنے لگیں، حالانکہ اب تو اس نے ان تینوں کو دانستہ یاد کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

”اچھا واقعی! وہ کہاں ہیں؟“ وہ دلچسپی سے بولا۔  
 ”کیا کریں گے بوجھ کر۔“ وہ لاہروانی سے درخت کے تنے کو ناخن سے کھرپنے لگی۔  
 ”چلو نہ بتاؤ، آؤ ہمیں گھومنے چلتے ہیں۔“ وہ ایک دم سے موضوع بدل گیا اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔  
 ”کیا مطلب؟“



”میں نے کوئی مشکل جملہ بولا ہے۔ میں نے کہا ہے، آؤ کہیں گھومنے چلتے ہیں۔ دیکھو ناموسم کتنا اچھا ہو رہا ہے، بادل گھر گھر کر آرہے ہیں۔“ اس نے آسمان پر تیرتے بادلوں کو دیکھ کر کہا۔

”نہیں مجھے نہیں جانا۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔

”کیوں بھی اس میں کیا برائی ہے، انکل تو گھر پر نہیں ہیں، اگر ہوتے بھی تو میں ان سے پوچھ لیتا۔ اس میں کیا ہے چلو تم۔“

”میں کہیں نہیں جاتی نا۔ میں نہیں جاؤں گی۔“

”یہ عجیب منطق ہے جو کام پہلے نہیں کیا، کیا وہ کبھی بھی نہیں کرنا۔ چلو تم گاڑی کی چابی ہے میرے پاس۔ میں باہر ہی جا رہا تھا۔“ اس نے پینٹ کی جیب میں چابی ٹٹولی وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”چلو نا۔“ وہ اصرار سے بولا۔

”میں نہیں جاؤں گی پلیز۔ آپ چلے جائیں۔“ وہ درخت سے ذرا ہٹ کر بولی۔

”میرا اکیلے جانے کا موڈ نہیں، تم آؤ نا۔ اب کیا اٹھا کر لے جاؤں تمہیں۔ آؤ بھی۔“ اس نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ وہ تو کبھی بھی باہر نہیں گئی تھی، شاید تین یا چار دفعہ بہت سال پہلے نرس آئی اسے لے کر گئی تھیں۔ بازار میں شاپنگ بیگنا اٹھانے کے لیے ان کی ملازمہ اس دن چھٹی پر تھی۔

”اوہو ابھی جاؤ اب اور کتنی مفتیں کرواؤ گی۔“ وہ زچ آکر بولا۔

”ہاں تو اس میں حرج کیا ہے، جب کسی کو میری پروا نہیں تو میں کیوں پروا کروں۔“ اس کے دل نے راہ دکھائی اس نے ایک نظر اپنے براؤن شکنوں بھرے کاٹن کے سوٹ پر ڈالی۔

”کپڑے ٹھیک ہیں تمہارے، آج کل کاٹن پر شکنوں کا فیشن ہے ڈونٹ وری۔ چلو اب۔“ وہ اس کی نظروں کا مفہوم بڑھ کر بولا۔

”چلیں۔“ وہ ذرا اعتماد سے قدم آگے بڑھا کر بولی۔

”تم نے تو لاہور کی سیر کی ہوئی ہو گی، اتنے برسوں سے یہاں ہو۔“ گاڑی سڑک پر لا کر اس نے پہلی بات اس سے کی وہ چپ رہی۔

”کیا کیا دیکھا ہوا ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ وہ پھر چپ رہی۔

”فور ٹریس چلتے ہیں ویسے بھی میں کئی سالوں بعد لاہور آیا ہوں۔ خیر رستے تو مجھے سارے ازبر ہیں، بچپن، لڑکپن ادھر گزرا ہے۔ تمہیں بھوک تو نہیں لگی۔“ اس نے اچانک پوچھا۔

”نہیں۔“

”اچھا میں سمجھا تم بھوک کی وجہ سے چپ ہو۔ یا ر کوئی بات کرو نا اس طرح گم صم بیٹھی ہو جیسے میں تمہیں زبردستی لایا ہوں۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”یہ آپ کو مجھے لانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا، میں بہت نہیں بولتی ہوں۔“ وہ کہہ کر دلچسپی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ لاہور کی کشادہ سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک کا اثر دھام اس کی توجہ اپنی طرف کھینچنے لگا۔

”شکر ہے تم بہت نہیں بولتیں ورنہ مجھے مشکل ہو جاتی۔“

”یہاں کی مجھے ”کون“ بہت پسند ہے۔“ فور ٹریس پہنچ کر پارکنگ میں گاڑی پارک کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”کون ہاتھوں میں لیے وہ دونوں یونٹی گھومنے لگے، اسے اتنا عجیب لگ رہا تھا جیسے مدتوں بعد کسی پرندے نے آسمان دیکھا ہو۔“

”جلدی کھاؤ بھی کون کھل رہی ہے۔“ وہ ایسے کھوئے دیکھ کر بولا۔



”یہاں بوتیکس میں بڑی ورائٹی ہوتی ہے لیکن میٹرل اتنا اچھا نہیں ہوتا۔“ ونڈو میں خوبصورت ڈریسز زیب تن کیے اسٹینچوز کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا، ”وہ جیب رہی اسے تو سارا کچھ ہی بے حد قیمتی اور انوکھا لگ رہا تھا۔“

”اوہو چلو کوئی بات نہیں، یہ لو اس سے صاف کرلو۔“ اس نے پیٹ کی جیب سے ٹشو نکال کر اسے دیا۔  
”فضہ! تمہاری برتھ ڈے کب ہوتی ہے۔“ وہ اپنے دھیان میں قمیص صاف کر رہی تھی جب اس نے پوچھا۔  
”میس اکتوبر کو۔“ اس نے ایک لمحے کو ہاتھ روک کر جواب دیا۔

”میس اکتوبر تو برسوں ہے۔“  
”ہاں۔“ وہ آگے چل پڑی۔

”چلو PACE چلتے ہیں، میں ابھی تک وہاں نہیں گیا۔“ وہ ایک دم سے آگے بڑھ کر بولا وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی، وہ خود ہی جلدی جلدی پروگرام بنالیتا تھا۔

”اوہو چلو نا۔ ابھی جاؤ یا رات تم بہت سست ہو۔“ وہ اس سے یوں بے تکلف تھا جیسے صدیوں کی جان پہچان ہو۔  
PACE نے جیسے اس کی آنکھیں کھول دیں، وہ حیرت سے ایک ایک چیز کو رک رک کر دیکھ رہی تھی۔  
”مجھے ڈریسز کا جنون ہے، اچھے اور قیمتی ڈریسز۔ آؤ وہاں وارڈروب کی طرف چلتے ہیں۔“ وہ سیکنڈ فلور پر پہنچ کر بولا۔

اتنے خوبصورت اور قیمتی ملبوسات جن کی قیمتیں ہی چار چار پانچ پانچ ہزار سے اشارت ہوتی تھیں۔ ایک ایک لباس اس کی توجہ کھینچ رہا تھا۔

”فضہ! یہ دیکھو یہ کیسا ہے؟“ دور کھڑے رہنے سے آواز دی۔

بائل گرین پرفیڈموتیوں کا کام تھا، سلک ٹائپ کا کپڑا تھا، انتہائی نازک اور مہین۔ اس پر اتنا ہی نازک اور فینسی کام اس نے یوہی ٹیک کھما کر پڑھا پانچ ہزار قیمت تھی اس کی۔  
”کیسا ہے؟“ وہ تو صیغی نظروں سے سوٹ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”اچھا ہے۔“

”صرف اچھا ہے۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”نہیں بہت اچھا ہے اور قیمتی بھی“ وہ سوٹ کو نظروں میں تولتے ہوئے بولی۔  
”اس کا خوبصورت ہونا ہی اس کی قیمت ہے، چلو چلتے ہیں۔ مجھے تو بھوک لگ رہی ہے، ریسٹورانٹ سے کچھ کھاتے ہیں۔“ وہ بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے بولا اور وہ جھجک کر رک گئی۔

”چلو نا بھئی، ہاتھ ہی تو پکڑا ہے تو کیا ہوا ہم دونوں دوست بھی تو ہیں نا۔“

وہ اس کے رکنے کی وجہ سمجھ کر فوراً بولا، ”وہ زبردستی ہاتھ چھڑانے لگی۔“

”تم ایسے نہیں چلو گی۔ یہ لو۔“ اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

”اب چلو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

♥ UrduPhoto.com

”یہ عبیرہ کہاں سے اس وقت آگئی۔ اس کا تو نام چار یا پانچ بجے کا ہے۔“ انکل جمال کا لہجہ خفگی لیے ہوئے تھا۔  
”کمپیوٹر کالج سے پانچ بجے آئی ہے۔“  
”کل وہ کمپیوٹر کالج نہیں گئی تھی میں نے ہی اسے منع کیا تھا کہ کالج سے سیدھی گھر آجائے۔ مہمانوں کو آنا

UrduPhoto.com

ہے تانیہ کو دیکھئے۔“ غزالہ آنٹی کا لہجہ شرمندہ شرمندہ سا تھا۔

”یہ مہمان تانیہ کو دیکھئے آرہے تھے یا اسے جو تم نے اسے اتنے اہتمام سے گھر بلا لیا۔ غزالہ! تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔“ انکل جمال کا بدلا ہوا لہجہ عبیرہ کو بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”یہ تانیہ جو نہیں مانتی تھی، صحیح طریقے سے مہمانوں کو اٹینڈ کرنے کے لیے منہ پھلائے اندر باہر پھر رہی تھی۔ جو تین چار اوٹ پٹانگ پر پوز لڑ آئے تھے ان کی وجہ سے۔ میں نے کہا وہ عبیرہ کی بات مانتی ہے، وہ ذرا جلدی گھر آکر اسے ڈھنگ سے تیار کر دے گی۔ میں نے تو بھلا ہی چاہا تھا اب مجھے کیا پتا تھا۔“ ان کا شرمندہ لہجہ ہنوز برقرار تھا۔

”تمہیں ان سے کہنا تھا کہ عبیرہ سے بڑی ابھی دو بیٹھی ہیں، ان کے ہوتے ہوئے ہم چھوٹی کو کیسے بیاہ سکتے ہیں۔“ انکل جمال ناگواری سے بولے۔

”میں نے یہی کہا تھا کہ عبیرہ تو ابھی بڑھ رہی ہے، اتنی جلدی اس کا کرنا ہمارے لیے تو ممکن نہیں اور نہ ہی بڑی بہنوں کی موجودگی میں یہ اچھا لگتا ہے، ہر کام وقت پر اچھا لگتا ہے۔“  
”پھر کیا کہنے لگیں۔“

”کہنے لگیں، چلیں ہم کچھ انتظار کر لیں گے سال ڈیڑھ سال۔ عبیرہ کا گریجویشن مکمل ہو جائے گا اور اس دوران آپ اپنی دونوں بیٹیوں کا کہیں کر لیں، اللہ ان کا سبب لگا دے گا، آپ ابھی فی الحال متنگنی کر دیں۔“

”متنگنی کر دیں۔“ انکل جمال بڑبڑائے۔ ”اتنی اوپر کی کمائی آرہی ہے نا ہماری، یا ہم نے بینک کالے کئے ہوئے حرام کے پیسوں سے جو متنگنیاں کرتے پھریں۔ یہاں فرائض کے لالے پڑے ہوئے ہیں، انہیں متنگنیوں کی سوجھ رہی ہے۔ کہنا تھا لی بی بی ہم اتنے رئیس لوگ نہیں ہیں۔“ انکل جمال پر یہ انداز، یہ لہجہ بالکل سوٹ نہیں کر رہا تھا، اتنا پڑھا لکھا، سنجیدہ عقل مند استاد اور اتنا پست لہجہ۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔

”میں نے بھی یہی کہا تھا، یہ تو بعد میں ربیعہ کو میں نے فون کیا تھا۔“

”ہاں ربیعہ کیا کہتی ہے؟“ وہ جلدی سے ان کی بات کاٹ کر بولے۔

”وہی تو بتا رہی ہوں، وہ بھی اسی بات پر خفا ہو رہی تھی کہ آپ نے عبیرہ کو تانیہ کے ساتھ کیوں بھیجا، اب کوئی آنکھ کا اندھا بھی ہو گا تو بھی عبیرہ کے ہوتے ہوئے تانیہ کو بھلا کیسے پسند کرے گا۔ میں نے اسے بھی یہی بتایا کہ تانیہ کی وجہ سے مجھے ایسا کرنا پڑا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ اب مسز حق کسی اور بات پر نہیں مان رہیں وہ عبیرہ کے لیے

مصر ہیں، متنگنی کرنا چاہتی ہیں ان کا ایک ہی بیٹا ہے۔ ربیعہ کہتی ہے میں نے ان سے بات کی تھی کہ آنٹی ہم یہ انجیجنٹ وغیرہ فورڈ نہیں کر سکتے، ہمارے والدین کو ابھی چار بیٹیوں کو اور بھی دیکھنا ہے تو وہ کہنے لگیں کہ آپ لوگ کچھ نہ کریں، میں صرف اپنی فیملی کے چند قریبی لوگوں کو لاؤں گی صرف چائے پر اور لڑکی کو حسب توفیق انگوٹھی وغیرہ پہنا جاؤں گی میری بس اتنی خواہش ہے اور میں تو اپنے بیٹے کا اب عبیرہ کے سوا اور کہیں سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”انہوں نے تو چائے کا کہہ کر فارغ کر دیا، ہم اتنے بے حیا ہیں کہ خالی گرم پانی پر مہمانوں کی تواضع کریں گے۔ کم از کم دس پندرہ ادھر سے ہوئے تو کیا ادھر سے اتنے نہیں ہوں گے۔ اس کے چچا تایا پیچھے رہیں گے کیا تو ان سب کی خاطر تواضع پر کم از کم چار پانچ ہزار اٹھ جائیں گے۔ وہ لڑکی کو دے دلا کر جائیں تو ہم لڑکے کو ایک انگوٹھی بھی نہ ڈالیں۔ اس کے پچھلے ہمیں معاف کر دیں گے بھلا۔ طرح طرح کی باتیں نہ بنائیں گے کہ ہم اتنا بھی نہ کر کے اپنی بیٹی ہوتی تو پھر دیکھتے۔ غزالہ بیگم! یہ تو کانٹوں بھرا رستہ ہے عبیرہ کا معاملہ، پھونک پھونک کر قدم رکھیں گے تو بھی لوگ باتیں بنانے سے باز نہیں آئیں گے، بہتر ہے ان فضول رسموں میں پڑیں ہی نا۔ تم صاف ان سے



کہہ دو ہمیں ابھی عبیدہ کا کرنا ہی نہیں چارپانچ سال تک۔ اگر وہ اتنا انتظار کر سکتے ہیں تو کر لیں ورنہ ہمیں کوئی شوق نہیں ہے ان سے رشتہ داری جوڑنے کا۔“ ان کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا، آج کل تو وہ ویسے بھی چڑچڑے ہو رہے تھے۔

”اب یوں منہ کھول کر بھی جواب نہیں دے سکتی، ربیعہ بھی کہتی ہے امی! بہت اچھا رشتہ ہے اسے یوں نہ گنوائیں۔“ غزالہ آنٹی ذرا پست لہجے میں بولیں۔

”تو کر دو تم اور ربیعہ مل کر میرے توانا پلے نہیں ہے کہ میں یہ چونچلے اٹھاتا پھروں۔ جب تک تانیہ اور ثوبیہ کا کہیں نہیں ہو جاتا میں عبیدہ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اب آگے تمہاری مرضی۔ پہلے مجھ پر ان دونوں کا حق ہے اس کے بعد عبیدہ کا، جہاں تک اس کی بہتر پرورش کا سوال تھا وہ ہم نے کی ہے اعلیٰ تعلیم بھی دلوادیتے ہیں نے اپنی چادر اپنی اوقات سے بڑھ کر اس کے لیے کیا ہے اب میں اس کی خاطر اپنی بچیوں کے ارمانوں کے گلے تو نہیں گھونٹ سکتا۔ تم خود سوچو۔ عبیدہ کی منگنی ہو گئی تو تانیہ مزید احساس کمتری کا شکار ہو جائے گی۔ اسے ایم اے کے تیس سال ہے کچھ سال اور گزرے وہ اور رائج ہو جائے گی پھر کہاں اس کے لیے رشتے ڈھونڈتے پھریں گے۔ اس سال ثوبیہ کا گریجویشن بھی مکمل ہو جائے گا مجھے ان دونوں کی پہلے فکر ہے اور یہ حق بات بھی ہے۔

عبیدہ کا ہم نہ بھی کر سکے تو اس کے کرنے والے بہترے ہیں کروڑ پتی چچا ہے اس کا۔ اب جو تانیا نے ابرار کی شادی کر کے لاکھوں کا ایم کھیلا ہے وہ آج چاہے تو عبیدہ جیسی دس لڑکیوں کو آسانی سے بیاہ سکتا ہے اور وہ ان کی باہر والی پھوپھی کو کس چیز کی کمی ہے سونے کی کان پر بیٹھی ہے۔ عبیدہ کو پھنسانا ان لوگوں کے لیے کیا دشوار ہو گا۔ عبیدہ کے تو بہت ہیں کرنے والے کل کو بھائی بھی جوان ہو جائے گا کمانے لگے گا۔ میری بچیوں کا کون ہے کرنے والا ایک صرف میں آج خدا نخواستہ میری آنکھیں بند ہو جائیں ان کے سروں پر چادر دینے والا کون ہے کون ساما چاچا بیٹھا ہے ان کو سہارا دینے والا۔ کون سا ان کا کوئی بھائی ہے جو سر پرستی کرے گا ان کی۔ ان کا تو خدا کے بعد میں ہی

آسرا ہوں نا۔ عبیدہ کے بڑے وارث ہیں تم اس کی فکر نہ کرو۔ اس کا خود ہی وقت آنے پر ہو جائے گا۔ اس وقت سوال تانیہ کا ہے وہ ان حالات کی وجہ سے دن بدن چڑچڑی ہوئی جا رہی ہے۔ اوپر سے نوکری کوئی ڈھنگ کی نہیں مل رہی۔ ملی بھی تو وہی اسکول بچہ ہی اس میں کیا رکھا ہے ساری عمریں گنوا کر بھی ہم اس قابل نہیں ہیں کہ اپنی اولاد کو آسودگی کے چند دن ہی دے سکیں گھٹ گھٹ کر ہم نے زندگی گزار دی اور سسک سسک کر وہ گزار دیں یہ کہاں لکھا ہے؟ آج وہ نوکری کر لے لوگ فوراً نوکری پیشہ لڑکیوں کو بڑی عمر میں شمار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تم ساری فکریں چھوڑو تانیہ کا سوچو۔ عبیدہ تو ماشاء اللہ خوش شکل ہے اور ابھی پڑھ رہی ہے کمپیوٹر کورس کر لے گی بی ایس سی کرے گی تو بڑی اچھی جاب مل جائے گی اسے۔ اصل فکر تو مجھے اپنی بیٹیوں کی ہے نہ شکل و صورت میں خود دھوپ کے چاند اور نہ تعلیم بہت اعلیٰ اور قابل تعریف سیرت کو کون پوچھتا ہے آج کل اور باپ کا کون سا ایسا سٹینڈ ہے کہ اس کی وجہ سے رشتوں کی لائیں لگ جائیں۔“ انکل جمال کا سانس پھولنے لگا۔

”صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ میری کو لیک ہے سسکی اس نے ایک رشتہ بتایا ہے کل شام کو وہ لوگ آئیں گے۔ اگر وہ بچہ ہو تو باپ کا موٹر سائیکل کا شوروم ہے وہاں کام بھی کرتا ہے اور کسی دفتر میں جاب بھی کرتا ہے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں زیادہ لمبی چوڑی فیملی بھی نہیں ہے۔ دو بہنیں شادی شدہ ہیں ایک بہن اور ایک بھائی ہے اس سے چھوٹا۔ اللہ کرے انہیں تانیہ پسند آجائے۔“

”اللہ کرے میرے سینے کا بوجھ کچھ تو کم ہو۔ اچھا رشتہ ہے میرے دل کو بات لگی ہے۔ چلو تم مسز حق کی طرف سے بھی بالکل خاموشی اختیار کر لو اگر تانیہ کا ہو گیا تو ہم مسز حق کو تین چار سال کا کہہ کر ہاں کر دیں گے۔ اگر انہیں زیادہ لگن ہوئی تو ہاں جائیں گی۔“

”ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں، یوں بیٹیوں کے سلسلے میں نکاحا جواب دینا اچھا نہیں ہوتا، وقت کب سدا ایک سار رہتا ہے عبیدہ کا بھی خیال تو ہم ہی نے کرنا ہے۔“ غزالہ آنٹی کو ابھی بھی عبیدہ کا خیال تھا۔

”ہاں اچھی بات ہے، بس دعا کرو کل کام بن جائے اور کل تم عبیدہ کو نہ بھیج دینا تانیہ کے ساتھ۔ کل انہیں کس وقت آنا ہے؟“

”یہی چارپانچ بجے۔“

”ہاں ٹھیک ہے اب تم ذرا خیال رکھنا میں عبیدہ کا دشمن نہیں ہوں۔ لیکن سارے حالات تمہارے سامنے ہیں اور اپنی بیٹیوں کو ترجیح دینا بہر حال میری مجبوری ہے۔ تم جانتی ہونا۔“

”ہاں مجھے پتا ہے اچھا میں دیکھوں بچیاں ابھی تک آئیں نہیں مندی سے۔“ غزالہ آنٹی اٹھتے ہوئے بولیں تو وہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ آئی۔

محلے میں کسی لڑکی کی مندی تھی، انہوں نے بہت اصرار کیا تھا وہ سب تیار ہو کر گئی تھیں۔ عبیدہ کے سر میں شدید درد تھا وہ تھوڑی دیر بعد معذرت کر کے آگئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، غزالہ آنٹی اور انکل جمال کی باتوں کی آواز باہر تک آرہی تھی اور پھر گھر کون سا بڑا تھا جو دو بندے اونچی آواز میں باتیں کریں اور تیسرے کو سنائی نہ دے سب کچھ سن کر اس کے سر کا درد اور بڑھ گیا۔

♥ ♥ ♥ ♥

”عبیدہ! یہ میرے ٹیلر سے آتے وقت کپڑے لیتی آتا مجھے کل مسز شوکت کے گھر میلاد پر پن کر جانے ہیں۔“ صبح غزالہ آنٹی نے اسے رسید پکڑاتے ہوئے کہا۔

”غزالہ آنٹی! ٹیلر کی شاپ تو میرے کالج سے خاصی دور پڑتی ہے۔ مجھے دو بسیں بدلنی پڑیں گی، آکر لے آؤں گی گڑیا کو ساتھ لے جاؤں گی۔“ اس نے رسید پکڑ لی۔

”آکر تم اس قدر تھکی ہوئی ہوتی ہو، پھر شام زیادہ ہو جائے گی۔ تم آج ہی لے آنا۔“ انہوں نے رسید اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

”آئی! مجھے شام ہو جائے گی راستے میں۔ آپ کوئی اور کپڑے پن جائیے گا۔ پرسوں میری کمپیوٹر کلاس آف ہے پرسوں لے آؤں گی۔“

”نہیں تانیہ! مجھے کل یہی پہننے ہیں اور سارے کپڑے تو میں بیسیوں بار اسکول پن کر جا چکی ہوں۔ تم لے آنا پلیز۔“ وہ ذرا نرمی سے بولیں۔

”آپ کو اسکول نہیں جانا۔“ وہ انہیں گھر کے چیلے میں پھرتے دیکھ کر بولی۔

”ہاں جاؤں گی ابھی ذرا ٹھہر کر۔“ وہ نظریں چرا کر آگے بڑھ گئیں۔

تو ایک دم اسے رات کی بات یاد آئی کہ آج تو مہمانوں کو آنا ہے۔ اسی لیے آنٹی اسکول سے چھٹی کر سکیں گی اور اسی لیے اسے کپڑے لینے بھیج رہی ہیں ماکہ وہ شام گئے گھر لوٹے۔ اس کے گلے میں جیسے کچھ پھنسنے لگا، وہ کالج بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

”اپنی مائیں کیوں مرجاتی ہیں اگر انہوں نے بچوں کی خوشیاں دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہنا ہوتا تو بچوں کو بھی مرجانا چاہیے۔ نہیں تو بعد میں وہ روز مرتے ہیں دن میں کئی بار۔ ماما آپ کے بغیر خوشیاں بھی شرمندگی بن گئی ہیں۔ ماما آپ کیوں مر گئیں۔“ بس کا انتظار کرتے ہوئے وہ آنکھیں جھپک جھپک کر آنسو اندر اتارتی رہی۔



## خوشبو کا کوئی گھر نہیں رخسانہ نگار

اس کے سوتے ہوئے چہرے پہ تھی ایسی مسکان  
کوئی خواب آنکھ نے دیکھا ہو جیسے نیا نیا سا  
خزاں تو یوں بھی گزر ہی جانی تھی  
موسم بہار بھی اب کے لگتا ہے جیسے نیا نیا سا

”جب بھی میں اپنے بچپن کی وہ بھیا تک شام یاد کرنا چاہتی ہوں خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔  
ماما پاپا دونوں میں سے ایک ہی بچ جاتا تو ہم یوں در بدر نہ ہوتے وہ ہمیں اپنے پروں میں سمیٹ لیتے۔ اب گزشتہ دس  
سالوں سے میں نے اپنے بہن بھائی کی شکلیں نہیں دیکھیں۔ ایک آبی اور عبیدہ آبی تو ایک دوسرے سے مل لیتی  
ہیں اور میں۔۔۔؟“ اس نے پھر گہرا سانس لے کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنا شروع کر دیا، آنکھیں جھپک جھپک کر باہر  
آنے کو بے تاب آنسوؤں کو اندر اتارنے لگی۔

رہبر دلچسپی سے اس کے خوبصورت نقوش سے مزین اس چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا۔ رہبر نے اسے  
وہی گرین والا سوٹ گفٹ کیا تھا۔ اس کے حسین وجود پر جگمگاتے ہوئے سوٹ جیسے اپنی قیمت پوری کر گیا تھا وہ دونوں شام کو  
ہی باہر آگئے تھے۔ ایمبیسٹر میں اس نے نیبل ریزرو کر رکھی تھی کب تک کھاتے ہی وہ بے حد اداس ہو گئی تھی۔  
دھیرے دھیرے بولتے ہوئے وہ اتنے برسوں کا اندر دبا ہوا غبار بارہنگا لے گئی۔  
”ویسے تمہارے رشتہ داروں کو یوں نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم لوگوں کو اس طرح ایک دوسرے سے دور دور۔“

وہ کچھ دیر بعد بولا تو وہ گیلی آنکھوں سے محض اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

”چھا چھوڑو اللہ کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ زخموں کو جتنا کرایہ دے دیتا ہے اب میں ہوں  
تمہارے ساتھ۔“ اس کے کبھے کا یقین اس کی آنکھوں سے ہویدا تھا۔ وہ ملائمت سے مسکرا رہا تھا فضا بھی سر ہلا  
کر دھیرے سے مسکرائی۔

”گڈ۔ فضا! یہ گفٹ میری طرف سے تمہارے ہونے پر۔ تم اپنے ہونے پر ابھی افسوس ظاہر کر رہی تھیں اور  
میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ تم ہو اور میرے لیے ہو پلینز۔“ کوٹ کی جیب سے بلیک منیفلڈ ڈبہ نکال کر رہبر  
نے اس کی طرف بڑھائی اسے جیسے کسی بچھوٹے کاٹ لیا وہ تڑپ کر کرسی پر پیچھے ہٹ گئی۔

”اس میں کیا ہے۔ یہ میں نہیں لوں گی۔“ وہ اٹک اٹک کر بولی اس کا چہرہ تن سا گیا تھا۔

”اس میں کوئی سانپ یا بچھو نہیں ہے جو تم یوں کانپنے لگی ہو۔ یہ وہی ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔“ وہ دم دم آواز میں  
بولا۔ ”ہاں فضا! میں تم سے دل سے محبت کرنے لگا ہوں آج سے نہیں اس لمحے سے جب میں نے تمہیں پہلی بار

رہے ہاتھ میں لیے اپنے سامنے کھڑے دیکھا تھا۔

فضا! میں کوئی بہت بڑا شخص نہیں ہوں لیکن اس بل میرا دل کیونڈے نشانے سے گھائل ہو گیا تھا۔  
میں نے خود کو کنٹرول کرنے کی اس خیال کو جھٹلانے کی بہت کوشش کی مگر سچ یہی ہے کہ مجھے اس سچائی کو مان لینا

پڑا کہ تم نامعلوم کیسے کہیں خفیہ رستے سے میرے دل میں آن بسی ہو اب دوری بہت محال ہے فضا! آئی لو۔  
ریلی آئی ایکسپریس ریلی کو لو۔ بلیو۔“ وہ ایک لمحے کو چپ ہوا جیسے خود پر قابو پارہا تھا۔ ”میرے دونوں پیچھے

ہیں میں ایک دو ہفتوں بعد واپس جاؤں گا تو اپنی می پاپا کو ساتھ لاؤں گا۔ ویسے پاپا چند روز میں آنے والے ہیں وہ  
میری پسند سے مل کر واقعی بہت خوش ہوں گے ان دونوں نے زندگی کے ہر معاملے میں ہمیشہ میری پسند کو ترجیح دی

ہے اور یہ معاملہ تو میری زندگی کا اہم ترین ایٹم ہے۔ ہر حال چند دنوں تک میں اپنے اس فیصلے کو سب کے سامنے  
سیلیبرٹ کروں گا کافی احوال اسے میرے دل کی خوشی سمجھ کر۔ ابھی قبول کر لیا میری محبت کا تو کن سمجھ کر۔ وہ  
یونہی ذرا سانس کر لیا وہ خاموشی سے اسے تنگے لگی۔

”پلینز۔“ اس نے ڈب سے اس کی طرف بڑھائی وہ بے حس بیٹھی رہی۔

”اچھا چلو میں خود ہی کھول کر پہناتا ہوں۔“ اس نے خود ہی ڈبیا کھول کر اس میں سے انگوٹھی نکالی ”دیکھو کیسی  
ہے؟“ چھوٹے چھوٹے ہیروں سے مزین خوبصورت دل کی شکل کی نازک سی انگوٹھی اس کے تصور سے بڑھ کر  
تھی۔

”پلینز۔“ اس نے انگوٹھی آگے بڑھا کر اس کی انگلی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

”تمہیں کوئی اعتراض ہے تو کہو یا میری محبت پر شک ہے۔“ وہ اس کی مسلسل خاموشی پر بولا۔

”یہ ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ کافی دیر بعد دم آواز میں بولی۔

”کیا ٹھیک نہیں ہے اس طرح یہ خفیہ انگیجمنٹ کرنا میں تمہیں بتا چکا ہوں نا یقین کرو یہ صرف چند دنوں  
کی بات ہے اور انگیجمنٹ سے کیا ہوتا ہے جو تم ڈر رہی ہو۔ یہ بات تو صرف ہم دونوں کے درمیان ہے میرے  
نزدیک یہ مقدس ترین قسم سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ تمہیں میرا یقین نہیں؟“

”ممنی کی اگر کوئی حیثیت نہیں تو پھر اس کی ضرورت کیا ہے میں نے آپ کی سب باتوں پر یقین کر لیا۔ اس  
رنگ کے نہ ہونے پر بھی۔ جب آپ کے پیرس آئیں گے تب۔“ وہ جھجک کر چپ کر گئی۔

”تب بھی سب کچھ ہو گا لیکن یہ تو تحفہ ہے تمہاری سالگرہ کا۔ میں نے بہت محبت بہت محنت اور بہت شوق  
سے خریدا ہے اگر تم اس کو قبول کر لو گی تو تمہیں معلوم مجھے کس قدر خوشی ہو گی۔“ لفظ نہیں بدلتے جذبے

بھی نہیں بدلتے بس محسوس کرنے کا انداز اپنا اپنا ہوتا ہے۔ وہ اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی۔

”فضا! یہاں لاہور ہی میں میرا سارا بچپن گزرا ہے زسری سے لے کر کلاس سیونٹھ تک میری ایک کلاس فیلو  
تھی پریمیاں۔ اگر میں نے تمہارا بچپن یا تم نے اس کا بچپن دیکھا ہوتا تو تم دونوں کے جڑواں ہونے میں کوئی شک نہ

رہتا جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو یہ بات میرے دماغ میں بار بار جھپتی رہی کہ میں نے تمہیں پہلے کہاں  
دیکھا ہے۔ دوسری ملاقات میں مجھے یاد آگیا کہ پریمیاں جسے میں پری کہا کرتا تھا وہ تمہارا ہی عکس تھی بالکل اسی  
طرح معصوم اور حسین۔ ہم دونوں کا آٹھ سالوں کا ساتھ تھا ہم دونوں میں بے تحاشا دوستی تھی اور ہم اپنی دوستی

کے درمیان کسی تیسرے کا وجود برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کیا کرتے تھے وہ  
نئے ہر چیز ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھی اور میں اسے۔ میری دیوانگی کو دیکھ دیکھ کر وہ اکثر مجھے چھیڑا کرتی تھی۔

”رہبر! تمہیں پتا ہے نا پریمیاں اس زمین پر نہیں رہتیں وہ تو دور پہاڑوں کے اس پار فیری لینڈ میں رہتی ہیں تم  
کے ایک دن میں بھی وہیں چلی جاؤ گی پھر تم کیا کرو گے۔“ تو میں اس کی بات پر بری طرح خفا ہو جایا کرتا تھا وہ

میں نے مجھے منٹوں میں منالیا کرتی تھی۔ لا کالو کی ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے کے ہیل مزے سے شیئر  
یا کرتے تھے۔ وہ کرکٹ اتنی دلچسپی سے کھیلتی جتنی دلچسپی سے میں اس کی گزروں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔

پھر ایک دن واقعی وہ ہو گیا پری اپنے دس چلی گئی اور کتنی عجیب بات ہے کہ وہ شام بھی اس کی سالگرہ کی شام  
نہ بازار سے اپنے پاپا کے ساتھ اپنے شوز لینے گئی تھی کہ روڈ ایکسیڈنٹ میں۔“ اس کی آواز بھر گئی۔ ”اور

جو اسے کہا کرتا تھا کہ میں رہبر ہوں تمہیں واپسی کا صحیح راستہ دکھا کر واپس لے آؤں گا۔ کچھ بھی نہ کر سکا اس  
ناموت کی وحشت میرے سر سے کئی ماہ تک نہیں اتری میرا تعلیمی سال ضائع ہو گیا ہر چیز سے میرا دل اٹھ گیا۔

اس کے کمرے سے میں اس کی ساری گریباں اٹھالیا تھا بستر پر لیٹا ان کو تکتا رہتا۔ پاپا امریکہ شفٹ ہو گئے۔ وہاں کی

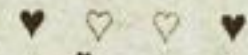


تیز رفتار زندگی نے آہستہ آہستہ مجھے بھی جکڑ لیا اگرچہ میں اسے بھولا تو نہیں ہاں اس کی یاد کی شدت کو میں نے مصروف زندگی میں گم کر دیا اور جب تمہیں پہلی بار دیکھا تو بے ساختہ بچپن کی وہ پہلی وابستگی یاد آگئی۔ جیسے اتنے سالوں بعد وہ اتنا حسین روپ لے کر میرے سامنے مجسم ہو گئی ہو اور میں کوشش کے باوجود تمہیں پری کبھی نہیں کہہ سکا کہ کہیں پھر تم مجھ سے بچھڑ نہ جاؤ اور چاہنے کے باوجود یہ بھی نہیں جتا سکا کہ دیکھا تمہارا بھی فنیوی لینڈ میں میرے بغیر دل نہیں لگا اس لیے تم لوٹ آئی ہو۔

”فصہ! کہو مجھ سے کبھی دور نہیں جاؤ گی وعدہ کرو فصہ۔“ وہ ایک دم سے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بولا۔  
”فصہ! وعدہ کرو ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی میں ہمیشہ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا وعدہ۔“ جذبات کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”وعدہ!“ اس نے اپنا منہ ساتھ اس کے مضبوط ہاتھ میں دے دیا اس نے ہولے سے مٹھی بند کر لی۔  
”میں بھی وعدہ کرتا ہوں“ تمہیں تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا تمہارے علاوہ اب میری زندگی میں محبت بن کر کوئی نہیں آئے گا بس ایک بار مئی کو منا کر لے آؤں پھر ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔“ اس نے آہستگی سے مٹھی کھول کر انگوٹھی اس کے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنا دی۔

”فصہ! اب انگوٹھی تمہیں میرے بیان کی ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی اسے کبھی خود سے جدا نہ کرنا“ یہ ہمارے مضبوط تعلق کی پہلی گواہ ہے اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ وہ خاموشی سے جگر جگر کرتے ہیروں سے پھوٹی شعاعوں میں محبت کی ان قسموں کا عکس تلاش کرتی رہی۔



اور کفیل ماموں کے بارٹ اٹیک نے جیسے اس سارے قصے میں فیصلہ کن کیل ٹھونک دی اس دن کی لڑائی کے بعد ابراہیمائی نے گھر آنا بہت کم کر دیا تھا، تقریباً نہ ہونے کے برابر۔ آتے بھی تو چند گھڑی کھڑے کھڑے تباہی جی کے کمرے میں کچھ دیر بیٹھتے، ادھر ادھر کی لالچنی سی باتیں کرتے جو چند منٹوں میں ختم ہو جاتیں۔ دونوں خاموش گونجتے سنائے میں اجنبیت کی سزا بھگتتے لگتے۔ تایا جی نے تو اب ویسے ہی چپ کی چادر اوڑھ لی تھی، اگلے ماہ وہ ریٹائرڈ ہو رہے تھے۔ انہوں نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ شاید وہ تائی جی کی پریشان کن سوال کرتی نگاہوں سے گھبراتے تھے یا پھر وہ انہیں مزید شرمندگی سے بچانا چاہتے تھے اور ویسے بھی اب سمجھانے یا لاتاڑنے کا کیا فائدہ تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا یہی وہ چیلنج تھی جو وہ پہلے تائی جی کو سمجھانا چاہ رہے تھے۔ جو وہ سمجھنا نہیں چاہ رہی تھیں اب سمجھ چکی تھیں تو اس سمجھ کو سہارا نہ مل رہا تھا۔

ابراہیمائی کا رشتہ تائی جی سے اب محض ”السلام علیکم امی“ کا رہ گیا تھا۔ تایا جی کے ساتھ ملاقات میں خاموشی طویل ہو جاتی تو وہ خود ہی اٹھ کر باہر آ جاتے۔ دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر یوں ہی ادھر ادھر دیکھتے، بھائیں بھائیں کرتا گھر جیسے آوازوں سے خائف تھا وہ بے آواز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتے۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھتے یا لیٹ جاتے۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ تائی جی کے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر ”چھائی میں جا رہا ہوں خدا حافظ“ کہتے اور باہر نکل جاتے۔ چند ہی لمحوں میں ان کی گاڑی کے ٹائر چرچراتے اور پھر باہر بھی سناٹا چھا جاتا۔

تائی جی دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھیں، غم اندر ہی اندر کھانے لگا تھا۔ وہ گھر سے بھی خاصی لاپرواہ ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کے جوڑوں کا دروازہ لگایا گیا تھا، تایا جی بھی تو انہیں کسی قسم کی کمپنی نہ دیتے تھے۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ جیسے تنہا ہو کر رہ گئے تھے اور ایمین کو ان دونوں پر خواہ مخواہ ہی ترس آنے لگا تھا۔ ان کے شروع کے سخت رویوں

اور اس ظالمانہ فیصلے کی وجہ سے وہ اب تک دل میں ان سے خائف تھی۔ مگر اب جیسے یہ کدورت ہمدردی میں ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ دونوں ہی کھانے پینے کے بے حد شوقین تھے اور اب جیسے دونوں ہی کو کھانے پینے کی پروا نہ رہی تھی۔

وہ خود ہی تینوں ٹائم ان کے کھانے کا خیال رکھتی، اصرار کر کے انہیں کھانا کھلاتی۔ چائے منٹوں میں بنا کر لے جاتی، انہیں باتوں میں لگانے کی کوشش کرتی۔ کمرے سے باہر آنے کو کہتی یونیورسٹی سے آکر وہ ہر ممکن طور پر ان کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی، اتنے برسوں کے ساتھ نے عجیب سی انسیت پیدا کر دی تھی۔ وہ دونوں بھی اس کے بے حد عادی ہو گئے تھے۔

ولید کو ابھی تک کوشش کے باوجود نوکری نہیں مل رہی تھی اور یہ ہی وہ گھر کا واحد فرد تھا جس سے ایمین ابھی تک خار کھاتی تھی۔ بہت کم مخاطب ہوتی تھی اس کے آنے پر ادھر ادھر کھسک جایا کرتی تھی۔ حالانکہ اب تو اس کا رویہ خاصا بدل گیا تھا خاص طور پر ایمین کے ساتھ وہ بہت نرم لہجے میں بات کرتا تھا اور اس کا یہی نرم لہجہ ایمین کو جھلسا جاتا۔ سارے زخم جیسے ہرے ہونے لگتے، ولید نے اسے کتنا زچ کیا تھا شروع شروع میں۔ بچپن میں تائی جب بھی گھر سے باہر جاتیں تو وہ ہر چیز کو تالا لگا کر جاتیں۔ بچپن کو تالا، ٹیلی فون کو تالا، لائونج کو تالا، غرض گھر کی ہر ہر چیز کو وہ جیسے نظر بند کر جاتیں اور ایمین برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھی بھوک کو ٹالنے کے جتن کرتی رہتی اور ولید کے پاس تائی جی کے ہر تالے کی دوسری چابی موجود ہوتی تھی۔ وہ تائی جی کی غیر موجودگی میں گھر آنا بچپن کھول کر فریج کا ہر مزیدار آئٹم اس کے سامنے مزے لے لے کر کھاتا، فریج میں کوئی فروٹ نہ چھوڑتا۔ ٹیلی فون کا تالا کھول کر ادھر ادھر فضول کالز کرتا، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ عیاشی کر کے سب چیزوں کو اسی طرح لاک لگا دیتا اور گھر سے چلا جاتا اور جب تائی جی گھر آتیں تو ساتھ ایک بھونچال آ جاتا۔ وہ ان کی آمد کے تھوڑی دیر بعد گھر میں داخل ہوتا اور وہ جو قسمیں کھا کھا کر تائی جی کو یقین دلارہی ہوتی تھی کہ اس نے کسی تالے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ آکر جلتی پر تیل کا کام کرتا، تائی جی کو بھڑکاتا، اسے جھوٹی اور مکار کہہ کہہ کر تائی جی سے خوب پڑاتا۔ اس کے اسکول بیگ سے ہوم ورک کی کاپیاں غائب کرنا اس کا معمول تھا۔ اس کے کمرے میں رات کو اچانک پلاسٹک کا سانپ چھپکی چھوڑ دینا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

ایک بار وہ تائی جی کے تالوں کو کھولتا تایا جی کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ انہوں نے پھر جو اس کی پٹائی کی ایمین کے سارے زخموں کو جیسے مرہم مل گیا، اس کے بعد تائی جی نے باہر آنا جانا خاصا کم کر دیا پھر ولید نے کان میں ایڈمیشن لے لیا۔ اس کی توجہ ایمین سے ہٹ گئی۔ اب وہ گھر ہی خاصا لیٹ آتا تھا ایمین نے شکر ادا کیا پھر جوں جوں وقت گزرتا رہا گھر اور خاص طور پر بچپن کی ذمہ داری ایمین کے سر آگئی اب اگر وہ اس سے کوئی ”پنگا“ لینا بھی چاہتا تو تائی جی اسے جھاڑ کر رکھ دیتیں اور اب تو بے روزگاری نے اسے جیسے چپ سا کر دیا تھا پھر ابراہیمائی کا قصہ۔ گھر کا ماحول جیسے سکڑ گیا تھا۔

تائی جی کفیل ماموں کی عیادت کو روز جاتیں پھر آہستہ آہستہ وہ ٹھیک ہو گئے، ان کا رویہ تائی جی کے ساتھ پہلے جیسا تھا محبت بھرا۔ تائی جی کے دل نے پھر سے آسوں اور امیدوں کے محل کھڑے کرنے شروع کر دیے۔ انہیں اس محل کو ایستادہ ہوئے چند روز بھی نہ گزرے تھے کہ درنایاب آگئی۔ وہ بہت مدت کے بعد ادھر آئی تھی اس روز وہ رات بھی ادھر ہی رہی۔ ابراہیمائی تو ناشتہ کر کے اگلے روز آفس چلے گئے وہ تائی جی کے پاس آگئی۔

”آئی جی! میں آپ سے یہ کہنے آئی تھی کہ اب ہم دونوں یعنی میں اور ابراہیم اپنے گھر میں شفٹ ہو رہے ہیں۔ گھر کی فنشنگ کا کچھ کام باقی تھا، وہ مکمل ہو گیا ہے اور ویسے بھی اب پیپا کو میری ضرورت ہے۔ وہ ٹھیک نہیں ہیں آپ کو تو معلوم ہی ہے نا اور آنٹی جب انسان اولاد کی تمنا کرتا ہے تو وہ اسی دن کے لیے کرتا ہے کہ بڑھاپے میں اس



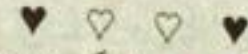
کے کام آئے اور اس وقت تو وہ بلا تخصیص بیٹا یا بیٹی کے لیے نہیں، صرف اولاد کی دعا کرتا ہے اب جبکہ میرے والدین کو میری ضرورت ہے مجھے ان کے پاس ہونا چاہیے۔ ادھر سے کچھ سامان شام کو ملازم آکر ٹرک میں لوڈ کروا کر لے جائیں گے۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ گئی ہوں گی۔" وہ جیسے نیوز بیٹیشن پڑھ رہی تھی آخری بات کر کے پرسکون ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"تو کیا میں نے ابرار کی اسی دن کے لیے پرورش کی تھی کہ وہ اس بڑھاپے میں، جیون کی اس کڑی دہریں ہمیں چھوڑ کر کسی اور کے والدین کی خدمت کو چل پڑے۔ میں ابرار کو ہرگز نہیں جانے دوں گی۔" تائی جی نے اپنے جلال کے ڈولتے سنگھاسن کو جمانا چاہا۔

"وہ تو خیر میرے ساتھ ہی جائیں گے، آپ کی بے جا ضد اور ہٹ دھرمی انہیں روک نہیں سکے گی۔ کس کی اولاد کس کے ساتھ کیا سلوک کرنی ہے۔ اس کا الزام اسے دوسروں کو نہیں بلکہ اپنی ناقص تربیت کو دینا چاہیے۔ اس میں بہر حال میرا کوئی قصور نہیں، آپ کو معلوم ہے اور ابرار کے جانے سے آپ کو کچھ فرق بھی نہیں پڑے گا آپ کے پاس آپ کا دوسرا بیٹا موجود ہے اور کوشش کیجیے گا کہ وہ آپ کو چھوڑ کر نہ جائے۔ اپنے انداز تربیت کا ایک نظر جائزہ لیجیے گا۔ اچھا میں اب چلتی ہوں، باہر ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔ شام کو سامان لینے ملازم آئیں گے خدا حافظ۔"

وائٹ قیمتی نیٹ کے سوٹ میں کسی مغرور شہزادی کی طرح تائی جی کے جذبات کو اپنے نازک پیروں تلے کچلتی وہ جس طرح اس گھر میں آئی تھی۔ اسی ناز و انداز کے ساتھ گیسٹ پارکر گئی اور تائی جی اسے روک بھی سکیں۔ شام کو جب ملازم درنایاب کا سامان اس کی ملازمہ زینت کی زیردایت ٹرک میں لوڈ کر رہے تھے، تو تائی جی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اس قدر وحشت تھی کہ ایسٹن کو لگا وہ ابھی پاگل ہو جائیں گی یا کسی دیوار سے سر دے ماریں گی۔

"تائی جی! اندر آجائیں اٹھ کر ادھر شور ہے۔" اس نے نرمی سے انہیں کندھوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ انہوں نے بے حد سختی سے اس کے دونوں ہاتھ جھٹک دیئے اور سامان کے ڈبے اٹھائے آتے جاتے ملازموں کو پوری توجہ سے دیکھنے لگیں، وہ شاید اپنے ضبط کی آخری حد کو چھونا چاہ رہی تھیں۔



سارہ، نرگس، آنٹی، عاکف، چچا اور رہبر زندانی باہر لان میں کرسیاں ڈالے شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شام بہت خوشگوار تھی، ہلکے ہلکے ہوائے جھونکوں سے ملتے درختوں کے پتے اور آسمان پر تیرتے سرمئی بادل اس کو اور دلفریب بنا رہے تھے۔ چاروں کے درمیان لگتا تھا کوئی دلچسپ گفتگو چل رہی تھی۔ چاروں باتیں کرتے ہوئے مسکراتے تھے، ہنس رہے تھے اگرچہ کوارٹر کی کھڑکی سے ان کے فریض چہرے اور مزاجوں کا تو پتا چل رہا تھا، لیکن نہ تو ان کی ہنسی کی آواز سنائی دے رہی تھی نہ مسکراہٹ کی وجہ لیکن اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس کے پاس ہی بیٹھے ہنس رہے ہیں۔ شاید اس کی بے بسی اور بے چارگی کا مسخراڑا رہے ہیں، حالانکہ یہ منظر تو اس کی آنکھوں نے بار بار دیکھا تھا کہ اس خوبصورت گھر کے مکین اکثر و بیشتر ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کے لیے کھانے کی میز پر یا شام کی چائے پر اکٹھے ہوتے تھے۔ خوش گیلیاں چلاتی تھیں، خوب قہقہے لگاتے جاتے ہیں اور وہ یہ منظر دیکھ کر آرام سے کھڑکی بند کر کے اپنی کوٹھڑی میں بے حس بن کر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ تو آج بھلا کیا خاص بات ہے، جب سے اس نے یہ منظر دیکھا تھا پھر جلی جلی کی طرح اسے چین نہیں آ رہا تھا۔ کبھی کبھار کے دوسرے کوٹھے میں جاتی تو دوسرے پل پھر بے قراری سے کھڑکی سے آتی۔ رہبر زندانی ہاں یہی تو وجہ ہے اس کی بے قراری

واضطراب کی۔ اسے پہلے تو اس منظر نے بھی بے چین نہیں کیا تھا آج محض رہبر کے ان کے ساتھ بیٹھنے سے جیسے اس کے دل کا چین سکون غارت ہو چلا تھا ایک ایک پل جیسے اس کی تڑپ کو بڑھا رہا تھا۔

"یا اللہ میں کیا کروں۔" اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ رگڑ ڈالا اور ہاتھ میں پسینی ہوئی انگلی تھی اس کی ناک سے ٹپکتی رہی وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔

"رہبر! میرے علاوہ کسی اور کے بارے میں نہیں سوچ سکتے یہ انگلی تھی گواہ ہے۔" اس نے انگلی تھی کے ہیروں کو چھو کر خود سے کہا۔

"ارے یہ تو امیر زادوں کا اسٹائل ہوتا ہے۔ اس طرح کے تحائف دے کر لوڑ کلاس میں عشق و محبت بگھارنا اور شادی اپنے اسٹیٹس کے مطابق کرنا اگر وہ اتنی سی چیز کی وجہ سے اپنے جذبات گروی رکھنے لگیں تو محبت کی دنیا میں ان کی بے وفائیوں اور کج ادائیگیوں کے قصے درج نہ ہوتے۔" ہیروں سے پھوٹی شعاعیں ہنس کر بولیں۔

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، وہ میرے ساتھ دھوکا کیوں کریں گے میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔" وہ تڑپ کر کھڑکی میں آکھڑی ہوئی اور اپنی بصارتوں کی تمام توانائیاں یکجا کر کے رہبر کے چہرہ چہرے کو دیکھنے لگی اتنی دور سے اسے اس کی آنکھوں میں کوئی کھوٹ کوئی ریا نظر نہیں آ رہی تھی۔

"چلو دل کے بھلانے کو یہ خیال اچھا ہے۔" ہیروں نے پھر اسے چھیڑا۔

"اگر ایسا ہوا تو میں یہ انگلی تھی اتار کر ان کے منہ پر دے ماروں گی۔" وہ جواباً "چڑ کر بولی۔

"تم ایسا ہرگز نہیں کر سکو گی، بھلا کر سکو گی۔" ہیروں نے انتہائی شرارتی تھے اس کے جذبات کی گہرائی ناپنا چاہ رہے تھے۔

"محبت صرف انگلیوں کی محتاج تو نہیں ہوتی یہ اگر میری انگلی سے اتر بھی گئی تو کیا دل سے محبت نکل جائے گی۔" اس نے خود سے سوال کیا۔

"نہیں" فوراً "جواب آیا "اس اٹھارہ انیس سالہ زندگی میں پہلی بار تو محبت کی بے چکھی ہے، جن کو یہ ہر گھڑی ملا کرتی ہے ان کو تو شاید اس کی قدر نہ ہو، لیکن میری تو تمام حیات کا سرمایہ ہے یہ چند گھونٹ محبت۔ اب رہبر مجھ سے منہ پھیر بھی لیں مگر میں واپس نہیں پلٹ سکتی۔ اس کی چند روزہ رفاقت نے پچھلی زندگی کے سارے عذاب گلاب کر دیے ہیں۔ اب رہبر کے سوانہ کچھ بھائی دیتا ہے، نہ سنائی دیتا ہے تو پھر میں کیسے پلٹ سکتی ہوں۔"

رہبر اور سارہ ایک ساتھ اٹھ کر کھڑے ہوئے اور ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پورچ کی طرف بڑھے۔ رہبر نے سارہ کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا چند ہی لمحوں میں ان کی گاڑی گیٹ سے باہر جا رہی تھی ان کے جانے کے بعد نرگس آنٹی اور عاکف چچا بھی اٹھ کر اندر چلے گئے۔

سارا منظر جیسے سنائوں کی زد میں آ گیا۔ وہ بے جان قدموں سے چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ نیم کے درخت سے ٹیک لگا کر وہ ٹھنکی باندھے اس کرسی کو گھورنے لگی، جہاں کچھ دیر پہلے رہبر زندانی بیٹھا ہنس رہا تھا۔ کتنے ہی لمحے بے آواز گزر گئے وہ گیٹ کھلنے کی آواز پر جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آ گئی۔ اس کا سارا چہرہ اور قیص کا گریبان بھگا ہوا تھا۔ وہ اتنی دیر سے رو رہی تھی اور اسے خبر بھی نہیں تھی۔ رہبر نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور اس کی طرف بڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے رگڑ کر چہرہ اور آنکھیں صاف کر لیں۔

"ہیلو فضہ! یار تم کہاں ہو، میں کتنی دیر سے بور ہو رہا تھا پھر سوچا تمہارے حجرے سے تمہیں نکال کر لاتا ہوں تو اٹھ اور آنٹی باہر آکر بیٹھ گئے، تم ٹھیک تو ہونا۔" بے تکلفی سے بولتے ہوئے قریب آکر اس نے فضہ کے ستے ہوئے چہرے اور روئی روئی آنکھوں کو دیکھ کر پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں۔ آریو آل رائٹ؟" وہ اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کر بولا۔ اس کے لمس نے جیسے اس کے



اندر کرکٹ دوڑا دیا اس نے ذرا سختی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”کیا ہوا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی۔“ وہ اس کے سخت روٹے سے خائف ہو کر بولا۔

”نہیں، وہ تو مجھ سے ہوئی اپنی اوقات سے بڑھ کر خواب جو دیکھنے لگی ہوں۔“ اس کی آواز اجنبی سی تھی۔

”فضہ! کیسی باتیں کر رہی ہو۔“ وہ ذرا خفگی سے بولا۔ ”کیا تمہیں میرا یقین نہیں، میرا تو ایک ایک پل اب

تمہاری ہم راہی کے خواب دیکھتے ہوئے گزرتا ہے، میری زندگی میں اب تمہارے سوا کوئی نہیں آسکتا یقین کرو۔“

وہ اس کے ذرا قریب ہو کر دم لہجے میں محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا اس کی نظروں کی آنچ اسے

پکھلنے لگی۔ ”تمہیں کوئی شک ہے کہ تمہارے سوا کوئی اور بھی ہے یا ہو گا۔ فضی! وہ دن میری زندگی میں نہیں

آئے گا، تمہارے جنون نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے اور یہ دیوانگی اب تمہیں پائے بغیر ختم نہیں ہوگی۔ جس کی کہو قسم

کھانے کو تیار ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں بے انداز بے حد۔ یقین کرو۔“ رہبر کا ہاتھ اب اس کے کندھے

پر تھا اس کے مضبوط ہاتھ تلے جیسے اس کا بدن نیچے ہی نیچے جھکنے لگا۔

”تو پھر ابھی سارے۔“ وہ آنکھیں جھپک کر بس اتنا ہی کہہ سکی۔

”او فوٹش گرل! یار ڈرائیور کسی کام سے گیا ہوا تھا اسے اپنی کسی دوست کی طرف جانا تھا بس اسے ڈراپ کرنے

گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ فضہ! کیا تم مجھے ایسا سمجھتی ہو کہ میں تمہیں دھوکا دوں گا۔“ کندھے پر دباؤ

بڑھ گیا تھا اس کا سانس رکنے لگا۔ اس کے چوڑے شانوں کے پیچھے جیسے ساری دنیا چھپ گئی تھی۔ اس نے نفی میں

سر ہلایا۔

”تو پھر یہ شکوک کیسے۔ تم نہیں تو کوئی بھی نہیں، یہ رہبر کا تم سے وعدہ ہے ٹھیک ہے۔“ وہ ذرا سا جھک کر اس کی

آنکھوں میں جھانک کر بولا تو وہ ہلکے سے مسکرا دی۔

”ویش گڈ۔ چلو اب کہیں چلتے ہیں اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے۔ لمبی ڈرائیو پر چلیں گے، تم چینیج کر لو ہر وقت

ماسیوں کے جیلے میں پھرتی رہتی ہو۔ فضہ! میں تمہیں ہمیشہ فریش دیکھنا چاہتا ہوں۔ کسی کھلے گلاب کی طرح۔ وہ

ہنس کر ہلکے ہلکے موڈ میں بولا تو وہ سر ہلا کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

”میرا خیال ہے چند ایک روز میں پاپا آئیں گے۔ ان کارات کو فون آیا تھا، ابھی بات ہو رہی تھی کہ لائن ڈراپ

ہو گئی۔“ گاڑی سڑک پر ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

”موسم کتنا اچھا ہو رہا ہے۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہلے کا تو پتا نہیں لیکن اب واقعی بہت حسین ہو رہا ہے، ایمان خراب کر دینے کی حد تک۔“ وہ اس کے

سر پرے کو نظروں میں اتارتے ہوئے شوخی سے بولا۔

”اوں ہوں، اگر آپ نے ایسی باتیں کرنی ہیں تو مجھے واپس چھوڑ آئیں۔“ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

”چھا بھئی، اب میں تمہیں دینیات کا سبق تو پڑھانے سے رہا۔ ہمارے درمیان تو اسی قسم کی باتیں ہو سکتی

ہیں۔ فضہ! اگر پاپا میرا پوزل تمہارے لیے دیں تو وہ عاکف انکل سے بات کریں گے۔“ وہ ایک دم سے بولا تو اس

کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”ہے نا۔ ان ہی سے بات کرنی پڑے گی۔“ وہ اس کی خاموشی پر پھر بولا تو اس نے خفیف سا سر ہلا دیا۔

”دعا کرو، سب کچھ خیر خیریت سے ہو جائے۔ ظالم سانج ہمارے درمیان نہ آئے۔ اور بج جو س پیتے ہیں۔“ بات

کرتے کرتے ایک ڈراما کار نے اس کے پاس اس نے گاڑی روک کر دی۔ وہ اسی طرح سب پروگرام فوراً ”ارج“ چھوڑ کر لیتا تھا

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

”ہمارے چلتے ہیں۔“ بھوس پی کر اس نے نیا پروگرام ہٹا ڈالا۔

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

”میں ایک بار لراچی جانا چاہتی ہوں، آپ مجھے لے کر جائیں گے نا۔“ وہ سرمئی ڈھلتی شام کو انجوائے کر رہی

تھی۔

”ہاں کیوں نہیں، مگر شادی کے بعد جائیں گے۔“

”نہیں پہلے۔“ وہ زور سے سر ہلا کر بولی۔

”کس سے پہلے۔“ وہ شرارت سے اسے تکتے ہوئے بولا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ اس کی بات سمجھ کر کھسیا گئی۔

”اچھا کو شش کروں گا، ویسے بھی شادی میں تمہاری سسٹرز کا ہونا بہت ضروری ہے، تمہارے پاس ان کا

ایڈریس ہے۔“

”نہیں۔“

”چلو میں عاکف انکل سے لے لوں گا۔“ اس نے جیسے اس کا بوجھ سر کایا۔ گاڑی پارک کر کے وہ باغ کے اندر

چلے گئے۔

خوبصورت شام باغ کے اندر اور بھی رومانٹک لگ رہی تھی۔

”فضہ! اس طرح ساتھ ساتھ چلنا کس قدر اچھا لگتا ہے، ہے نا۔“ کچھ دیر خاموش چلنے کے بعد اس نے کہا۔

”ہوں۔ رہبر! یہ درخت کتنے عجیب سے ہیں پر اسرار سے۔ ہیبت ناک سے جیسے جیسے۔“ اسے کچھ سمجھ میں

نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان اونچے اونچے دیو قامت درختوں کو کیا نام دے جو سڑک کے دونوں طرف بڑی شان سے سر

اٹھائے کھڑے تھے۔ درختوں کے تنوں سے لگی اسماء الحسنی کی تختیاں ان کی بڑائی کو جیسے اور بڑھا رہی تھیں۔ شام

ڈھل رہی تھی، پرندے اپنے گھروں کو لوٹنے کے لیے شور مچا رہے تھے اور درخت جیسے اس سارے شور و غل سے

بے نیاز اپنے وجود میں مگن تھے۔

”آپ کو کچھ فیل نہیں ہو رہا۔ یہ بہت پرانے ہیں نا۔“ وہ مسلسل نظریں جمائے سر اٹھا کر ان درختوں کو دیکھ

رہی تھی جو اسے عام درختوں سے بہت مختلف لگ رہے تھے۔

”ہاں لگ تو یہی رہا ہے، باغ بھی تو قیام پاکستان سے پہلے کا ہے ظاہر ہے ان درختوں کی عمریں بھی خاصی طویل

ہوں گی۔ واقعی ان کی وجہ سے ماحول خاصا پر اسرار لگ رہا ہے۔“ رہبر بھی ان درختوں کی خاموشی کو محسوس

کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے یہاں آنا بہت اچھا لگا ہے، جیسے ان درختوں سے میری پرانی شناسائی ہے مگر یہ بہت چپ لگ رہے ہیں

نا۔“

”اچھا چھوڑو یار ہم کیا ان درختوں پر رسرچ کرنے آئے ہیں، تم تو پیچھے پڑ گئی ہو ان بے چارے عمر رسیدہ

بوڑھوں کے۔ ویسے بھی جسے ان کے بارے میں معلومات لینی ہوں وہ ان کے ساتھ ٹکی تختیوں سے مدد لے سکتا

ہے جن پر ان کے نام وغیرہ لکھے ہیں۔ یہ باغ روماس کرنے کے لیے سب سے بہترین اسپاٹ ہے لاہور میں اور تم

قصہ چہار درویش کھول کر بیٹھ گئی ہو۔“ رہبر اس کی گفتگو سے اکتا کر بولا۔

”مجھے تو جو محسوس ہوا وہ۔۔۔“ اسے ایک دم سے کھانسی آنے لگی، وہ رک کر کھانسنے لگی۔ رہبر بھی رک گیا، اس

کا حلق ایک دم سے خشک ہو گیا تھا۔ کانٹے چھنے لگے تھے پانی کی طلب میں کھانسی اور شدید ہو گئی۔

”اوہو، تمہیں تو بہت کھانسی آرہی ہے، چلو واپس چلتے ہیں۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔

”پانی!“ وہ ذرا رک کر بولی۔ ساتھ ہی شدت کی کھانسی آئی کہ اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں۔



”اوہو، چلو تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔ پرسوں بھی تم اسی طرح کھالس رہی تھیں۔ پتا نہیں کیا اوٹ پٹانگ کھاتی رہتی ہو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”یہ لوٹو سے آنکھیں صاف کر لو۔“ پینٹ کی جیب سے نشوونکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”وہ جس کھانا کھانا میرا گلا گل سے دکھ رہا ہے اس لیے۔“ وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی، گلے میں ابھی تک خراش پڑ رہی تھی وہ دونوں پارکنگ کی طرف بڑھے۔

”اوہ یاد آیا یہاں قریب ہی پیپا کے دوست ڈاکٹر نوزی ہیں ان کے کلینک چلتے ہیں۔“ اس نے گاڑی بائیں طرف موڑتے ہوئے کہا۔

”رہنے دیں اب تو ٹھیک ہے۔“ وہ تھوک سے گلے کو تر کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں ایسے لا پرواہی نہیں کرنی چاہیے۔ مجھے تو تمہارے انکل پر حیرت ہے انہیں تمہاری کچھ پرواہی نہیں۔ خیر اب تم فکر نہ کرو میں جو ہوں۔“ وہ خود ہی بولا۔ کلینک واقعی قریب ہی تھا۔

”ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔“ پیپا کے بتانے پر وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

”السلام وعلیکم انکل!“ رہبر اندر داخل ہو کر ڈاکٹر کی نشست پر بیٹھے ادھیڑ عمر سوبر سے شخص سے بولا، کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔

”وعلیکم السلام!“ ڈاکٹر نے کھڑے ہو کر اس کے مصافحے کے لیے بڑھے ہاتھ کو تھامتے ہوئے کہا شاید وہ رہبر کو پہچان رہا تھا۔

”آہا تم رہبر ہونا۔ رہبر زبانی! جیب کے بیٹے۔ میں نے صحیح پہچانا۔“ دوسرے لمحے ڈاکٹر صاحب چمک کر بولے۔

”یس آپ نے صحیح پہچانا انکل اور پھر تین سال پہلے تو ملے تھے ہم اور سائیں کیسے ہیں آپ؟“ رہبر نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بالکل ٹھیک، تم سناؤ کیسے ہو، حبیب ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر صاحب خوشدلی سے بولے۔

”جی سب ٹھیک ہے یہ میری کزن ہیں فضا، ان کا چیک اپ کروانا تھا۔“ اس نے فضا کو اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرایا۔

”ہاں ابھی ایک ڈاکٹر کی یاد صرف کسی مریض کا چیک اپ کروانے کے لیے ہی آسکتی ہے۔ کب آئے تم پاکستان۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولے۔

”تقریباً“ مہینہ ہو چلا ہے، چند ایک روز میں پیپا بھی آئیں گے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ پچھلے مہینے فون آیا تھا اس کا۔ ہاں تو پیپا جی کیا مسئلہ ہے آپ کو۔“ وہ فضا کو دیکھ کر بولے ”دھر آکر بیٹھو۔“ انہوں نے اپنے پاس پڑی چیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔

”گلا دکھ رہا ہے اور کھانسی بھی ہو رہی ہے۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہوں“ انہوں نے تاراج اٹھائی ”منہ کھولو۔“ اس نے منہ کھول دیا وہ تاراج کے ذریعے توجہ سے چیک کرنے لگے۔

”ہوں“ انہوں نے اسٹیکو اٹھالیا اور اس کے سینے پر رکھ کر چیک کرنے لگے۔

”بیچھے بیک کی طرف سے۔“ وہ مزید بولی۔

”زور سے سانس لیں۔“ اس نے جیسے ہی زور سے سانس لیا ایک دم سے پھر کھانسی شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر

صاحب اس کی کھانسی کے رکنے کا انتظار کرنے لگے۔

”ایسے ہی ڈاکٹر صاحب کھانسی شروع ہو جاتی ہے۔ اسے تو پھر کتنی دیر نہیں رکتی۔“ رہبر تشویش سے بولا۔

”ہوں۔ بیٹا! یہ بائبل لے لو اندر رواش روم ہے کھانسی کے بعد جو تھوک نکلے وہ اس میں ڈال کر لے آؤ۔“ وہ

کھانسی سے بے حال ہو رہی تھی، جب ڈاکٹر نے پلاسٹک کی ایک کھلے منہ والی شیشی اس کی طرف بڑھائی۔ وہ

شیشی لے کر رواش روم کی طرف بڑھی اندر جا کر اسے زور سے کھانسی کا آخری جھٹکا سالگا۔ اس نے شیشی میں

تھوک دیا سفید لعاب میں سرخی گھلی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

”بس بیٹا! یہ شیشی ایسے ہی رسنے دو تم باہر آ جاؤ۔“ ڈاکٹر صاحب نے پیچھے سے آکر اسے کہا اور ہاتھ میں پکڑا پیپا

کا گلاس سے تھمایا۔ اس نے دو چار گھونٹ پی کر گلاس انہیں واپس کر دیا اور ہاتھ روم میں پڑے نشوونکال سے آنکھیں

صاف کرنے لگی۔

”یہ کچھ دوائیں ہیں، یہ استعمال کریں تقریباً“ تین روز تک یہ میں کچھ ٹیسٹ کرواؤں گا، باہر میرا اسٹنٹ ابھی

تمہارا خون لے گا، پھر آکر تین دن کے بعد دوبارہ چیک اپ کرواؤ اور رپورٹس بھی لے جانا۔“ ڈاکٹر صاحب

نے نسخہ لکھ کر اس کے ہاتھ میں دیا۔ دونوں ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آئے۔

”خون دیتے وقت تکلیف تو نہیں ہوئی۔“ وہ گاڑی میں بیٹھ کر بولا۔

”نہیں کچھ خاص نہیں۔“ اس نے کلائی کی ابھری ہوئی رگ کو دیکھا جہاں سے ابھی خون لیا گیا تھا۔

”پھر رویوں رہی تھیں؟“

”تکلیف کی وجہ سے۔“ وہ ہنس دیا۔

”یہ پیپا کے بہت اچھے دوست ہیں، پرسوں دوبارہ آکر چیک اپ کروالیں گے۔ ابھی راستے سے یہ میڈیسن لیتے

ہیں اب تو ٹھیک ہونا۔“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلا دیا۔

”دومن کا سر ہلا دیتی ہو، چھٹانک بھر کی زبان نہیں ہلا سکتی۔“ وہ اس کے سر ہلانے پر بولا تو وہ مسکرا دی۔ اس نے

گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔



کالج سے باہر نکل کر اس نے پوائنٹ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ گاڑیوں کے رش سے ذرا ہٹ کر وہ باہر

سڑک کی طرف نکلی کہ ایک گاڑی آہستگی سے سرکتی ہوئی اس کے پاس آکر رک گئی۔ اس نے توجہ نہ دی، اس کی

نظریں تو پوائنٹ کو ڈھونڈ رہی تھیں، آج اس کا کمپیوٹر کلاس لینے کا موڈ نہیں تھا۔

”عبیرہ! عبیرہ بیٹا!“ کسی نے اسے گاڑی میں سے پکارا اس نے چونک کر دیکھا، آف وہائٹ سوٹ میں ہم

رنگ دپٹے اوڑھے مسز حق اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ جھجکی گئی، ان کے دوبارہ پکارنے

پر اس نے آگے بڑھ کر ذرا سا جھک کر سلام کر دیا۔

”بیٹا! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ پلیز کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ آئیں گی۔“ ان کا لہجہ اس دن کی

طرح شائستہ اور مہذب تھا، وہ کوشش کے باوجود فوراً انکار نہیں کر سکی۔

”آئی! مجھے دیر ہو جائے گی گھر سے، آپ پلیز گھر آکر بات کر لیجئے گا۔“

”نہیں بس میں تھوڑا سا آپ کا وقت لوں گی، دس پندرہ منٹ اندر آ جاؤ، جانا کہیں نہیں ہے یہیں بات کرنی

ہے۔“ انہوں نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر کہا۔

وہ انکار کر رہی نہیں سکی اور — جھجکتی ہوئی، ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

(باقی آئندہ)





۶  
چھٹی قسط

عبیرہ کالج سے نکل کر پوائنٹ کی تلاش میں کھڑی تھی۔

”عبیرہ! عبیرہ! بیٹا“ کسی نے اسے گاڑی میں سے پکارا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ آف وہاٹ سوٹ میں ہم رنگ دوپٹہ اوڑھے مسز حق اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ جھجک سی گئی۔ ”بیٹا مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ پلیز کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ آئیں گی۔“ ان کا لہجہ ان کی طرح شائستہ اور مہذب تھا۔ انکار نہیں کر سکی۔ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”یہاں تو بڑا رش ہے ڈرائیور گاڑی آگے لے جاؤ۔“ وہ ڈرائیور سے بولیں۔

”بس یہیں سائیڈ پر روک دو۔“ کالج کی باؤنڈری وال ختم ہوتے ہی وہ دوسری تیسری کوٹھی کے درمیان گاڑی روک کر بولیں۔ ڈرائیور گاڑی روک کر دروازہ کھول کر باہر چلا گیا اور کچھ دور درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹا! یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ میں آپ میں کیوں انٹرنشڈ ہوں۔“ انہوں نے تمہید باندھی۔ ”اگر اس معاملے میں میں تمہاری رائے پوچھوں تو تم کیا کہو گی۔“

”وہی جو غزالہ آنٹی آپ سے کہیں گی۔“ وہ فوراً بولی۔

”ہوں اچھی بات ہے اچھی اور نیک بیٹیاں ایسے ہی کہتی ہیں۔ خیر یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ مان نہیں رہیں اس رشتے پر۔ میری ہزار کوشش کے باوجود مجھے آپ سے صرف یہ پوچھنا تھا کہ اگر آپ کے سلسلے میں بات کرنی ہو تو آپ کی غزالہ آنٹی کے علاوہ اور کس سے بات کی جاسکتی ہے؟“

”ان ہی سے۔“ وہ اسی لہجے میں بولی۔

”پھر بھی بیٹا! ان کے علاوہ کوئی اور بڑا۔۔۔۔۔ آپ کی دوسری سسٹرز اور بھائی کس کے پاس رہتے ہیں؟“

”میری بڑی سسٹر میرے تایا جان کے پاس کراچی میں رہتی ہیں۔“

”آپ مجھے ان کا ایڈریس دیں گی۔“

”یہ اچھا نہیں لگتا۔ غزالہ آنٹی کیا سوچیں گی۔“ وہ انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں آپ کا نام بیچ میں نہیں آنے دوں گی۔ بس آپ مجھے ان کا ایڈریس دے دیں بیٹا! میں کوئی غلط کام نہیں کرنا چاہتی ایک نیک کام جائز اور باعزت طریقے سے کرنا چاہ رہی ہوں اور یہ میرا حق بھی ہے۔ اس پر اپنے تایا کا ایڈریس



لکھ دو۔ انہوں نے ہینڈ بیک سے ڈائری اور پین نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”پلیز آئی! مجھے اچھا نہیں لگ رہا، آپ غزالہ آئی سے پوچھ لیں۔“

وہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہیں۔

”چلو ٹھیک ہے میں ان ہی سے پوچھ لوں گی۔“ انہوں نے پین اور ڈائری واپس رکھ دی۔

”تمہارے تایا کا نام کیا ہے؟“ انہوں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”میرے بھائی بھی کراچی میں ہوتے ہیں آپ کے تایا کس سائڈ پر ہیں وہ تو کلفٹن کی طرف رہتے ہیں۔“

”وہ ناظم آباد میں ہیں۔“ انہوں نے سرسری انداز میں آگے کا پتا بھی اس سے پوچھ لیا۔ پتا بتا کر اسے اپنی غلطی کا

احساس ہوا۔

”میں آپ کو ڈراپ کر دوں گھر۔“ وہ محبت سے بولیں۔

”ہنیں ٹھیک یو“ میں چلی جاؤں گی۔ وہ میرا پوائنٹ آگیا ہے۔“

وہ دروازہ کھول کر اترتے ہوئے بولی ”چھا آئی خدا حافظ!“ وہ کہہ کر جلدی سے پوائنٹ کی طرف بڑھی۔

گھر آکر وہ سوچتی رہی کہ غزالہ آئی سے اس کا ذکر کرے کہ نہ کرے۔ شام کو وہ رہ نہ سکی غزالہ آئی پین میں کھانا بنارہی تھیں جب اس نے انہیں ساری بات بتادی تو جیسے اس کے ضمیر سے سارا بوجھ اتر گیا۔

”ہوں تو بات یہاں تک پہنچ گئی۔“ غزالہ آئی نے جیسے خود سے کہا۔

”جی آئی! کیا کہا آپ نے؟“ وہ سن نہ سکی تھی۔

”کچھ نہیں بیٹا! تم اب جاؤ۔“ وہ بولیں۔

”اگر وہ اتنی چاہت دکھا رہی ہیں تو کیا میں خود غرضی نہیں دکھا رہی؟ اگر وہ دو تین سالوں کا کہہ رہی ہیں تو اس میں

کوئی حرج تو نہیں اپنے سارے حالات انہیں بتا کر اپنی مجبوری کا اظہار کر سکتی ہوں۔ مگر یوں اس طرح محض اپنی

بیٹیوں کی خاطر مجھے عبیدہ کے اچھے مستقبل کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ پہلا اچھا رشتہ تو خدا کی بڑی نعمت ہوتا

ہے۔ یہی رشتہ اگر تانیہ یا ثوبیہ کا آیا ہوتا تو میں ایک منٹ کی دیر نہ لگاتی۔ نہیں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اب

چاہے کچھ ہو جائے میں آج جمال سے بات کر کے کل مسز حق کو ضرور فون کروں گی، میرے اللہ اس نیک کام کو انجام

دینے میں میری مدد فرما۔“

انہوں نے چولہا جلاتے ہوئے دعا کی۔

♥ ♥ ♥ ♥

رہبر کے پاپا عارف چچا کی مکمل تصویر تھی۔ وہی مصروف مصروف سا انداز، رہبر کے خصوصی تعارف کرانے پر

بھی ان کا روپہ فقرہ کے ساتھ سرسری سا تھا۔ وہ اچانک آئے تھے پاکستان صرف دو دن کے لیے رہبر کی ممی کی

طبیعت ٹھیک نہیں تھی ورنہ وہ بھی ساتھ آتیں۔

”ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے مجھے پر سوں پاپا کے ساتھ ہی جانا پڑے گا لیکن تم فکر نہ کرنا، مجھے پندرہ بیس دن

نہیں تو مہینہ لگے گا۔ میں ممی پاپا کو ساتھ لاؤں گا۔“ منگنی کی تو ضرورت نہیں۔ اب ڈائریکٹ شادی کے لیے ممی کو تیار

کر کے لاؤں گا، پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، لیکن اس کے اظہار میں ہمیشہ منجوسی سے کام لیتے ہیں۔ البتہ ممی

میری خاطر سب کچھ کر کے رہنمائی میں تیار ہو جاتی ہیں۔ اس لیے تم کوئی واہے یا وسوسے نہ دل میں پال لیتا۔ اب

تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ پھر میں ہوں گا تمہارے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ نا، اس نے حسب عادت تائید

کے لیے اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا۔ اس نے ذرا سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔

”کر آپ کی ممی نہ مانیں تو؟“ ہزاروں خدشے سوال کی صورت ابھرے۔

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“

وہ پورے وثوق سے بولا ”پھر بھی اگر تمہیں وہم ہے کہ ایسا ہو جائے گا تو اور بہت سے رستے ہیں۔ تم کورٹ میرج کے لیے راضی ہو جاؤ گی تاکہ میں تو یہ بھی کر گزرنے کو تیار ہوں۔“

اس کا نازک ہاتھ ابھی تک اس کی گرفت میں تھا۔ اس گرفت کی تپش سے اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تھے۔

”یہ اچھی بات نہیں۔“ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

”محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ میں اسی پر یقین رکھتا ہوں فضا! یہ ہماری زندگی ہے اور زندگی بار بار

نہیں ملے گی۔ اسی ایک زندگی سے ہر خوشی کو کشیدہ کرنا ہے۔ اگر دو سروں کی رائے پر چلنے لگے تو ہماری یہ زندگی جہنم

بن جائے گی اور میں جیتے جی ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“

وہ اپنے اردوں سے زیادہ مضبوط لگ رہا تھا۔

”سچ میں اتنے سارے دن ہیں، یہاں تو لوگ ایک پل میں بدل جاتے ہیں۔“ یہ واہے اسے ایک پل کی خوشی دینے پر بھی تیار نہیں تھے۔

”تم مجھے لوگوں میں شمار کر رہی ہو۔؟ نہیں فضا! محبت صرف ایک بار کی جاتی ہے۔ یہ کوئی سودا نہیں جو بار بار کیا

جائے یہ یا تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ تیسرا کوئی رستہ نہیں اور راہ بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم مجھ پر بھروسہ

رکھو اور خدا سے دعا کرنا کہ میں تمہارے بھروسے کو تا عمر قائم رکھ سکوں۔“ فضا کے ہاتھ پر اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“ اس کی تسلیوں کے باوجود دل سما جا رہا تھا۔

”اب میں اور کیسے یقین دلاؤں تمہیں؟“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”تمہیں یقین نہیں ہے مجھ پر، اسی لیے ان

وسوسوں کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہو۔ اپنے دل کا رخ میری طرف کر لو پھر سارے وسوسے منہ پھیر لیں گے۔ تم نے

دوالی آج ڈاکٹر نقوی کی طرف بھی چلیں گے۔ اب تو بہتر ہے نا تمہاری طبیعت؟“

”ہوں۔۔۔“ وہ بے دلی سے بولی۔

”میرے بعد دو باقاعدگی سے لیتی رہنا۔ یہ موسم بدلنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھنا میرے لیے،

میری خاطر ٹھیک ہے نا۔؟“

اس نے اس کی براؤن آنکھوں میں جھانکا جن میں نمکین پانی تیر رہا تھا۔ رہبر نے اس کے ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھ

دیئے ایک کرنٹ سا اس کے رگ و پے میں دوڑ گیا۔

”آئی لو فضا! بیلوئی آئی ریلی لویو۔“ کہہ کر اس نے فضا کے ہاتھ چھوڑ دیا، اس کا ہاتھ جیسے برف میں ڈھل گیا تھا،

اور پورے جسم میں جیسے آگ کی چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔

”میں اب چلتا ہوں پاپا میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اپنا خیال رکھنا، شام کو ڈاکٹر کی طرف چلیں گے تم تیار رہنا،

اوکے خدا حافظ۔“

”خدا حافظ!“ اس کے لب دھیرے سے کپکپائے۔ وہ اسے دیکھتا ہوا پلٹ گیا۔ وہ کتنی دیر تک درخت کے تنے

سے ٹیک لگائے، اس کے نقش پا کو دل میں اتار لی رہی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔



آج سورج نہیں نکلا تھا۔ خنک ہوا چل رہی تھی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے شام تک بادل گہرے ہو گئے اور پھر بارش شروع ہو گئی پہلے ہلکی پھر تیز شام ڈھل گئی مگر بارش نہ رکی۔  
”رات کو ڈاکٹر کی طرف چلیں گے ذرا بارش ٹھہم جائے۔“ وہ کچن میں کام کر رہی تھی جب رہبر اس سے کہہ کر گیا۔

رات تک بارش واقعی مدھم ہو گئی۔ اس نے ٹائم دیکھا۔ ”ابھی تو صرف ساڑھے سات ہوئے ہیں۔“ اس نے جلدی جلدی کپڑے نکال کر تبدیل کیے اور کوارٹر کا دروازہ بند کر کے انیکسی کی طرف چل پڑی۔  
انیکسی کا دروازہ کھلا ہوا تھا رہبر کے کمرے سے اس کے پیچھے آواز آرہی تھی۔ پہلے اس کا جی چاٹا کہ واپس پلٹ جائے مگر پھر بونٹی دروازے کی طرف بڑھ آئی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں آکر تمہارا دماغ یوں پلٹے گا۔ میں نے تمہیں کس مقصد کے لیے ادھر بھیجا تھا۔ اور تم کن خرافات میں پڑ گئے۔ کس قدر شرمندہ کروایا تم نے آج نرگس کے سامنے مجھے۔“ وہ گرج رہے تھے۔  
”کیوں؟ آپ کیوں شرمندہ ہوئے نرگس آنٹی کے سامنے؟“ رہبر کی آواز سن گئی۔  
”میں نے سارے کے لیے بات کی تو وہ کہنے لگی ”پہلے اپنے بیٹے سے تو پوچھ لو وہ تو اس سچ ذات کے پیچھے خوار ہو رہا ہے اور میری بیٹی کوئی فالتو نہیں ہے۔“

”ان کی اپنی ذات کیا آسمانوں سے اتری ہے اور مجھے اس میں کوئی شرمندگی نہیں کہ میں فضلہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور میں آپ سے یہی بات کرنا چاہتا تھا اچھا ہوا آپ نے خود ہی یہ ذکر چھیڑ دیا۔“  
رہبر کالجہ اطمینان بھرا تھا۔

”اور تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہاری اس احمقانہ بات پر لبیک کہوں گا۔ تم ایک بات کان کھول کر سن لو تمہاری شادی صرف اور صرف سارے سے ہوگی۔ یہ بات آج سے نہیں برسوں پہلے سے طے ہے۔ میں امریکہ جانے سے پہلے نرگس سے وعدہ کر کے گیا تھا۔ یہ وعدہ صرف میں نے نہیں تمہاری مٹی نے بھی کیا تھا۔ وہ اسی لیے پاکستان آنا چاہ رہی تھیں کہ آکر متگنی کی رسم ادا کر دیں۔ چار ماہ بعد ہمارا شادی کا ارادہ ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تم کسی اور ہی کھیل میں پڑ گئے ہو۔“

ان کالجہ حد درجے غصیلا تھا۔  
”بہا! کھیل ہو گا یہ آپ کے لیے میں سیریس ہوں اور آپ بھی یہ بات سن لیں کہ میں فضلہ کے علاوہ اور کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور وہ سارے تک چڑھی۔ مغرور اور دولت مند لڑکی وہ تو کبھی بھی نہیں۔ اور وعدہ آپ نے اور مٹی نے مجھ سے پوچھ کر نہیں کیا تھا۔ میں بالغ ہوں۔ سمجھدار ہوں اپنے فیصلے خود کرنا جانتا ہوں اور اس معاملے میں کسی کی رائے نہیں سنوں گا۔ چاہے جو مرضی ہو جائے۔“ وہ دو ٹوک نعرے میں بولا۔  
”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس لڑکی میں ہے کیا نہ اس کا آگاہ چچا خدا جانے کون ہے۔ کون نہیں۔ ہمیں اپنی نسل خراب نہیں کرنی۔“ ان کالجہ تو بہن آمیز تھا۔

”بہا! آپ کو کسی کے بارے میں ایسے کھٹیا رہنا کس دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو کچھ بھی ہے میرے لیے سب سے بڑھ کر ہے۔“ اس کی آواز بہت بلند تھی۔  
”میرے بچے! تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں اور تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ جس کے لیے تم مرے جا رہے ہو اس کی خود زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ تم ڈاکٹر نقوی کے پاس گئے تھے اسے لے کر اور غالباً ”ٹیسٹ رپورٹس لانا بھول گئے جو آج آتے ہوئے اس نے مجھے تمہاری۔“

”فضلہ کا دل ان کی بات پر زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”ہاں مجھے جانا تھا رپورٹس لینے۔“ اندر سے کسی لفافے کے کھولنے کی آواز آئی۔

”ان کو کھولو اور عور سے پڑھو۔ اس لڑکی کو بی بی ہے۔ بہت پرانی اور اس سے بھی زیادہ مملکت بلڈ کینسر ہے۔ اب بولو کیا اب بھی تم اس سے شادی کرو گے۔“

ان کی آواز نے جیسے اس کے نزدیک ہی کہیں بم پھوٹے۔ وہ خوف سے لرزنے لگی۔ کتنی دیر گزر گئی۔ رہبر کی کوئی آواز نہ آئی شاید وہ رپورٹس پڑھ رہا تھا اس کے کان اس کی آواز سننے کے لیے شدت سے منتظر تھے۔  
”بہا! میں سونا چاہتا ہوں مجھے نیند آرہی ہے۔“ اس کے ان دو جملوں نے اس کے بدن سے جیسے ساری جان کھینچ لی۔

”ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو صبح بات ہوگی۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی کوارٹر تک آئی باہر بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر بے رحم آسمان کی طرف دیکھا۔

”کیا میرے لیے کہیں بھی دو گھونٹ دو قطرے دو بوندیں خوشی کی نہیں؟“

چھما چھم برستی بوندوں میں بھیگتے ہوئے اس نے بے حد افسردگی سے سوچا۔

”نہیں۔“ کوئی بادلوں کی اوٹ سے بولا۔

وہ کتنی دیر کھڑی بارش میں بھیگتی اس ”نہیں“ کا جواز ڈھونڈتی رہی۔ لیکن تقدیر کے لکھے کا کوئی جواز کوئی سبب نہیں ہوا کرتا یہ تو بس لکھا ہوتا ہے جو پورا ہونا ہوتا ہے۔

تو پھر یہ خواب یہ سراب کیوں؟ بارشیں برسا کر اندر صحرا کیوں بھڑکائے جاتے ہیں۔ ان صحراؤں کی پیاس کس

بارش سے بجھے گی۔ شاید کسی سے بھی نہیں۔ مجھے اسی صحرا میں تجلس کر ختم ہو جانا ہے ہاں یہی کھا ہے میرے کاتب تقدیر نے جسے کوئی بارش کوئی پانی مٹا نہیں سکتا۔

اور جو تقدیر سے صلح کر لیتا ہے پھر وہ کسی سے نہیں لڑتا۔ نہ زندگی سے نہ زندگی دینے والے سے نہ لینے والے سے۔

”ہاں مجھے بھی تقدیر سے صلح کر لینی چاہیے کہ اب لڑائی کا کچھ فائدہ نہیں۔ میں ہر محاذ پر پسپا ہو چکی ہوں۔ مزاحمت کا کچھ فائدہ نہیں جان تو اب دینی ہی ہے۔ ہتھیار اٹھائے رہنے سے فائدہ۔“

وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے کوارٹر کا دروازہ کھول کر اس قبر جیسی پناہ گاہ میں داخل ہوئی اور گیلے کپڑوں سمیت چارپائی پر لیٹ گئی۔

♥ ♥ ♥ ♥

ولید کو کسی پرائیویٹ ادارے میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس کے بلند وبالا خوابوں کے برعکس صرف پانچ ہزار ماہانہ پر اس کے سارے خواب جیسے منہ کے بل آگرے تھے۔ مگر گھر کے حالات دیکھتے ہوئے اسے یہ سب بھی غنیمت لگا تھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا ابراہیم بھائی کے جانے کے بعد گھر جیسے قبرستان بن گیا تھا۔ گھر کے چاروں افراد ایک دوسرے سے نظریں چرائے پھرتے تھے۔ تایا جی رشتائز ہو چکے تھے۔ تائی جی کے گھنٹوں کا درد بے حد بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے بستر سنبھال لیا تھا۔ گھر کی پوری ذمہ داری ایمین کے سر پر آ رہی تھی۔ وہ روز جوڑ توڑ کر کے کبھی دال پکا لیتی تو کبھی بھجیا اور اب تو صرف تایا جی کی پینشن کا آسرا تھا۔ وہ اپنے گریجویٹ فنڈ میں سے بہت سی رقم ابراہیم بھائی کی



شادی پر نکلا چکے تھے۔ اب جو برائے نام رقم ملی تھی وہ انہوں نے بینک میں رکھوا دی تھی۔ گھر کی گاڑی تو جیسے تیسے چل ہی رہی تھی۔ تائی جی کی داؤوں کا خرچ نہیں نکل رہا تھا۔ ایمین کا فائسل کا ایڈمیشن جانا تھا اور اس کے پاس داخلہ فیس کے پیسے نہیں تھے۔ پہلے تو تائی جی سب کچھ کسی نہ کسی طرح کر رہی تھیں اب وہ کس سے کتنی ولید سے تو بات کرنے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔

”یہ کچھ پیسے رکھ لو گھر کے خرچ کے لیے اور امی کی داؤں کا نسخہ مجھے دے دو۔ میں لے آتا ہوں۔ دو امیں۔“ وہ ان ہی سوچوں میں پریشان مجھے ہوئے چولہے کے پاس کھڑی سوچ رہی تھی۔ جب ولید نے پانچ پانچ سو کے چار نوٹ اس کے آگے سلیب پر رکھے وہ پیسے وہیں چھوڑ کر نسخہ لینے اندر چلی گئی۔

”داخلہ فیس جمع کرانے میں صرف چار دن ہیں۔ میں کس سے کہوں۔“ دن رات اسی پریشانی نے اس کی جان کھائی ہوئی تھی۔ کاش میں داخلہ ہی نہ لیتی۔ اس نے بار بار سوچا۔ ”تایا جی! وہ آپ سے ایک بات کرنی تھی۔“ رات کو انہیں کھانا دیتے ہوئے اس نے جھجک کر کہا۔

”ہاں کو۔“ انہوں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”وہ ایم اے کا ایڈمیشن جانا تھا۔ اس کے لیے فیس نہیں ہے۔“ وہ انک انک کر بولی۔ ”تمہیں کون سے حکیم نے کہا تھا کہ ایم اے میں داخلہ لو۔ اپنی ہماری ملیں چل رہی ہیں تاکہ یہ عیاشیاں کرتے پھریں۔ اس کلاس میں ایم اے کرنا عیاشی کے برابر ہے۔ تم نے کون سا ایم اے کر کے مجسٹریٹ لگ جانا ہے۔ سارے حالات نظر بھی آرہے ہیں پھر بھی جلتی پر تیل گرا رہی ہو۔ یہاں کھانے پینے کے لالے پڑے ہیں نواب زادی کو فیسوں کی سوجھ رہی ہے۔“ برسوں بعد بھی ان کا رویہ اس کے ساتھ اتنا کڑوا تھا کہ اس کا دل چاہا کہ زمین بھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

وہ دھواں دھواں چہرہ لیے باہر آگئی۔

”کیا ہوا ایمین؟“ دروازے میں ہی اسے ولید ٹکرا گیا۔

”کچھ نہیں ہوا۔ تم اپنے کام سے کام رکھا کرو۔“ وہ چیخ کر بولی۔

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”ایم اے کا داخلہ بھیجنا ہے۔ فیس مانگ رہی تھی میں نے کہا میں کون سے قارون کے خزانے دے بیٹھا ہوں کہاں سے دوں۔“ تایا جی نے ولید کو دیکھ کر ایمین کے چیخنے کی وجہ بتائی۔ ”ابھی تک اس کا بچپنا نہیں گیا۔ ذرا سی بات پر چیخنے لگتی تھی۔“ وہ بربرائے۔

”اوہ۔“ وہ سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔

”دون بعد اس نے فیس کے پیسے اس کے آگے رکھ دیے وہ روٹیاں پکا رہی تھی۔

”یہ پیسے ہیں تمہاری فیس کے تم فیس جمع کروادو۔“ وہ گتے ہوئے مڑنے لگا۔

”میں ان پیسوں کو آگ میں جھونک دوں گی۔ اٹھا لو اپنی یہ خیرات یہاں سے۔ مجھے نہیں داخلہ بھیجنا۔“ وہ ایک دم مشتعل ہو کر بولی۔

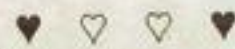
”باگل ہوئی ہو۔ دو سال ضائع کرو گی اپنے۔“ ولید کا انداز صلح جو تھا۔

”باگل بس یاگل ہو گئی ہوں اس باگل خانے میں بہ گھر میرے چاہیے دو سال ضائع ہوں یا دس سال تمہیں اس

سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے تم سب سے نفرت ہے مطلبی لوگوں سے پکڑو اپنے پیسے۔“ اس نے غصے سے پیسے اٹھا کر اس کے قدموں میں پھینک دیے۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ احسان فراموش لڑکی! انہیں لینے تو مت لو۔ فالتو نہیں ہیں۔“ اسے بھی غصہ آگیا۔ وہ پیسے اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اور اس کا دل چاہ رہا تھا اس سارے گھر کو آگ لگا دے یا خود کہیں بھاگ جائے۔ ”آخر یہ سزا ختم کیوں نہیں ہوتی۔“ وہ سلیب پر سر رکھ کر زور زور سے رونے لگی۔



ہاتھ	میں	کیسے	تھام	لتی	خوشی	کا
میرا	درد	سے	رشتہ	جڑا	ہوا	تھا
محبت	اسی	روز	بے	اعتبار	ہوئی	
اس	کا	لہجہ	معنی	سے	کٹا	تھا
جگنو	کہاں	تک	دکھاتے	رستہ	مجھے	
تیرے	جذبے	کا	شعلہ	بجھا	ہوا	تھا
تمام	عمر	سائے	کی	ہمراہی	میں	سفر
میرے	شہر	کا	سورج	بجھا	ہوا	تھا

رہبر اس سے ملے بغیر حبیب بزدانی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اگرچہ اس رات ان کی گفتگو سننے کے بعد اس نے شعوری طور پر فیصلہ کیا تھا کہ اب اپنی زندگی سے اس طرح کی ہر خوشی کو نکال پھینکے گی۔ لیکن پھر بھی نامعلوم دل کے کس کونے میں یہ جھوٹی آس چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی کہ رہبر اس سے مل کر اپنے وعدوں کی تجدید کر کے جائے گا۔ اس کی اتنی خراب میڈیکل رپورٹس کے باوجود اس سے آکر کے گا۔

”نفسہ! دیکھنا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ امریکہ لے جاؤں گا، وہاں جا کر تمہارا علاج کرواؤں گا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں تمہیں دوسری بار کھونے نہیں دوں گا۔ میں جو ہوں تم فکر کیوں کرتی ہو۔“

شگفتہ عموں کا منہ بے کھونٹ

کھانا پکانے کی مزیدار

ترکیبوں کے

رنگارنگ کتاب

محمد رفیع : ۳۷۰

خاتون کا  
دسترخوان

شائستہ ہاشمی



لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا، اس رات کے گیلے کپڑے کام کر گئے۔ وہ اگلا سارا دن بخار میں مدہوش اپنے کونے پر پڑی رہی، ہر اسی شام کی فلائٹ سے چلا گیا۔ اسے مدہوشی کی حالت میں چھوڑ کر شاید کبھی نہ آنے کے لیے دو دن بعد جب بخار کا زور ٹوٹا تو اسے لگا۔ اس کی خالی اور ویران زندگی اب مزید ویران ہو گئی ہے۔ زندگی میں اس کے آنے سے جو رنگ آئے تھے وہ اس کے جاتے ہی بھک سے اڑ گئے۔ اور اب اس بے رنگ، بے کیف زندگی میں کچھ بھی ایسا نہیں جس کے لیے جینے کی تمنا کی جائے سب خواب، سراب بن گئے تھے سب آس، امیدیں اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے مر گئی تھیں اور انسان کی تو زندگی ہی عبارت امید سے ہے۔ جب امید اور آس ہی نہ رہے تو زندگی کس بات کی۔

اس نے ساری دواؤں کی شیشیاں دیوار پر مار کر توڑ دیں۔ ڈاکٹر کا نسخہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ ساری کتابیں اٹھا کر مینے کے نیچے پھینک دیں اور ان کے آگے باہر سے لا کر اینٹوں اور پتھروں کی دیوار سی بنادی۔ رہبر کا دیا ہوا سوٹ، موتیل سیٹ لوہے کے ٹرنک میں سب سے نیچے پھینک کر اوپر پرانے اور بوسیدہ کپڑے رکھ دیئے۔ کئی دنوں سے اس کا معمول بن گیا تھا۔ صبح اٹھ کر لان سے گلاب کے پھول توڑ کر لاتی اور انہیں اپنی کتابوں کے درمیان پڑے شیشے کے گلدان میں سجا دیتی۔ اس نے وہ گلدان بھی دیوار پر مار کر توڑ دیا۔ کرچیوں کاغذ کے برزوں سے کوٹھڑی کا سارا فرش گندا ہو گیا۔ کچھ دیر کھڑی وہ اس کھنڈر سے کمرے کو دیکھتی رہی۔ پھر دھڑام سے بستر پر آگری۔

”اگر موت اس طرح سے مل سکتی تو اب تک میں ہزار بار مر چکی ہوتی۔ کاش مجھے کہیں سے زہر مل جائے۔“

اس نے تلخی سے سوچا۔ ایک دم اس کی نظر ہاتھ میں پڑی انگوٹھی پر پڑی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اسے اتار کر پھینکنا چاہا۔

”فرضہ! یہ ہماری محبت کی پہلی گواہ ہے جب تک یہ تمہاری انگلی میں موجود رہے گی۔ تمہیں میری وفا کا یقین دلانے کے لیے رہے گی۔ تم کبھی کسی حال میں مجھ سے بدگمان نہ ہونا، اگر تم نے اسے اتار کر پھینک دیا تو میرے دل سے تمہارا دل کا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ میری تم سے درخواست ہے کہ کبھی اس رشتے کو نہ توڑنا وعدہ کرو فرضہ!“

اس کی سانس تیز تیز جلنے لگی اور وہ کوشش کے باوجود انگلی سے محبت کی اس جھولی گواہی کو اتار کر نہ پھینک سکی۔

”رہبر! رہبر! تم نے کیا کیا مجھے کیوں جھوٹے خواب دکھائے میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ زندگی میں نے تمہارے بگاڑا ہے۔ میری سزا ختم کیوں نہیں ہوتی۔“ وہ روتے روتے چیخنے لگی۔ اس کا گلا خشک ہو گیا۔ ساتھ ہی کھانسی شدید دورہ اٹھا کھانسی اتنی شدید تھی کہ اس کا پورا وجود ہل کر رہ گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں باہر کو لے لگیں۔ وہ سینہ پکڑے کھانسی چلی گئی۔ کتنی ہی دیر گزر گئی اتنی دیر تک کھانسی اسے کبھی نہیں آئی تھی۔ اس کا چکرانے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ کھانستے کھانستے بے حال ہو کر اس نے زمین پر تھوک دیا۔ تھوک کے ساتھ سرخ سرخ خون حلق سے نکلا تھا۔

خون دیکھ کر پانی بھری آنکھوں کے ساتھ اسے عجیب سی خوشی ہوئی۔

”دیکھا، اس زندگی میں مٹی سے بڑھ کر مجھ سے کوئی پیار نہیں کرتا تھا۔ اب جب زندگی کا ہر دروازہ مجھ پر بند ہو چکا ہے۔ اور موت بھی دور کھڑی ہنس رہی ہے۔ مٹی کا یہ تحفہ مجھے موت سے قریب لے جائے گا۔ اب مجھے زہر کی ضرورت نہیں بس چند ماہ اور۔۔۔“

وہ خوشی سے ہنسنے لگی اور پھر ہنسنے چلی گئی۔ ہنسنے ہنسنے اسے پھر کھانسی شروع ہو گئی۔

”اے موت! جلدی! اب میرا زندگی سے کوئی معاملہ باقی نہیں کہ جس کو نپٹانا ہو بس تیرا انتظار ہے۔ دیکھ میرا انتظار کو طویل نہ کرنا۔“

اب میری اس طلب کو تو رس نہ بنانا۔ جلدی آنا جلدی۔ کھانستے کھانستے خود سے کہنے لگی۔



سادہ سی رسم تھی منگنی کی۔ عبیدہ اور نچ کلر کے کاہنی سوٹ میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ مسز حق نے پیشانی چوم کر اس کے ہاتھ میں ڈائمنڈ کی رنگ پرنائی تھی غزالہ آنٹی کی بیٹیاں اور اس کی کچھ دوستیں اسے گھیرے بیٹھی تھیں۔

ایمن تھوڑی دیر پہلے تائی جی کے ساتھ پہنچی تھی۔ مگر اجنبی مہمانوں کی طرح دور بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی اجنبیت اور ریگانگی پر عبیدہ کا دل کٹ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اسے آواز بھی نہیں دے سکتی تھی۔ میڈیکل میں داخلہ نہ لینے کی وجہ سے وہ ابھی تک اس سے خفا تھی اس دن کے بعد وہ آج آئی تھی۔ اس کا فون سن کر انڈینڈ نہ کرتی وہ غزالہ آنٹی کے ساتھ ملنے گئی وہ کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ عبیدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ناراضی کیسے دور کرے۔

اس نے کئی بار ایمن کو فون کیا کہ اس منگنی کا ایمن سے تذکرہ کرے مگر وہ ہر بار اس کی آواز سن کر فون رکھ دیتی اور آج بھی اسے امید نہیں تھی کہ وہ آئے گی۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم موقع تھا۔ اتنے لوگ پاس تھے مگر جن سے دل کے رشتے جڑے تھے ان میں سے کوئی بھی پاس نہیں تھا۔ اوپر سے سنجیدہ چہرہ بنائے اندر سے اس کا دل رو رہا تھا۔

غزالہ آنٹی نے آگے بڑھ کر اسے پیار کیا تو تائی جی بھی اٹھ کر آئیں وہ سنگدل اسی طرح بے حس بیٹھی رہی۔  
 ”بی! اٹھو! بن کے پاس آؤ دیکھو تو کتنی پیاری لگ رہی ہے عبیدہ۔“ غزالہ آنٹی نے اسے پکارا۔  
 ”آنٹی! میں بیس ٹھیک ہوں۔“ ان کے دو سری دفعہ پکارنے پر وہ بیزار ہو کر بولی۔  
 ”ہوں بری بات؟ بن کا دل برا ہو گا۔ اتنی بڑی خوشی ہے اس کی زندگی کی۔ مبارکباد نہیں دو گی اسے۔ بڑی بن ہو، پیار نہیں کرو گی ماما یا کی جگہ اسے۔“

غزالہ آنٹی نے پاس آ کر اسے گلے سے لگا کر سمجھایا تو اس نے ایک نظر اٹھا کر سر جھکائے بیٹی عبیدہ کو دیکھا۔  
 ”دیکھو وہ تمہاری ناراضی پر کتنی افسردہ ہے۔ اس طرح اس کا دل برا نہیں ہو گا، تم تو سمجھدار ہونا۔ زندگی کی ہر خوشی ملنے کی دعا دو۔ بڑی بن تو چھوٹوں کی خوشی میں خوش ہوتی ہے اور تم بہت اچھی بڑی بن ہو، اگر تم اسے پیار نہیں کرو گی تو سوچو، تمہارے ماما یا کیا سوچیں گے۔ آج تو وہ بھی بہت خوش ہوں گے۔ اٹھو میری جان! عبیدہ کے پاس چلتے ہیں۔ آؤ، تمہیں عبیدہ کی ساس سے ملو، وہ بہت اچھی خاتون ہیں۔ تم ان سے ملو گی تو جانو گی۔ خدا انہیں کما بدل کس طرح دیتا ہے۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر عبیدہ کے پاس لے آئیں وہ اس کے پاس کھڑی اسے دیکھتی رہی۔  
 ”جھک کر پیار کرو نا بن کو۔“ انہوں نے اسے گھر کا۔  
 ”عبیدہ!“ وہ ذرا سی جھکی عبیدہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔  
 ”بی! اس کے لب کھلے۔“

”رونا نہیں عبیدہ! دیکھو آج خوشی کا موقع ہے رونا نہیں۔“  
 اس نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور اس کے چہرے پر مبارکباد دینے لگی۔

”بی! ایسے کرتے ہیں۔“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔  
 ”بس اب اور کچھ نہیں کہنا۔ عبیدہ! تم بہت پیاری لگ رہی ہو بہت پیاری! اللہ نظر بد سے بچائے۔“  
 اس نے عبیدہ کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی۔  
 ”بھئی پیاری کیوں نہیں لگے گی میری بیٹی ہے ہی پیاری۔“ مسز حق آگے بڑھ کر بولیں۔

”بیگم حق! یہ ایسی ہی عبیدہ کی بڑی بن، کراچی میں ہوتی ہے تائیا کے پاس، میں نے بتایا تھا نا آپ کو۔“ غزالہ آنٹی نے آگے بڑھ کر تعارف کرایا۔

”ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے بن کی طرح۔ میرے دو بیٹے ہوتے تو میں اسے بھی لے جاتی۔“ وہ ہنس کر اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

”ہم ابھی زندہ ہیں بیگم صاحبہ! عبیدہ کی طرح ایمن میری بیٹی ہے بالکل ویسی جیسی آپ کی عبیدہ۔“ تائی جی نے آگے بڑھ کر کہا سب جیسے حیران رہ گئے۔

”اچھا واقعی، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ دونوں بہنیں ایک ہی شہر میں رہیں گی میری طرف سے پیشگی مبارکباد، کب بلارہی ہیں ہمیں دعوت پر۔“ وہ بھی ہنس کر بولیں۔

”بہت جلد، بس بیٹے کی نوکری کا انتظار تھا۔ وہ بھی ختم ہوا آپ سے پہلے دعوت دوں گی آپ کو۔ انشاء اللہ وہ بھی ڈائریکٹ شادی کی۔“

تائی جی پتا نہیں کس دھن میں تھیں عبیدہ اور باقی لوگ ایمن کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اس کی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ تائی جی کے اس انکشاف نے اسے حیران کر دیا تھا۔ کچھ کچھ غصہ بھی آ رہا تھا، دل چاہ رہا تھا انہیں سنائے کہ آپ کے بیٹے کے لیے یمیم و سیر لڑکی ہی رہ گئی ہے۔ آپ کے ٹکڑوں پر ملنے والی۔  
 مگر اس وقت موقع نہیں تھا دوسرے تائی جی اب حالات کے ہاتھوں اتنی ضرورتیں کھا چکی تھیں کہ وہ خود بھی ان کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

”بس بھئی اب عبیدہ آپ لوگوں کے پاس مہمان ہے۔ ایک دو سالوں کی۔ پھر میں اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے جاؤں گی۔“ مسز حق عبیدہ کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے بولیں۔  
 ”کیوں نہیں بن! یہ آپ ہی کی امانت ہے۔“

غزالہ آنٹی نے کہا تو ایمن نے عبیدہ کے شرمائے شرمائے روپ کو آنکھوں میں سموتے ہوئے اس کے خوبصورت مستقبل کی دعا کی۔

♥ ♥ ♥ ♥  
 در قفس سے پرے جب صبا گزرتی ہے  
 کئے خبر کہ اسیوں پہ کب گزرتی ہے  
 یہ اہل ہجر کی بستی ہے احتیاط سے چل  
 مصیبتوں کی یہاں انتہا گزرتی ہے  
 بھنور سے بچ تو گئیں کشتیاں مگر اب کے  
 دلوں کی خیر کہ موج بلا گزرتی ہے  
 نہ پوچھ اپنی اتنا کی بغاوتیں محسن  
 در قبول سے بچ کر دعا گزرتی ہے

اس کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی، می کی طرح اب اسے کھانسی ساری ساری رات نہ سونے دیتی جب کھانسی کے شدید دورے کا اختتام سرخ لہو کی صورت ہوتا تو اسے عجیب سی طمانیت محسوس ہوتی۔ اس نے کوٹھی کے اندر جانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ کھانے پینے کی خواہش دل سے مر گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ کہیں دن میں اٹھ کر باہر نیم کے درخت تلے جا کر کھڑی ہو جاتی۔ وہ جگہ اس کی تکلیف کو اور بڑھا دیتی۔ یادیں اسے ڈسنے لگتیں۔ وہاں کی خاموش فضا میں یکدم بولنے لگتیں۔ جھوٹے وعدے، جھوٹی قسمیں اس کی رگوں کو چیرنے لگتیں۔ جب شورنا قابل



برداشت ہو جاتا۔ وہ واپس کو اڑ رہی تھی۔

اور اب تو کئی دنوں سے کمزوری کی وجہ سے اس سے چند قدم چلنا دشوار ہو گیا تھا، وہ کو اڑ رہی سیڑھیوں میں جا کر بیٹھ جاتی۔ سر اٹھا کر اوپر تنے بے حس آسمان کو سپاٹ نظروں سے منتظر رہتی۔ جیسے اسے کسی اشارے، کسی بلاوے کا انتظار تھا۔ اب تو یہ انتظار اس کی آنکھوں میں وحشت بن کر ناپنے لگا تھا۔ کئی کئی روز گزر جاتے اسے کسی ذی روح سے ہم کلام ہوئے، شریفان دن میں ایک بار آکر کھانا دے جاتی۔ وہ دو چار لمحے کھا کر باقی وہیں بڑا رہنے دیتی۔ کبھی کبھار عبدل چاچا اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا کہتا، وہ چپ چاپ بیٹھی رہتی، اس کا جسم ہڈیوں کا پنجر بننا جا رہا تھا۔ براؤن کشادہ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے۔ بال سارے اترتے جا رہے تھے۔ ہاتھ جھریوں سے بھر گئے تھے اور رنگ زرد اور سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے کئی مہینوں سے آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ اس روز جنون میں اس نے گلدان اٹھا کر دیوار سے لگے آئینے پر ہی دے مارا تھا۔ کئی دن بعد آکر شریفان نے کو اڑ رہی صفائی کی تھی اس دوران کانچ کے ٹکڑوں پر چل کر اس نے دو تین بار اپنے پاؤں زخم کیے تھے۔ خود اذیتی میں جیسے اسے مزہ آ رہا تھا۔ عاکف چچا کی شکل دیکھے اسے مہینے گزر گئے تھے۔ شروع میں وہ اکثر آجاتے تھے۔ ایک آدھ دفعہ زبردستی ڈاکٹر سے دوا بھی منگوا کر دی، اسے اندر چل کر رہنے کو کہتے۔ وہ بے توجہی سے ان کی باتیں سنتی رہتی۔ پھر انہوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ دو تین دفعہ اسے نرس آئی نے بلوا بھیجا۔ وہ نہ گئی اور اب تو اسے کسی کو بھی دیکھنے سننے کا ارمان نہ رہا تھا۔ سب کچھ رفتہ رفتہ اسے بھولتا جا رہا تھا۔ کراچی، ممبا، پاپا، آپی، عبیدہ آپی، مومن اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔

موسم ایک بار پھر بدلتا شروع ہو گیا تھا۔ گرمیوں کے طویل دن گھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ برسات کا موسم اپنے عروج پر تھا اور اس سال تو خوب زوروں کی بارشیں ہو رہی تھیں۔ وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر ان بارشوں کو تڑپ تڑپ کر برستے دیکھتی پھر تھک کر چارپائی پر آگئی اور باہر پرستی بوندوں کی آوازیں سنتی رہتی۔ اندر کوٹھی میں آج کل جیسے ہمارا تری ہوئی تھی۔ شریفان نے بتایا تھا اسے کہ "سارہ بی بی کا پچھلے ہفتے فون پر امریکہ میں رہ رہی زانی سے نکاح ہو گیا ہے۔ اور اب نومبر دسمبر میں امریکہ جا کر رہی رخصتی ہوگی یا پھر ہو سکتا ہے وہ لوگ ادھر آجائیں۔ آج کل بیگم صاحبہ اور چھوٹی بی بی دھڑا دھڑا شاپنگ کر رہی ہیں، کبھی سنگا پور تو کبھی پانگ گانگ ایسی ایسی غصب کی چیزیں خرید کر لا رہی ہیں کہ آنکھوں پر یقین نہیں آتا کہ یہ چیزیں اس زمین سے تعلق رکھتی ہیں۔"

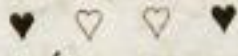
وہ پتھر بنی سب کچھ سنتی رہی۔ اس رات اس کا جنون جیسے پھر تازہ ہوا تھا، اس نے بی بی کبھی چیزیں اٹھا اٹھا کر دیواروں پر ماری تھیں۔ میز کے نیچے کتابوں کے آگے چنی اینٹوں اور پتھروں کی دیوار کو اکھاڑ کر پتھر دیواروں پر زور زور سے مارے تھے۔ کھانے کے برتن توڑ دئے تھے۔ کوٹھڑی میں جتنا اکلوتا ساٹھ والٹ کا بلب پتھر مار کر توڑ دیا تھا اور پھر گھپ اندھیرے میں نیچے زمین پر بیٹھ کر وہ سج تک روتی رہی تھی۔

اس جنون کی قیمت اسے کئی دن بستر بخار کی صورت میں پھنک کر ادا کرنا پڑی تھی۔ خون اگل اگل کر اس کا دم منہ کو آنے لگا تھا۔ اب تو شریفان بھی صرف خوفِ خدا کی وجہ سے منہ پر کپڑا باندھ کر صفائی کرنے یا اسے کھانا دینے آتی تھی۔

اگست گزر گیا۔ بارشوں کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ اب تو بس بادل آتے گرجتے اور ہوا کے ساتھ اڑ جاتے۔ رات کو ہوا میں خنکی آگئی تھی۔ دنوں کی طوالت سکر کر رات میں سلا گئی تھی۔ اس میں اب کھڑکی میں کھڑے ہونے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ بس بستر پر پڑے پڑے کھڑکی سے باہر اڑتے بادلوں اور دھوپ کے تعاقب کو پتھر لائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہتی۔

"اگلے مہینے سارہ بی بی کی رخصتی ہے۔ رہبر میاں اور ان کے امی ابا ادھر آ رہے ہیں۔ یہیں سے رخصتی ہوگی۔ امریکہ جائیں گے، وہ بی بی کو لے کر اب تو جی مجھے ادھر آنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ کام ہی اتنا بڑھ گیا ہے ایک مہینے کی تو تاریخ پڑتی ہے۔ دن ہی کتنے ہیں۔" وہ خود ہی خود بولتی جا رہی تھی۔ سارے پتے پیلے زرد ہو کر درختوں سے گرنے لگے تھے، منڈ منڈ سے درخت اور سرمئی فضا اس کے اندر غبار سا پیدا کر دیتے۔

"میرے اللہ اس دن سے پہلے میری سن لینا۔ مجھے اپنے پاس بلا لینا۔ اس دن سے پہلے، کوئی تو میری بھی خواہش پوری کر دینا۔" ذوقی ابھرتی دھڑکنوں نے دعا کی۔



ولید کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ اس نے پارٹ ٹائم جاب بھی کر لی تھی۔ اس نے بعد میں دوبارہ ایمین سے اصرار کیا کہ وہ داخلہ بھجوائے مگر اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود اس کی نظر کرم ایمین پر بڑھتی جا رہی تھی۔ حالانکہ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن ایمین کی چھٹی جس اسے ان نظروں کا مفہوم سمجھا چکی تھی، وہ اب ولید سے بدکنے لگی تھی۔ جیسے ہی اس کے آفس سے آنے کا نام ہوتا۔ وہ کہیں نہ کہیں روپوش ہو جاتی۔ نماز کی نیت باندھ کر کھڑی ہو جاتی، واش روم میں بند ہو جاتی۔

اس گھر میں اس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال گزارے تھے۔ لیکن یہاں کے رویے اس کی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ جب بچپن میں اس کا دل چاہتا کہ ولید اس کے ساتھ کھیلے۔ اس کے دکھ بانٹے تو وہ اس کا مسخر اڑاتا تھا۔ اس پر طرکے تیر چلا آتا تھا۔ تائی جی اور تایا جی سے اس کی شکایتیں لگا کر اس کی پٹائی کروا تا تھا اور اب جب اسے خود سنگ جینے کی عادت ہو چلی تھی۔ وہ اس کی اس سنگت کو توڑنے چلا آیا تھا اسے اس کی موجودگی سے گھبراہٹ ہونے لگتی۔ "ایمن! میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ پتا نہیں تم کہاں غائب ہو جاتی ہو۔" وہ پچھلے صحن میں تائی جی کے کپڑوں کو دانہ ڈال کر سیڑھیوں میں بیٹھی اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جب وہ اچانک اس کے سامنے آکر بولا تو وہ اچھل ہی پڑی۔

"ک۔ کیوں مجھ سے کیا کام تھا؟" وہ ہکلا گئی۔ "ظاہر ہے کوئی کام ہی تھا تو ڈھونڈ رہا تھا۔" وہ کچھ اکتا کر بولا۔ "میرے سر میں بہت درد ہے۔ ایک کپ چائے تو بناؤ۔"

"اچھا! وہ فوراً مڑنے لگی اس نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ایمن! میری بات سنو۔" ایمین کو شدید شاک لگا تھا۔

اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ جھڑ لیا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟" وہ غصے سے بولی۔ "تم مجھ سے کترائے کیوں لگی ہو یہاں جاتا ہوں وہاں سے بھاگ جاتی ہو۔" وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں میں بھلا کیوں بھاگنے لگی۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔ "تم نہ مانو، بہر حال یہی بات ہے۔ اچھا ذرا بیٹھ کر میری بات سنو۔" وہ پھر ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھانے لگا وہ بدک کر بیٹھے ہوئی۔

"ایمن! میں کوئی رو مینٹنک بندہ نہیں ہوں، ذرا پریکٹیکل قسم کا اور تھوڑا سا بد لحاظ ہوں۔ تم تو مجھے سمجھتی ہو نا؟" اس نے ابھ کر اسے دیکھا۔ "گھر کی حالت تمہارے سامنے ہے۔ اس گھر کو اب صرف تم سنبھال دے سکتی ہو۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟" وہ روتی روتی



بولا اس نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

”مجھے بہت باتیں نہیں آتیں۔ بس مجھے تم سے اتنا کہنا ہے کہ اس گھر کو سہارا دینے میں میرا ساتھ دے مجھے تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے۔“

اب اس کی بات اس قدر مبہم بھی نہ تھی کہ بالکل اس کے سر کے اوپر سے گزر جاتی۔

”میں نے امی ابو سے بھی بات کر لی ہے ان دونوں کی بھی یہی خواہش ہے۔“ وہ اس کی خاموشی کو شاید رضامندی سمجھ رہا تھا۔

”مسٹر ولید! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم نہیں شاید کہ میں ایک یتیم ویسے بے مایہ سی لڑکی ہوں اور یہ اس گھر کی روایت نہیں کہ یتیموں کو اٹھا کر سرداری دے دی جائے اور اگر ایسا ہوتا تو بھی میں آپ کا ساتھ قبول نہ کرتی۔ تمہارے دیے ہوئے زخم میرے دل میں ابھی بھی تازہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ تلوار کا زخم بھر جاتا ہے مگر زبان کے زخم نہیں بھرتے میں تمہارا ہتک آمیز رویہ تمام عمر نہیں بھول سکوں گی اور جس کو انسان بھول نہ سکے۔ اس معاملے میں پھر اسے کوئی بھول نہیں کرنا چاہیے۔“

اس کا لہجہ سخت اور بے لچک تھا۔

”پہلی بات تو یہ کہ وہ میری نا سمجھی کا دور تھا جس پر میں شرمندہ ہوں۔ اور مجھے میرے ان رویوں پر کسی نے ٹوکا بھی نہیں۔ یہ کام تو والدین کا ہوتا ہے اور سمجھ آنے کے بعد سے اب تک اگر تم چاہو تو اپنے ان رویوں کی میں تم سے معافی بھی مانگ سکتا ہوں اور اس وقت میرا دل کرتا تھا کہ تم میرے ان ناروا رویوں پر مجھ سے لڑو تم ناروا شروع کر دیتیں۔ میں اور چڑ جاتا۔ بہر حال بچوں کی کیا سائیکس ہوتی ہے۔ پھر بھی میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔“

وہ کئی یتیم ویسے ہونے کی بات اور بے مایہ ہونے کی تو تم یوں کہو کہ میں کون سا صاحب ثروت مالدار ہوں۔ ہاں تمہارے معیار پر میں اس لحاظ سے پورا نہیں اترتا کہ میں تمہیں آئندہ کوئی بہت حسین لکڑی زندگی نہیں دے سکتا۔ یہی گھر ہے اور اس کے مسائل ہیں۔ یہی افراد ہیں جس کے ساتھ شاید تم رہنا پسند نہ کرو۔ بہر حال یہ تمہاری اپنی مرضی ہے۔ میں نے تمہارے سامنے ایک تجویز رکھی ہے۔ جو میرے دل کی خوشی اور خواہش بھی ہے۔ اگر تمہیں پسند ہو تو مان لینا۔ ورنہ کوئی زبردستی نہیں۔ چائے امی کے کمرے میں لے آنا۔ میں وہیں ہوں۔“

وہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس مڑ گیا۔ وہ شش و پنج میں کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔

”خیر!“ اس تجویز پر غور کرنے کا اس کا بہر حال کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ سر جھٹک کر چائے بنانے چل دی۔

ان ہی دنوں تائی جی کے بھانجے کی لاہور میں شادی آگئی۔ تائی جی کو جوڑوں کے درد نے عاجز کر رکھا تھا اور جگہ ایسی بھی نہیں تھی کہ چھوڑی جاسکتی آخر ان کی بہن کے بیٹے کا معاملہ تھا۔ انہوں نے تیاری شروع کر دی۔

”تائی جی! مجھے بھی جانا ہے؟“ ان کا صندوق کھولتے ہوئے اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”ہاں تو تمہارے بغیر میں جاسکتی ہوں۔ اٹھا بیٹھا مجھ سے نہیں جاتا تمہارے سہارے کے بغیر وہ ولید بھی کہہ رہا تھا کہ اسے بھی دفتر سے ان دنوں چھٹی ہے۔ ایک دو چھٹیاں اور کر لے گا۔ سب چلیں گے اتنے دنوں بعد تو کوئی خوشی کا موقع آیا ہے۔“ انہوں نے جواب دیا تو اس کا دل خوش ہو گیا۔

(آخری قسط آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com





عبیرہ کالج سے نکل کر پوائنٹ کی تلاش میں کھڑی تھی۔

”عبیرہ! عبیرہ! بیٹا! کسی نے اسے گاڑی میں سے پکارا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ آف وہائٹ سوٹ میں ہم رنگ دوپٹہ اوڑھے مسز حق اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ جھجک سی گئی۔ ”بیٹا مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ پلیز کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ آئیں گی۔“ ان کا لہجہ ان کی طرح شائستہ اور مہذب تھا۔ وہ انکار نہیں کر سکی۔ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”یہاں تو بڑا رش ہے ڈرائیور گاڑی آگے لے جاؤ۔“ وہ ڈرائیور سے بولیں۔

”بس یہیں سائیڈ پر روک دو۔“ کالج کی باؤنڈری وال ختم ہوتے ہی وہ دوسری تیسری کوٹھی کے درمیان گاڑی رکوا کر بولیں۔ ڈرائیور گاڑی روک کر دروازہ کھول کر باہر چلا گیا اور کچھ دور درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹا! یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ میں آپ میں کیوں انٹرسٹڈ ہوں۔“ انہوں نے تمہید باندھی۔ ”اگر اس معاملے میں میں تمہاری رائے پوچھوں تو تم کیا کہو گی۔“

”وہی جو غزالہ آئی آپ سے کہیں گی۔“ وہ فوراً بولی۔

”ہوں اچھی بات ہے اچھی اور نیک بیٹیاں ایسے ہی کہتی ہیں۔ خیر یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ مان نہیں رہیں اس رشتے پر۔ میری ہزار کوشش کے باوجود مجھے آپ سے صرف یہ پوچھنا تھا کہ اگر آپ کے تسلسلے میں بات کرنی ہو تو آپ کی غزالہ آئی کے علاوہ اور کس سے بات کی جاسکتی ہے؟“

”ان ہی سے۔“ وہ اسی لہجے میں بولی۔

”پھر بھی بیٹا! ان کے علاوہ کوئی اور بڑا..... آپ کی دوسری سسٹرز اور بھائی کس کے پاس رہتے ہیں؟“

”میری بڑی سسٹر میرے تایا جان کے پاس کراچی میں رہتی ہیں۔“

”آپ مجھے ان کا ایڈریس دیں گی۔“

”یہ اچھا نہیں لگتا۔ غزالہ آئی کیا سوچیں گی۔“ وہ انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں آپ کا نام بیچ میں نہیں آنے دوں گی۔ بس آپ مجھے ان کا ایڈریس دے دیں بیٹا! میں کوئی غلط کام نہیں کرنا

چاہتی ایک نیک کام جائز اور باعزت طریقے سے کرنا چاہ رہی ہوں اور یہ میرا حق بھی ہے۔ اس پر اپنے تایا کا ایڈریس



”ہاں تو میں تمہارے بغیر جاسکتی ہوں۔ ولید بھی کہہ رہا تھا کہ اس کی بھی دفتر سے ان دنوں چھٹیاں ہیں ایک دو چھٹیاں اور لے لے گا سب چلیں گے اتنے دنوں بعد تو کوئی خوشی کا موقع آیا ہے۔“

انہوں نے جواب دیا تو اس کا دل خوش ہو گیا۔ شادی کی خوشی کس کو بھی اسے توفیق سے ملنے کا شوق تھا۔

”تائی جی! میں فضا کو کچھ دنوں کے لیے ادھر لے آؤں؟“ اس نے دوسری فرمائش جڑی۔

تائی جی نے غور سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھا۔

”ہاں لے آنا، بچی تھوڑا خوش ہو لے گی اگر۔ عاکف نے اچھا اسے قید کیا ہوا ہے۔“ وہ بھی اچھے موڈ میں تھیں۔

وہ انگلیوں پر گن گن کر دن گزارنے لگی۔

شام کی ٹرین سے انہیں کراچی سے لاہور جانا تھا۔ اسے تو ساری رات نیند نہیں آئی تھی تیاری اس نے رات ہی مکمل کر لی تھی۔ اب بھی صبح اٹھ کر اس نے نماز پڑھی، نماز پڑھ کر وہ باہر نکل آئی۔ تائی جی اور تائی جی کے کمروں میں جھانکا وہ دونوں اٹھ چکے تھے وہ پچھلے صحن کی طرف نکل آئی کہ تائی جی کے کبوتروں کو دانہ ڈال دے۔ جیسے ہی اس نے صحن میں قدم رکھا کبوتروں کے ڈربے کو دیکھتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔

بلی اپنا کام کر گئی تھی۔

ایک کبوتر اپنے ہی خون میں ڈوبا مردہ پڑا تھا اور باقی تینوں کبوتر زخمی حالت میں تڑپ رہے تھے۔

اس کی چیخ کی آواز سن کر تائی جی جلدی سے آگئے وہ بچن کی طرف ہی جا رہے تھے چائے کا کہنے کہ اس کی چیخ سن کر ادھر آگئے۔

”کیا ہوا؟“ ایمن کیا ہوا؟“ وہ ان کو دیکھ کر اور چیخنے لگی۔

”تائی جی! تائی جی! دیکھیں کبوتروں کی حالت رات تک اچھے بھلے تھے۔“

وہ پتا نہیں کیوں زور زور سے رونے لگی تھی۔

”ایمن! ایمن! کیا ہو گیا ہے۔ کہیں ڈربے کھلے رہ گئے ہوں گے زرات کو بلی کو موقع مل گیا تم حوصلہ کرو۔ بچوں کی طرح رونے لگیں۔“

وہ قریب آکر اسے ساتھ لگا کر بولے وہ روتی گئی۔

تھوڑی دیر میں تائی جی اور ولید بھی آگئے اس کی کبوتروں کی وجہ سے یہ حالت دیکھ کر ولید تو ہنسنے ہی لگا۔

”توبہ امی! چڑیا جتنا دل ہے اس کا۔ بھلا کوئی کسی جانور کو مردہ دیکھ کر ایسے بھی روتا ہے۔“

”چلو ایمن! تم اندر۔ ڈر گئی ہے اتنا منہ اندھیرے ادھر آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔“ تائی جی نے اسے ساتھ لگا کر زرا خفگی سے کہا۔

اس کے آنسو نہیں تھم رہے تھے شام تک اس کی طبیعت بوجھل رہی۔ بہر حال ٹرین کا سفر شروع ہونے پر اس کا دھیان صبح والے واقعے سے کچھ ہٹ گیا لیکن دل کی آوازیں نہ گئی اسے اپنی کیفیت خود سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کی کیفیت میں اسے فضا سے ملنے کی خوشی بھی بھول گئی تھی۔ ”پتا نہیں کیا ہوا ہے مجھے۔“

اس نے جھرا کر کھڑی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچا۔

وہاں جاتے ہی مندی کا فنکشن اہمیت کرنا پڑا، وہ جاری رات جاری رہا پہلے یہ لوگ مندی لے کر گئے اس کے بعد ان کی اولے آئے، ایک سفر کی ٹکان اوپر سے دل کا بوجھل پن اس پر یہ ہلا گلا اس کی طبیعت بری طرح ہزاروں کی تھی۔ خدا خدا کر کے رات گزار کر سب لوگ رات کے فنکشن کے تھکے ہارے جو سوئے دوپہر تھیں۔

سے پہلے کوئی نہیں اٹھا۔ وہ دس بجے سے اٹھ کر پیر جلی بلی کی طرح اندر باہر پھر رہی تھی خدا جانے تائی جی کدھر گئے ہوئے تھے ولید بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور تائی جی سے تو کچھ کہنا ہی فضول تھا ان کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں تھی شام گئے اسے تائی جی باہر جاتے نظر آئے وہ بھاگ کر ان کے پاس پہنچی۔

”تائی جی! تائی جی! آپ صبح سے کہاں تھے میں صبح سے آپ کو دیکھ رہی تھی۔“ وہ بے قراری سے بولی۔

”بیٹا! باہر کچھ کام تھا، دوسرے مدت بعد تو رشتہ داروں سے ملاقات ہوئی ہے ویسے بھی بارہ بجے تو سو کر اٹھا ہوں کیوں تمہیں کوئی کام تھا۔“

اندر باہر رات کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

”جی وہ فضا کی طرف۔ آپ کو پتا تو ہے۔“ وہ انگلیاں چٹکا کر بولی۔

”ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پر اس وقت تو اچھا نہیں لگتا اب بار بار اتنا روانہ ہونے والی ہے انشاء اللہ کل صبح جس گیارہ بجے چلیں گے۔ تم مجھے یاد دلاؤ نا ویسے مجھے خود بھی یاد ہے۔“

”تائی جی!“ وہ لاچار سی بولی۔

”بس بیٹا! اب ایک رات کی تو بات ہے، تم فکر نہ کرو کل ہم صبح ہی نکل چلیں گے۔ تمہاری تائی تمہیں اندر بلا رہی تھیں سن لو جا کر۔“

کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئے۔ وہ بے بسی سے گھر اسانس لے کر رہ گئی۔ اس شہر میں اگر بھی کس قدر مجبور تھی فون کرنے کا اب اس کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ گزشتہ کئی مہینوں سے اس کے فون کرنے پر فضا فون اینڈ نہیں کرتی تھی۔ نوکر کوئی نہ کوئی ہمانا کر دیتے تھے یا پھر فون بند کر دیا جاتا تھا۔

وہ تائی جی کے پاس آکر رات کے فنکشن کی تیاری کرنے لگی۔

رائل بلیو سوٹ پر مقیش کا کام تھا اس کے ساتھ میچنگ سلور ٹیگنوں کی جیولری پہنے لائٹ میک اپ میں وہ کئی لوگوں سے اپنی تعریف سن چکی تھی اور تائی جی نے تو برملا کہنا شروع کر دیا تھا کہ ”ہاں یہ میری ہونے والی ہو ہے۔“ وہ اس زبردستی پر جربز ہو کر رہ جاتی۔

بارت کی روانگی کے وقت رش کی وجہ سے وہ پیچھے پیچھے ہو کر کھڑی ہو رہی تھی تائی جی پہلے ہی کسی گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں وہ ذرا سی پیچھے ہی ایک دم سے کیمرے کا فلاش چکا۔

”کیا ہے تمہیں؟ میری طرف تھکی جا رہی ہو۔“ نظر نہیں آ رہا۔ میری تصویریں بن رہی ہیں اچھا بھلا اسکوپ خراب کر رہی ہو اپنی سڑی ہوئی شکل ساتھ میں لا کر پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو۔“

ولید کی تیز آواز پر وہ اچھل ہی پڑی اس کا کوئی کزن اس کی تصویر اتار رہا تھا۔ وہ شرمندہ سی ہو کر دوسری طرف ہٹ گئی۔

”ولید ہے ہی بد تمیز اور بے لحاظ پھر کہتا ہے۔ میرا ساتھ دو۔ اس جیسے بے لحاظ شخص کے ساتھ انسان کبھی بھی نہیں گزار سکتا۔ ایک دن رخ سے نکل کر پھر سے اس میں جا گھسو۔“ وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی۔

”چلو بھئی! گیارہ بجے تائی جی کے سر پر تھی۔ وہ ناشتہ کر چکے تھے اس کی شکل دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔“

”چلو بھئی! میں تو تیار ہوں۔ ولید کا انتظار کر رہا تھا۔ گاڑی کی چابی لینے گیا ہے۔“ وہ ان کی بات سن کر خوش ہو گئی۔

ولید کی واپسی آدھے گھنٹے میں ہوئی۔ آدھا گھنٹہ اس نے بے حد بے چینی سے گزارا۔

”چلو بھئی! ایمن۔ ولید! تم نے بہت دیر لگا دی۔“ تائی جی اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

”ابو! وہ اگلے خالد گاڑی لے کر گئے ہوئے تھے۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ وہ بھی ان دونوں کے پیچھے نکل گئی۔



کب گاڑی عاکف چچا کے گیٹ کے اندر جا کر کر رکی۔ اسے کچھ خبر نہ ہو سکی۔ وہ تو اسی خوش کن خیال میں مگن تھی کہ فضا سے ملنا ہے ابھی اور اسے ساتھ لے جانے کی بات وہ پہلے ہی تائی جی سے کر چکی تھی۔

عاکف چچا اور نرگس آنٹی گھر پر ہی مل گئے انہیں اپنے سامنے اچانک دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”ہم نے سوچا خود ہی مل آئیں جا کر۔ تم نے تو نہ آنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“ تائی جی عاکف چچا سے گلے ملے ہوئے بولے۔

”بھائی جان! کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے سب۔ کس قدر مصروفیت ہے ادھر۔“ وہ ذرا شرمندگی سے بولے۔

”ہاں۔ ساری خدائی کا بوجھ تمہارے کندھوں پر ہے نا اس لیے۔ اور آپ کا کیا حال ہے؟“ تائی جی نے ازارا مروت نرگس آنٹی سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ ان کا لہجہ رسمی تھا۔

”عاکف! یہ میرا بیٹا ولید ہے اور یہ ایمن ہے یاد ہے نا تمہیں؟“ تائی جی نے اپنے پیچھے کھڑے دونوں کا تعارف کرایا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ مجھے یاد ہے۔“ انہوں نے ولید کو گلے لگایا اور ایمن کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”دیکھیں آپ۔ نرگس! کسی کو چائے کا تو کہنا۔“ وہ تینوں بیٹھ گئے۔

”یہاں شادی تھی۔ تمہاری بھابی کی بہن ہے راشدہ۔ اس کے بیٹے کی اس لیے آئے تھے۔ سوچا فضا سے ملتے چلیں، بلکہ اسے ساتھ لینے آئے تھے۔ کچھ دن وہ ہمارے ساتھ رہے گی کراچی میں۔“

تائی جی نے تمہید باندھی عاکف چچا کا چہرہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔

”کہاں ہے یہ فضا؟ تم اسے بلاؤ چائے کو چھوڑو آج ادھر ولیمہ ہے۔ وہ آج ہمارے ساتھ چلے۔“ عاکف چچا نے نرگس آنٹی کی طرف دیکھا۔

”بھائی صاحب! وہ تو اپنے کالج ٹرپ کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے گئی ہوئی ہے۔ کل گئی تھی۔ پندرہ دن کا ٹرپ ہے۔ آپ آئے گی اطلاع کرتے تو ہم اسے نہ جانے دیتے۔“ نرگس آنٹی نے جواب دیا۔

”اوہ یہ تو برا ہوا۔ ایمن تو آنٹی اسی لیے تھی ہمارے ساتھ۔ اتنے برس گزر گئے۔ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔ یہ سب عاکف کی لاپرواہیوں کا نتیجہ ہے۔ خیر میں ایمن کو ادھر ہی چھوڑ جاتا ہوں۔ کل پرسوں تک پھر پندرہ دن بعد ولید دوبارہ آئے گا اور ان دونوں کو لے آئے گا کراچی۔“ تائی جی نے ایمن کے دل کی بات کہی۔

”لیکن اس کی تو کلاسز ہو رہی ہیں۔ ایگزیم تک وہ کیسے جاسکے گی۔ تھرڈ ایئر میں ہے وہ۔“ نرگس آنٹی کا لہجہ بیزار سا تھا۔

”ساری عمر بڑھا ہی تو ہے۔ اب پندرہ بیس دن چھٹی کر لے گی۔ میں تو بھی اب ایمن کو مزید ٹال نہیں سکتا۔ عرصہ میں بھی اسے ادھر نہیں لاسکا۔ خیر اب یہ یہیں رہ کر فضا کا انتظار کرے گی۔ کیوں ایمن رہ لوگی نا؟“

تائی جی نے پوچھا۔

”جی تائی جی! رہ لوں گی۔“ وہ فوراً بولی۔

”چلیں جیسے آپ کی مرضی، ہم دونوں تو کل چائنا جا رہے ہیں بزنس کے سلسلے میں۔ اگلے ماہ سارہ بیٹی کی شادی ہے کچھ اس کی تیاری کے سلسلے میں۔ ایسے میں یہ ادھر اکیلی کیسے رہے گی۔ سارہ بیٹی بھی تو ہمارے ساتھ جائے گی۔“ نرگس آنٹی کا موڈ اسے رکھنے کا نہیں تھا۔

”وہ پھر اب؟“ تائی جی سوچ میں پڑ گئے۔

”ابو! میں پندرہ دن بعد ایمن کو لے آؤں گا، یا اگر فضا کو لے جاؤں گا۔ ابھی ایمن ہمارے ساتھ ہی چلے گی۔“ ولید نے کہا۔

”چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ کیوں ایمن ٹھیک ہے نا؟“ تائی جی نے اس کی رائے چاہی۔

اس نے بے دلی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں دیکھوں چائے نہیں آئی ابھی۔“ نرگس آنٹی مطمئن ہو کر کھڑی ہو گئیں۔

عاکف چچا اور تائی جی سیاست کی باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ولید بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا تو وہ بیزار ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”تائی جی میں ذرا باہر ہوں۔“ کہہ کر وہ باہر نکل آئی۔

لاؤنج سے نکل کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”کدھر جاؤں۔ موسم اچھا ہو رہا ہے۔ ابر آلود سا۔ باہر کی طرف جانا چاہیے۔“ اس نے پاس سے گزرتے ایک ملازم سے باہر کا راستہ پوچھا اور باہر نکل آئی۔

موسم واقعی خوبصورت ہو رہا تھا۔ ”گلستا ہے بارش ہوگی۔“ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، ابھی کچھ دیر پہلے تو دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سیاہ گھنے بادلوں سے آسمان بھر رہا تھا۔ وہ لان میں آگئی۔

”گھر تو بہت خوبصورت ہے عاکف چچا کا۔ میں نے غلطی کی ان سے فضا کے کمرے کا پوچھتی۔ وہاں اس کی کوئی تصویر تو ہوگی۔“ اس نے دل میں سوچا۔

”ابھی جا کر پوچھتی ہوں۔“ وہ لان میں گھٹلنے لگی۔

”پتا نہیں اب فضا کیسی ہو گئی ہوگی۔ اس کا قد کتنا بڑا ہو گیا ہو گا رنگ اتنا ہی سفید ہو گا۔ آنٹی بتا رہی تھیں وہ اب تھرڈ ایئر میں ہے۔ کاش میں کل آجاتی۔“ وہ ٹپکتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”یہ شاید انیکسی ہے۔“ وہ انیکسی کے پاس سے گزرتے ہوئے خود سے بولی۔

”پندرہ دن کا ٹرپ تو خاصا لمبا ہے ورنہ میں اتنے دن ادھر رہ لیتی یہ سروٹ کو ارٹز لگ رہے ہیں۔“ ساتھ ساتھ بننے پانچ چھ کو ارٹز کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا۔

”یہ بھی کو ارٹز ہے۔ کتنا اکیلا تنہا سا۔ ساری بلڈنگ سے ہٹ کر کتنا عجیب لگ رہا ہے۔“ وہ درختوں کی رو سے گزرتے درخت کے پاس پہنچی۔

”یہ بھی امیروں کے چوتھلے ہوتے ہیں۔ نوکروں کی فوج رکھنا۔“ وہ کو ارٹز کے دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔

”چلنا چاہیے اب۔ تائی جی سے کہتی ہوں۔ فضا کا کمرہ دیکھ کر واپس چلتے ہیں۔ تائی جی انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”یہ کو ارٹز عجیب سا لگ رہا ہے۔ الگ تھلگ سا۔ دیکھوں اس میں کون رہتا ہے۔“ کوئی چیز اسے کھینچ رہی تھی۔ وہ واپس مڑی اور کو ارٹز کا دروازہ ہلکے سے دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ آگے چھوٹا سا صحن جس کے ایک کونے میں مٹی کے ٹیل کا چولہا اور دو چار گرد آلود برتن پڑے تھے۔ اندر کی طرف ایک کمرہ نظر آتا تھا۔

”توبہ ڈر لگ رہا ہے۔ واپس چلتی ہوں۔“ وہ پھر مڑنے لگی۔ ایک دم اسے لگا کوئی کھانا ہے۔ وہ ٹھٹھک کر اس دروازے میں کون ہو سکتا ہے اندر۔ دیکھنا چاہیے اتنی خوبصورت کوٹھی اور اتنا بوسیدہ سا کو ارٹز۔“ وہ اندر کی طرف بڑھی۔

”اس دروازے میں کون ہو سکتا ہے اندر۔ دیکھنا چاہیے اتنی خوبصورت کوٹھی اور اتنا بوسیدہ سا کو ارٹز۔“ وہ اندر کی طرف بڑھی۔

”اس دروازے میں کون ہو سکتا ہے اندر۔ دیکھنا چاہیے اتنی خوبصورت کوٹھی اور اتنا بوسیدہ سا کو ارٹز۔“ وہ اندر کی طرف بڑھی۔



کمرے میں میٹالا سا اندھیرا تھا۔ روشنی کا واحد ذریعہ کھلی کھڑکی تھی۔ پورا کوارٹر ہی سیلن زدہ تھا۔ گیلی کالی سیاہ دیواریں اور نیچی سی چھت۔ کمرے کا حلیہ صحن سے بھی بدتر تھا۔ فرش پر جا بجا گند بکھرا ہوا تھا۔ مٹی سے اٹا ہوا فرش کمرے کے وسط میں ایک جھلنگا سی چارپائی پڑی تھی۔ ابھی وہ یہ غور ہی کر رہی تھی کہ چارپائی پر کوئی ہے یا یہ خالی ہے کہ پھر اسے کھانسی کی آواز آئی۔ آواز چارپائی ہی سے آئی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

ایک نحیف و کمزور سا وجود میلے بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں روشنی کم ہونے کی وجہ سے اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ ”آپ کون ہیں؟“ کھانسی کی وجہ سے ملتے ہوئے اس ہڈیوں کے پنجرے سے اس نے پوچھا۔ اس کی آواز پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایمن ڈر کر پیچھے ہٹ گئی آنکھوں کی جگہ دو تاریک گڑھے تھے۔ ”آپ کون ہیں؟“ اس نے ذرا ہکا بکا کر پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایمن کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کمرے کا واحد فرنیچر تین ٹانگوں کی ایک میز تھی۔ جس کی چوتھی ٹانگہ اینٹوں کا ڈھیر تھی۔ اس کے نیچے اینٹیں اور پتھر پڑے تھے۔ میز پر کچھ بوسیدہ سی کتابیں پڑی تھیں۔ ایک دم سے وہ ہڈیوں کا پنجرہ زور سے کھانسا اور چارپائی سے اچھل کر اس نے دائیں طرف الٹی کر دی۔ خون کا چھوٹا سا ڈھیر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ خون اگل کر وہ جیسے شانت ہو کر پھر لیٹ گئی۔

”اوہ میرے خدایہ تو کوئی لڑکی لگتی ہے۔“ کچھ دیر وہ اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے میز پر سے ایک کتاب اٹھالی۔ پہلا ورق الٹا۔ ”پتا نہیں بے چاری کون ہے اور اس حال میں اور اندروالوں کو کچھ خبر نہیں۔“

”نفسہ سکندر۔“ کتاب کے پہلے ورق پر بڑا بڑا لکھا تھا۔ ”نہی۔ نفسہ سکندر!“ سانس اس کے خلق میں اٹک گئی۔ اس نے جلدی سے بستر کی طرف دیکھا وہ شاید ہوش بھی یا سوئی ہوئی۔ ”تم تم کون ہو؟“ وہ وحشت سے پلٹی اور اسے کندھوں سے جھنجھوڑنے لگی کندھوں کی جگہ جیسے دو کرف ہڈیاں اس کے ہاتھوں میں تھیں۔

اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر بے حسی سے اسے دیکھا۔ ”تم۔۔۔ تم نفسہ ہو؟“ وہ اٹک اٹک کر بولی اسے پھر کھانسی شروع ہو گئی تھی ٹن ٹن جیسے ٹین کا برتن بول رہا۔ کوئی لہجہ ہاتھ آتا ہے نہ آواز۔ محض ٹن ٹن۔

”تم۔۔۔ تم کون ہو؟ بولو۔۔۔ تم کون ہو؟ تم نفسہ ہو۔ یہ کتاب نفسہ کی ہے بتاؤ مجھے تم کون ہو؟“ اس پر سوار ہو گئی۔ وہ محض تاریک گڑھوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”میں میں ایمن ہوں۔ نفسہ کی بہن۔ مجھے بتاؤ۔ وہ کہاں ہے بولو۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”ہاں! کاشانی دیر بعد اس کے اب ملے۔“ ”نفسہ! نفسہ! میری جان۔ تم نفسہ ہو۔ بولو میری بہن۔“ وہ اس سے لپٹ کر پیچھے لگی۔ نفسہ نے رکنے لگا۔

”تایا جی! تایا جی!“ وہ چیختی ہوئی باہر بھاگی۔

وہ اتنا تیز اپنی زندگی میں کبھی نہیں بھاگی ہوگی اور نہ اتنی زور سے چیختی ہوگی۔ اس کی چیخوں کی آواز سن

عاکف چچا اور ولید پہلے ہی باہر نکل آئے۔ دو تین ملازم بھی ادھر ادھر سے آگئے تھے۔ ”تایا جی! تایا جی! میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو جیتی جاگتی قیامت دکھاؤں۔“ وہ تایا جی کے پاس پہنچ کر ان کا بازو کھینچتے ہوئے بولی۔

”کیا ہوا ہے ایمن! کچھ بتاؤ تو سہی۔“ تایا جی اس کے ساتھ کھینچتے ہوئے بولے۔ ”تایا جی! قہر ٹوٹا ہے۔ تایا جی دیکھیں تو آکر۔ ہمارے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے۔ تایا جی! نفسہ! میری گڑیا۔“ وہ پھر سے بھاگنے لگی۔ تایا جی اور ولید نا سمجھی میں اس کے ساتھ تیز تیز چلنے لگے اور عاکف چچا تولان کے وسط میں ہی رک گئے تھے۔

اور کوارٹر میں پہنچ کر جب اس نے روتے ہوئے بستر پر پڑے اس ڈھانچے سے انہیں متعارف کرایا تو وہ لرز کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

”تایا جی! یہ نفسہ ہے۔ تایا جی! ہماری نفسہ، میرے پیپا کی گڑیا۔ تایا جی میری ماما کی چندا۔ دیکھیں تایا جی اسے دیکھیں۔ ہماری پریوں جیسی نفسہ ہے یہ۔ تایا جی یہ میری نفسہ ہے۔“

آنسوؤں کی قطاریں اس کی آنکھوں سے بہہ رہی تھیں۔ وہ زور زور سے رو رہی تھی ”نفسہ شاید بے ہوش تھی۔“

”یہ ابھی بولی تھی۔ تایا جی! ابھی۔“ اس نے آئی۔ کہا تھا۔ ”نفسہ آپ! مرجائے تمہارے لیے۔ نفسہ میری گڑیا آپ! تمہارے اوپر قربان ہو جائے۔ یہ تم نے کیا کیا اپنے ساتھ آپ! کو خبر بھی نہ کی اور کس رستے پر جا پڑیں نفسہ۔ آپ! کو تو بتایا ہوتا۔ وہ اپنی جان دے کر تمہیں بچا لیتی نفسہ!“ وہ روتی جا رہی تھی۔

”نہیں۔ عاکف ایسا نہیں کر سکتا۔“ تایا جی بڑبڑائے۔ ولید ایک دم سے آگے بڑھا اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ خون کے چھوٹے سے ڈھیر میں اس کے جوتے لتھڑ گئے وہ اسے اٹھا کر باہر کی طرف بھاگا۔

”ابو جی! میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہا ہوں۔“ وہ جاتے جاتے بولا۔ تایا جی بھی اس کے پیچھے لپکے۔ ایمن بھی مردہ قدموں سے ان دونوں کے ساتھ باہر نکل گئی۔

جب تک وہ لان عبور کرتی۔ ولید اور تایا جی نفسہ کو لے کر جا چکے تھے۔ ایمن کے جسم سے جان ختم ہو چکی تھی۔ گھٹ گھٹ کر اس نے لان عبور کیا تھا۔ کوٹھی تک پہنچ کر وہ بے دم ہو گئی وہیں میڑھیوں پر ڈھیر ہو گئی۔ ”کیا وہ واقعی نفسہ تھی؟“ آنکھ سے بہتے آنسوؤں کو پونچھ کر اس نے سامنے کا دھند لایا ہوا منظر دیکھتے ہوئے سوچا۔

”نہیں یہ ضروری نہیں وہ نفسہ ہو وہ تو اس قدر خوبصورت تھی۔ ابھی کچھ عرصے تک وہ مجھ سے فون پر بات کرتی رہی تھی اور اب یکایک کیا ہو گیا اسے وہ بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹر ایڈمٹ کرے گا اسے۔ دو چار ہفتوں یا ایک آدھ مہینے میں ٹھیک ہو جائے گی وہ۔ ہاں مجھے یقین ہے۔ وہ اچھی ہو جائے گی۔ لیکن وہ خون؟“

وہ رگوں کو کاٹ دینے والا لیل اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ”یا اللہ رحم کرنا! اب اور کوئی نیا صدمہ ہم نہیں سہہ سکتے۔“ وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔ اسے اس حالت میں بیٹھے شاید آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ جب کسی گاڑی کے آنے اور گیٹ کھلنے کی آواز آئی اس نے سر اٹھا کر دیکھا ولید فرنٹ سیٹ پر بیٹھا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور تایا جی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

وہ تقریباً بھاگتے ہوئے گاڑی تک پہنچی گاڑی ولید نے رستے میں ہی روک دی تھی۔ اس نے بے قراری سے



پچھلا دروازہ کھولنا چاہا وہ لاکھڑا تھا۔ تایا جی نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کا لاک کھولا۔  
ان کے پاس ہی پچھلی سیٹ پر ہڈیوں کا ڈھیر بے جان پڑا تھا۔  
اس نے ایک نظر اس ڈھیر پر ڈالی اور دوسری تایا جی کے تاریک چہرے پر اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں

رہی۔  
”تایا جی! یہ فضا نہیں ہے نا؟ یہ تو کوئی اور ہے۔ ہماری فضا تو چینی کی گڑیا جیسی تھی۔ سرخ و سفید نازک اور حسین۔ یہ کوئی ان کی ملازمہ ہوگی۔ فضا نہیں ہے نا۔ فضا تو کالج ٹرپ کے ساتھ گئی ہے نا۔ عاکف پچھلے ہی کہہ رہے تھے نا۔“

وہ گاڑی کے پچھلے وہیل کے پاس زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور دیوانوں کی طرح روتے ہوئے زور زور سے بولنے لگی۔

”عاکف! تایا جی بڑھاپے اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔

ایمن نے ہاتھ بڑھا کر ہڈیوں کے اس پنجر کو چھونا چاہا پھر ڈر کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔  
”تم نے تم نے یہ کیا کیا ہمارے ساتھ؟“ اسے تایا جی کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ سر اٹھا کر دیکھنے لگی گاڑی

کے پاس ہی عاکف چچا سر جھکا کر کھڑے تھے تایا جی قدم گن گن کر ان کی طرف بڑھا رہے تھے۔  
”اے ہی خون کا تم نے اس طرح قتل کیا۔ تم نے اسے نہیں مارا۔ تم نے ہمیں زندہ زمین میں گاڑ دیا ہے۔ ساری زندگی کے لیے شرمساری اور ندامت کو ہمارا مقدر بنا دیا ہے۔ تم دولت کے پجاری۔ آنکھوں کے اندھے بے ایمان۔ دھوکے باز۔ ننگ خاندان۔ تم ہی یہ سب کر سکتے تھے۔ تم ہی مجھے بتا رہے تھے تم اس سے زیادہ گریہ نہیں کر سکتے تھے۔ تم نے ہمیں مار دیا جیتے جی۔ ان شیعوں کی دنیا اجاڑ کر کیا ملا تمہیں؟ کتنے لاکھ کمالے تم نے۔ یہ ظلم کما کر۔ تجھے رحم کیوں نہ آیا عاکف! تجھے رحم کیوں نہ آیا۔ تو نے پھولوں سی ہماری بچی کو پتی پتی کر کے بکھیر دیا۔ ظالم آندھیوں کے حوالے کر دیا۔ عاکف تو۔۔۔“

ان کے منہ سے کف اڑنے لگا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر تڑا تر عاکف چچا کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔  
ان کے منہ سے کف اڑنے لگا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر تڑا تر عاکف چچا کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔

بے حس بنے ان سے تھپڑ کھاتے رہے ایک دو تین نامعلوم کتنے۔  
”تو نے ہمیں کہیں کانہ چھوڑا۔ تو اتنا ظالم اتنا سفاک ہو گا یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تو نے اپنے ماں جانے کے خون کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ عاکف تیرا دل نہ کانپا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ کچھ بھی نہ۔ کیسے یہ کالا منہ لے کر سکندر کے سامنے جانے لگا۔ تجھے خدا سے بھی ڈر نہیں لگا۔“ ان کے ہاتھ رک نہیں رہے تھے اور عاکف چچا کھڑے پٹ رہے تھے۔

”ابو جی! بس کریں۔ دفع کریں۔ ان کا زندہ رہنا ہی اب ان کے لیے سزا ہے، ہم اور آپ انہیں جو بھی سزا دی

گے۔ وہ ان کے لیے نجات ہوگی ان کی سزا اور والا تجویز کرے گا۔ آپ انہیں چھوڑ دیں۔“

ولید نے باہر نکل کر تایا جی کے ہاتھ پکڑ لیے۔ وہ جیسے بے دم ہو کر ولید سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگے۔  
ولید انہیں گلے سے لگائے تھپائیں دینے لگا۔ کچھ دیر رونے کے بعد جیسے ان کا جی ہلکا ہو گیا۔

”چلیں ابو! چلتے ہیں سوئے چاندی کے محل میں کچھ دے سکتے ہیں۔ ایسا زخم جسے ہم تاجر بھرتے رہیں

چلیں۔“ وہ انہیں تھام کر گاڑی تک لے آیا۔  
”چلو ایمن! اندر بیٹھو۔“ اس نے جھک کر ایمن کا ہاتھ پکڑا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ولید! یہ فضا نہیں ہے نا؟“ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ کر بولی۔  
”ہاں یہ فضا ہی جی بڑھاپے کی ہے۔ اب یہ ہماری نازاں کا وہ سلگتا آنسو ہے۔ جو تمام عمر ہماری

ہاں یہ فضا ہی جی بڑھاپے کی ہے۔ اب یہ ہماری نازاں کا وہ سلگتا آنسو ہے۔ جو تمام عمر ہماری

کو جھلسائے گا مگر ٹپکے گا نہیں چلو بیٹھو۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”دیکھو فضا! میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں تمہیں لینے ضرور آؤں گی۔ دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ تم کچھ بولتی کیوں نہیں۔ فضا! تمہیں پتا ہے ہم تمہیں کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ تمہیں نہیں پتا نا۔“ وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔

”ہناؤں؟“ اس کا لہجہ شوخ سا تھا اور چہرہ سپاٹ۔

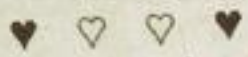
”ہم تمہیں ماما پاپا کے پاس لے کر جا رہے ہیں، اپنے گھر۔ فضا تم انہیں بہت مس کرتی تھیں نا۔ اب سب سے پہلے تم ہی ان سے ملو گی۔ ان سے ملو تو ان سے یہ ضرور پوچھنا۔ ہمیں دنیا کے بے درد ہاتھوں میں کھلونا بنا کر انہوں نے اپنی الگ دنیا کیوں بسائی۔ فضا! تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا۔ تم رورہی ہو۔ نہیں اب نہیں رونا۔ اب تو سارے دکھ ختم ہو گئے۔ اب تو تمہیں سکون مل جانا چاہیے۔ اب نہیں رونا میری جان۔ میری گڑبا لیمائی چندا اب نہیں رونا۔“ وہ اس کے چہرے پر اپنا چہرہ نکا کر رونے لگی۔

”اب تم نہیں روؤ گی۔ اب ہم رو میں گے روتے رہیں گے تم تو اپنے سارے دکھ اپنے سینے میں چھپا کر جا رہی ہونا۔ ہمیں کون بتائے گا، تمہیں کیا ہوا تھا۔ اب تمہارے ان جانے دکھوں کو یاد کر کے ہم رویا کریں گے۔ فضا ہم۔“ وہ روئی جا رہی تھی۔

ولید نے آنکھیں صاف کر کے گاڑی اشارت کر دی۔

اس نے فضا کے ہاتھ پکڑ کر چومنے شروع کر دیے۔ بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی یا ہڈی میں ایک انگوٹھی تھی۔ تین خوبصورت جگمگاتے ہیرے اس میں جڑے تھے۔ انگوٹھی کے چھلے کو دھاگا پلیٹ پلیٹ کر تنگ کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ انگلی میں ڈھیلی تھی۔ وہ انگوٹھی کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

عاکف چچا اسی طرح بت بے کھڑے تھے اور کارڈور کی سیڑھیوں پر کھڑی نرگس آنٹی نے انہیں جاتے دیکھ کر سکون بھرا سانس لیا اور اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ دور کھڑے سب ملازمین کی آنکھیں بھی اشک بار تھیں۔ گیٹ سے نکلتے ہی ولید نے گاڑی کی اسپید بڑھا دی۔



کراچی ایئر پورٹ پر وہ فضا کی میت سمیت باہر آئے تو ابراہیمائی ایمر بو لینس اور اپنی گاڑی لیے ان کے منتظر

کھڑے تھے۔  
”چلو بیٹا! گاڑی میں بیٹھو۔“ تایا جی نے اس کے سر سے ڈھلا دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔

”تایا جی! ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ اب بر سکون سی تھی۔

”اپنے گھر بیٹا اور کہاں؟“ نائی جی پہلے ہی گاڑی میں جا بیٹھی تھیں۔

”نہیں۔ ہم فضا کو اپنے گھر لے کر جائیں گے۔ اپنے ماما پاپا کے گھر۔ وہ وہیں سے رخصت ہوگی۔ میں اسے

کس اور نہیں لے کر جاؤں گی۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔  
”ایمن بیٹا! ہم ادھر کیسے لے جا سکتے ہیں۔ ادھر تو کرائے دار۔“ وہ ذرا عاجزی سے بولے۔

”میں نے کہا نا کہ ہم فضا کو ادھر ہی لے کر جائیں گے، ورنہ میں ساری عمر اسے لیے بیٹھ کر رہوں گی۔“ وہ اپنے بچپن کے ضدی لہجے میں بولی۔  
”ایمن! ایسے نہیں کرتے۔“ وہ پیار سے بولے۔

”جس کے ساتھ ایسے ہوتا ہے وہ ایسے ہی کرتے ہیں۔ میں نے جو کہا ہے وہی کروں گی جائیں آپ۔“ وہ چیخ کر

اپنے منہ سے اسے دیکھ کر بغیر اسی طرح آؤٹ ہو جایا کرتی تھی۔ ولید تایا جی کو پکڑ کر ایک سائیڈ پر لے گیا۔



پھر دو گھنٹے بعد تایا جی اسے ولید کے ساتھ لینے آئے۔  
ان کا گھر ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ ہاں اینٹ پتھر کے گھر ویسے ہی رہتے ہیں، صرف انسان ٹوٹ  
پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔  
عیسرہ اور غزالہ آنٹی پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ فضلہ کی ڈیڈ باڈی اسی جگہ رکھی گئی تھی جہاں آج سے اٹھارہ سال  
قبل سکندر اور مسز سکندر کے جنازے پڑے تھے۔ آہستہ آہستہ لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔  
”بیٹا! جنازے کا کون سا ٹائم اناؤنس کریں؟“ وہ سر جھکائے فضلہ کے پاس ہی بیٹھی تھی جب تایا جی نے اس سے  
پوچھا۔

”جب مون آجائے گا تب۔“ وہ سکون سے بولی۔  
”مون!“ تایا جی نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔  
”نوں تو کر دیا ہے سفینہ کو لیکن وہ کہہ رہی تھی کہ ٹکٹ اتنی جلدی نہیں ملے گا ایک دو روز لگ جائیں گے۔“  
وہ تھمل سے بولی۔  
”جب تک مون نہیں آئے گا۔ ہم فضلہ کو یہیں رکھیں گے۔ آپ بتادیں سب کو جا کر۔“ وہ فضلہ کی رخ ٹھنڈی  
پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

تایا جی اسے ایک نظر دیکھ کر ہار نکل گئے۔  
”فضلہ! تمہیں پتا ہے نا۔ آج تمہاری سالگرہ ہے۔ دیکھو کتنے لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ فضلہ! ایسا کیوں ہوا  
ہے جس موقع کو ہم بہت یادگار طریقے سے منانا چاہتے ہیں۔ وہی ہماری یادوں کے لیے ناسور بن جاتا ہے۔  
فضلہ! تم نے اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کیسے کر لیا۔ ہم سے ذرا بھی نہیں پوچھا۔ ماما مجھے تم سب کا خیال رکھنے کو کہہ گئی  
تھیں۔ سوری فضلہ! تمہاری بے بس آپی تمہارے لیے کچھ بھی نہ کر سکی کچھ بھی۔“  
وہ اس کے پانگ سے سرخ کر رونے لگی، عبیدہ نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ مون سفینہ پھوپھو کی فیمل  
کے ساتھ رات تین بجے پہنچا تھا۔

اونچا لمبا، وجیہ مون اس کے قصور سے بڑھ کر جوان نکلا تھا۔ وہ فضلہ کے پاس کتنی ہی دیر سر جھکائے کسی ٹوٹ  
ہوئی شاخ کی طرح بیٹھا رہا تھا۔  
اگلی صبح سات بجے جنازہ اٹھالیا گیا۔

”فضلہ! میں تمہیں اس لیے تو نہیں لے کر آئی تھی کہ پھر تمہیں ہمیشہ کے لیے کھودوں۔ فضلہ! میں تو تمہیں  
ہمیشہ کے لیے یہاں اپنے پاس رکھنے کے لیے لائی تھی۔ دیکھو ہم سب اپنے گھر میں ہیں۔ ماما بابا کے گھر میں  
ایک ساتھ۔ فضلہ! نہ جاؤ۔ فضلہ نہ جاؤ۔ تمہاری ایسی آپی تمہیں یاد کر کے مرجائے گی۔ فضلہ! آجاؤ ہم  
رہیں گے ہمیشہ اکٹھے اب کوئی ہمیں نہیں بانٹ سکے گا۔ کوئی ہمیں تقسیم نہیں کرے گا۔ میں اب کسی کو ایسا  
کرنے دوں گی۔ ہمارا مضبوط توانا بھائی ہمارے ساتھ ہے فضلہ! اب تو کوئی ڈر نہیں پھر تم ہمیں تقسیم کر کے  
جاری ہو۔ پھر ہمیں اوروں کو رکھ دے۔ فضلہ! آجاؤ فضلہ! آجاؤ۔ مون اسے روکو۔ عبیدہ اسے روک لو۔“

وہ اس کے گھٹن میں لپٹے ہوئے ابھی نہیں ہو رہی تھی۔ عبیدہ اور غزالہ آنٹی نے اسے کھینچ کر اسے  
لگایا۔ کلہ شہادت کی آوازوں کے ساتھ ایک تشنہ روح کو اس کی آخری آرام گاہ تک لے جانے کے لیے  
کھینچا اور اسے آواز میں ویسے ویسے بے ہوش ہو گئی۔

”یہ کیا تم نے اس احسان فرما دیا اور پھر ہرگز دانی کو کیا حرکت کی ہے اس نے شادی سے  
بے خبری سے اسے لے لیا۔“

سارہ کو طلاق بھجوا دی ہے۔ ہائے کیا غضب ہو گیا۔ عاکف! سنتے ہو۔ ہماری ناک کٹ گئی۔ ہم کہیں کے نہیں  
رہے۔ اس نے کس جنم کا بدلہ لیا ہم سے۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اب تو گھر میں مہمان بھی  
آنا شروع ہو گئے ہیں۔ سب انتظامات مکمل ہیں۔ ہم لوگوں کو کیا بتائیں گے اور تمہارے اس ملعون بیچرنے طلاق  
نامہ سب کے سامنے کھول کر پڑھ دیا ہے۔ ہم تو کوئی کمائی بھی نہیں گھر سکتے اور میرے خدا۔ یہ کیا ہو گیا ہمارے  
ساتھ۔“

زرگس آنٹی چیختی روتی کمرے میں داخل ہوئیں۔ عاکف پچھلے حیرت سے انہیں دیکھا۔  
”یہ یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ کہاں جا رہے ہو تم؟“ وہ حیرت سے عاکف کو دیکھ کر بولیں۔ وہ بلیک ٹوپس پہنے  
کھڑے تھے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔

”مجھے سگاپور جانا ہے۔ نہیں وہ فضلہ کو کراچی لے کر جانا ہے۔ کراچی کا ٹکٹ نہیں مل رہا۔ میں نے ادھر ہی  
رکھا تھا۔ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم ڈھونڈ دو۔ فضلہ ناراض ہو جائے گی۔ بھائی جان نے بلایا ہے اسے۔ ورنہ وہ  
خود آجائیں گے، لیکن میں کیسے جاسکتا ہوں۔ مجھے تو آج یو کے جانا ہے وہاں کارپروڈکشن میجر بڑی گڑبڑ کر رہا ہے۔  
لیکن کل تو سارہ کی رحمتی ہے، میں کیا کروں۔ زرگس! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ وہ بے بسی سے دونوں  
ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئے۔

”تمہیں پتا ہے فضلہ مر گئی ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ اس کی طبیعت اتنی خراب ہے کہ وہ مرجائے گی۔  
میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا، مگر اب کیا کروں، میرے پاس تو ٹائم ہی نہیں ہے۔ فلائٹ کا وقت ہو چلا ہے۔  
تم آج آفس نہیں جاؤ گی۔ مل میں ہڑتال ہے نا۔ مجھے پرواز رزرو سے بھی ملنا ہے۔ فضلہ کا آج جنازہ ہے، نہیں۔ وہ تو  
ادھر کو اڑ رہی ہیں میرا انتظار کر رہی ہے۔ اسے کراچی جانا ہے، مجھے ٹکٹ نہیں مل رہا۔“ وہ اٹھ کر کمرے کی چیزیں  
اٹھا اٹھا کر ٹکٹ ڈھونڈنے لگے۔

”یا اللہ یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ عاکف کا پاگل پن بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمیں کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔  
پرسوں رات مل میں آگ لگ گئی۔ لاکھوں کروڑوں کا نقصان ہو گیا۔ آج سارہ کی طلاق۔ اوبائی گاڈ میں کیا کروں۔  
گدھر جاؤں؟ کیسے یہ حالات سنبھالوں؟“

وہ سر پکڑ کر بستر پر گر گئیں۔ عاکف اب صوفوں کو الٹا کر کے ٹکٹ ڈھونڈ رہے تھے۔ زرگس انہیں پھٹی پھٹی  
آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔

♥ ♥ ♥ ♥  
میرے راستے میں شجر کوئی نہ تھا  
سائے تھے ہمراہ اور بشر کوئی نہ تھا  
دریا شہروں کی حد تک اٹھ آئے ہیں  
اور لہروں کا ہم سفر کوئی نہ تھا  
شہر شناسائی میں محبت کی نظر کوئی نہیں  
پھولوں کے شہر میں خوشبو کا گھر کوئی نہ تھا

چالیسویں کے بعد تائی جی اسے لے جانے آئیں۔  
”تائی جی! اب ہم یعنی میں، عبیدہ اور مون یہیں رہیں گے، اپنے گھر میں، گرے کلر کے کائٹن کے سوٹ میں  
دوبلہ سر سے لپیٹے وہ کلا مپاک پڑھ رہی تھی۔ تائی جی کی بات سن کر اس نے قرآن شریف بند کر دیا۔



”تم اکیلے ادھر کیسے رہ سکتے ہو۔“ تائی جی کچھ حیرت سے بولیں۔

”ہم تین ہیں۔ اکیلے نہیں اور پھر اپنے گھر میں کوئی اکیلا نہیں ہوتا۔“ وہ بولی۔

پھر سارے خاندان نے مل کر زور لگایا۔ لیکن اس کی ”ناں“ ہاں میں نہ بدلی۔

”ہم یہیں رہیں گے۔ میں جاب کر لوں گی، ہم رہ لیں گے۔“ سفینہ پھوپھو غزالہ آنٹی، تائی جی، تائی جی کس کس نے اسے نہیں سمجھایا مگر وہ نہ مانی۔ آخر سب تھک کر چلے گئے۔ وہ تینوں گھر میں اکیلے رہ گئے۔ مون کا موٹا کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اندر کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ عبیدہ کچن میں چلی گئی اور وہ وہیں صوفے پر بیٹھی ماما پاپا کی تصویر کو ٹکٹلی باندھ کر دیکھنے لگی۔

ایک، دو، تین، چار پورے پانچ دن گزر گئے۔ کوئی نہیں آیا اور اسے تو کسی کا انتظار تھا بھی نہیں۔ البتہ مون بہت چپ چاپ تھا اور کچھ اکھڑا اکھڑا بھی۔ عبیدہ بھی خاصی خاموش تھی۔ وہ تو چار دنوں سے بند کمرے میں بڑا سامان لالا کر گھر میں سجا رہی تھی۔ عبیدہ اس کی مدد کر رہی تھی۔ لیکن مون کو جیسے کسی کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

شام کو ولید آگیا۔

”امی باتھ روم میں گر گئی ہیں۔ کولے کی ہڈی پر شدید ضرب آئی ہے۔ ہاسپٹل میں ہیں۔ تمہیں یاد کر رہی ہیں۔“

وہ شوکیں میں کرا کر رہی تھی جب ولید نے آکر کہا۔ وہ کچھ دیر کو ذرا سی پریشان ہوئی۔ تائی جی سے تو پہلے ہی اٹھا بیٹھا نہیں جاتا تھا۔

”اچھا۔ میں کل آجاؤں گی انہیں دیکھنے۔ ابھی تو ادھر اتنی مصروفیت ہے کام ہی بہت ہے۔“ وہ مصروف لہجے میں برتن سجاتے ہوئے بولی۔

ولید کچھ غصے میں کھڑا اس کی بے کاری مصروفیت کو دیکھتا رہا۔ پھپاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔

اسی وقت مون اور عبیدہ تیار ہو کر آگئے۔

”چلو امی! ہم تائی جی کو دیکھنے جا رہے ہیں۔“ عبیدہ بولی۔

”سارا گھر بکھرا پڑا ہے۔ یہ کام چھوڑ کر میں تائی جی کو دیکھنے چل پڑوں، کل جاؤں گی۔ آج مجھے ڈرائنگ روم سیٹ کرنا ہے۔“ وہ اسی لہجے میں بولی۔

”امی! عبیدہ کچھ غصے سے بولی۔

”اچھا۔ ہم جا رہے ہیں، چلو مون! تم تو بے حس ہو گئی ہو۔“ وہ کہہ کر ہر نکل گئی۔

”تائی جی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم رات ہاسپٹل میں ہی رہیں گے۔ تم رہ لو گی نا۔“ آدھے گھنٹے بعد عبیدہ کا فون آگیا۔

”ہاں رہ لوں گی۔ اپنے گھر میں کیسا ڈر؟“ وہ پورے اعتماد سے بولی۔ اس نے فون بند کر دیا۔

”تائی جی کو اس کا مطلب ہے۔ زیادہ چوٹ آئی ہے۔ خیر کل جاؤں گی۔“ وہ کہتے ہوئے کچن کی طرف مڑ گئی۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ رات اس کی زندگی کی خوفناک ترین رات بن جائے گی، اور اس کا اپنا گھر اس کے لیے بھوت بنگلہ بن جائے گا۔ رات کے دس بجے لائٹ چلی گئی۔ ہر طرف گھنگھور اندھیرا چھا گیا اور پھر اندھیرا اور سیاہی

مل کر اس کی روح قبض کر لے لے۔ کبھی اسے لگتا سیڑھیوں سے کوئی نیچے اتر رہا ہے۔ کبھی اسے لگتا۔ ماما اپنے کمرے سے سفید کفن پہن کر نکل رہی ہیں۔ بھی وہ دیکھتی پاپا اچھے بھلے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ یکایک ان کا سارا وجود خون آلود ہو جاتا ہے۔ پھر اسے لگتا فضا اسے آوازیں دے رہی ہے۔ وہ ہسپتال

منہ چھپا کر لیٹ گئی تو فضا مقفل کمرہ کھول کر اندر آگئی اور اس کا بازو کھینچنے لگی۔ اس کی چیخیں نکل گئیں تو فضا زور زور سے ہنسنے لگی۔ وہ کمرے سے نکلنے لگی تو کمرے کا دروازہ غائب ہو گیا۔ وہ دیواروں سے ٹکرانے لگی۔ اس کا سر زخمی ہو گیا۔ وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی، رات کے دو بجے لائٹ آگئی روشنی میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ ہاں اس کا سر درد اور تکلیف سے پھٹا جا رہا تھا۔

”میں تو کبھی بھی اتنی کمزور دل نہیں رہی، پھر رات مجھے کیا ہوا تھا؟“

ساری رات کی دعاؤں کے بعد جیسے ہی پوچھنی۔ وہ باہر برآمدے کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گئی۔

سات بجے جب ولید عبیدہ کو گیٹ پر اتار کر گیا۔ ایمن تنہائی، خوف اور سناٹے کے ہاتھوں ادھ موٹی ہو چکی تھی۔

”مون تو سفینہ پھوپھو کے ساتھ ان کی منڈ کے گھر چلا گیا۔ ایک دو روز ادھر رہے گا۔ تائی جی اب کچھ بہتر تھیں۔ مجھے تمہاری فکر تھی۔ اسی لیے صبح صبح آگئی۔ تم ٹھیک ہونا، یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ اسے اپنی آواز بھی اجنبی لگی۔ ”مون کیوں چلا گیا اسے پتا نہیں تھا کہ ہم ادھر اکیلے ہیں۔“ وہ کچھ حلقی سے بولی۔

”ایمن! تم اس قدر بے وقوف تو نہیں ہو، جیسی آج کل حرکتیں کر رہی ہو۔“ عبیدہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب؟“ وہ بگڑ کر بولی۔

”ایمن! اتنے دنوں میں تمہیں مون کے روتے کو سمجھ جانا چاہیے تھا۔ وہ اب اس گھر کا نہیں، پھوپھو کے گھر کا لیکن بن چکا ہے۔ ان کا بیٹا۔ زندگی کی آسائشات کا عادی۔ وہ اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ تم نے اس کے تئیں نہیں دیکھے۔ اس کا رویہ تو بہت کچھ سمجھا دینے والا ہے۔ پھر تم اتنا بڑا فیصلہ کس بنیاد پر کر رہی ہو۔ وہ پتا نہیں کس کے لحاظ میں چپ ہے وہ ادھر اپنی زندگی میں پوری طرح سے سیٹ ہے پھر اس کی اسٹڈیز کا حرج ہو رہا ہے۔ اس کے کیریئر کا مسئلہ ہے یہاں رہ کر وہ کیا کرے گا۔ پھوپھو کا ارادہ اسے نینال سے بیاہنے کا ہے بلکہ پھوپھو سے زیادہ وہ خود نینال میں انٹر سٹڈ ہے۔ تم اسے روک سکو گی؟“

ایمن! تم اس حقیقت کو کیوں مان نہیں لیتیں کہ جو وقت گزر جاتا ہے وہ ہماری گرفت سے نکل جاتا ہے۔ پھر ہم لاکھ سرچشیں اسے واپس نہیں لاسکتے، ماما پاپا کے ساتھ زندگی بتانے والے دن ہماری گرفت سے ہماری زندگی سے نکل چکے ہیں، اگر اب تم انہیں واپس لانے کی کوشش کرو گی تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ ان لوگوں کا خیال کرو۔ جنہوں نے ہمیں اس المناک حادثے کے بعد سنبھالا ہے۔ اب انہیں ہماری ضرورت ہے۔“

”کیا سنبھالا ہے ہمیں بانٹ کر۔ ایک دوسرے سے اس قدر دور دور کر دیا کہ ہم چاہیں بھی تو پاس نہیں آسکتے۔“ وہ تیزی سے عبیدہ کی بات کاٹ کر بولی۔ ”فضہ کہاں گئی؟ کیوں گئی؟ تمہیں معلوم ہے نا ہمارے اپنوں کی مہربانیاں ہیں یہ احسان ہیں ان کے ہم پر۔“

”ہاں احسان ہی ہے ان کا۔ شکر کیوں نہیں کرتیں کہ انہوں نے ہمیں کسی یتیم خانے میں نہیں ڈال دیا۔ کسی دارالامان میں نہیں پھینک دیا۔ فٹ پاتھوں کے حوالے نہیں کر دیا۔ کل کو مون کا شاندار مستقبل ہو گا۔ تائی جی اور تائی جی نے پھوپھو کے سامنے تمہیں ولید بھائی کے لیے مانگ لیا ہے۔ ان دونوں کو اس گھر کو اب تمہاری ضرورت ہے۔ غزالہ آنٹی نے اتنے خراب حالات کے باوجود مجھے اعلا تعلیم دلوائی۔ یہ ان کا احسان ہے۔ ان لوگوں نے ہماری بہتر تعلیم و تربیت کی۔ کیا یہ احسان نہیں، وہ یہ سب نہ کرتے۔ ہم ان کا کیا باز لیتے۔“



”کیا احسان ہے اس گھر کا کرایہ کھاتے رہے ہیں تاجی اور تمہارے ساتھ کیا کیا غزالہ آنٹی نے؟ تمہارا بیوچر تباہ کر دیا انہوں نے۔ اگر ان کی کسی بیٹی کا میرٹ بنا ہوتا کیا وہ سر دھڑا کر کے اسے داخلہ نہ دلواتیں۔ فضلہ کا کیا حال ہوا۔ مون کی ہمارے ساتھ بے کسی کا سبب کون ہے؟“

”تاجی ہاؤس بلڈنگ والوں کا قرض ادا کرتے رہے ہیں جو ابھی تک ادا نہیں ہو پایا۔ غزالہ آنٹی کیا کرتیں۔ پانچ بیٹیاں ہیں ان کی۔ اول تو وہ میری سرپرستی سے ہی انکار کر سکتی تھیں۔ انہیں کون مجبور کر سکتا تھا۔ یہ ان کی مہربانی ہے اور مجھ اکیلی کی خاطر کیا وہ ان پانچوں کو مار دیتیں۔ میں تو ان کا یہ احسان بھی نہیں اتار سکتی۔ انہوں نے اپنے وسائل سے بڑھ کر مجھ پر خرچ کیا ہے۔ ایسی! اگر میں ضد کرتی تو کیا ہوتا۔ ماما پاپا کی تربیت کو ان کے خون کو بدنام کرتی۔ مرے ہوؤں کا بھلا زندوں پر کیا حق رہ جاتا ہے۔ ایسی! زندگی کے حقائق بہت تلخ ہیں۔ انکل جمال اور غزالہ آنٹی جس طرح سفید پوشی کا بھرم رکھ رہے ہیں یہ ان کا حوصلہ ہے، پھر بھی انہوں نے مجھے بھی برا بھلا یا بوجھ نہیں گردانا اور تھوڑا بہت تو والدین بھی ڈنڈی مار رہی جاتے ہیں۔ کیا پتا ماما پاپا زندہ ہوتے وہ ہمارے لیے یہ سب کچھ بھی افورڈ نہ کر سکتے پھر تم کس کو الزام دیتیں؟“

تاجی جی نے کیا تمہارے ساتھ بہت برا کیا؟ انہوں نے تمہاری اچھی تربیت کی برا بھلا خیال رکھا۔ اب رات سے ان کی زبان پر تمہارا نام ہے۔ تمہیں یاد کر رہی ہیں ان کی محبتوں کا یہی صلہ ہو گا۔

ایسی! کبھی کون نہیں ہے یہاں۔ تاجی جی تمہارے خیال میں خوش ہیں بیٹے کی بے وفائی کا داغ لگا ہے انہیں۔ غزالہ آنٹی ساری زندگی معاشی حالات سے جنگ لڑتی رہی ہیں بیٹے کو ترسی ہیں۔ سفینہ پھوپھو کو اولاد نہ نہ ہونے کا دائمی غم ہے۔ انہوں نے اس طرح مون کا خیال رکھا ہے کہ کہیں وہ انہیں چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ ہمارے ماں باپ ہم سے پچھڑ گئے۔ وہ قدرت کا فیصلہ تھا فضلہ کا اس طرح جانا بھی حکم رتی تھا۔ ہم تم اسے نہیں ٹال سکتے تھے۔ وہ ہمارے پاس رہتے ہوئے بھی اسی طرح مر سکتی تھی۔ تم ان حقائق سے نظریں نہیں چڑا سکتیں۔ تم اپنے ہی غم کو محور بنا کر اس کے گرد گھوم رہی ہو دو سروں کی طرف بھی تو دیکھو وہ کن عذابوں سے گزر رہے ہیں اور ہم ان کے غم کو کیسے کم کر سکتے ہیں۔

اور اگر ان سب حقائق کے باوجود تم صرف اپنے ہی غم کو سینے سے لگا کر جینا چاہتی ہو تو تم سے بڑا خود غرض کوئی نہیں اور خود غرضی ہمیشہ بے سکونی دیتی ہے۔ دلی سکون تو قربانی اور احساس میں ہے۔ جو گزر گیا اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر بھول جاؤ۔

ایمن! جب تقدیر میں ایک محرومی لکھ دی جاتی ہے تو بہت سی محرومیاں خود بخود مقدر بن جاتی ہیں جیسے ایک نعمت ملتی ہے تو بہت سی نعمتیں خود بخود چلی آتی ہیں دولت ملتی ہے تو رزق کی فراوانی اور عیش بھی چلا آتا ہے۔ ماں باپ سے محرومی پر ہمیں بہت سی محرومیاں خود بخود مل گئیں اور جو تقدیر کے لکھے سے صلح کر لیتا ہے۔ وہ بہت کم رنج اٹھاتا ہے۔ ہاں آئندہ کے لیے عہد کر لو کہ جو زیادتیاں انجانے میں یا جانے میں دو سروں نے ہم سے کی ہیں ہم کسی سے نہ کریں۔ ایسی! محبت میں سکون ہے۔ اس طرح غم کو سینے سے لگانے سے خدا بھی ناراض ہوتا ہے۔ ہم تو مسلمان ہیں۔ تقدیر پر یقین ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔

پتا نہیں اس نے اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھی تھیں۔

”تو کیا اس گھر کو پھر ویران کر دوں۔ کیا ہماری تقدیر میں یہی لکھا ہے، ہم اس کو بدلنے کی کوشش نہیں کر سکتے۔“

”ہاؤس بلڈنگ والوں کے جو اجابات تھے۔ وہ زبیر انکل نے ادا کر دیے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ اس گھر کی قیمت لگا کر تین حصے کر دیں گے۔ میرا اور تمہارا حصہ ہماری شادیوں میں لگا دیں گے۔ میں نے اپنے حصے کی رقم غزالہ آنٹی کو دینے کا فیصلہ کیا ہے اور زبیر انکل یہ گھر خود خرید کر اسے مون کے نام کر دیں گے۔ تین سالوں بعد اس

## قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی بنی مسعودت میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پرفرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے رستی سے محفوظ رکھیں

کی تعلیم مکمل ہو جائے گی تو وہ ادھر رہی آکر رہے گا۔ یہ گھر اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آباد ہو جائے گا۔ ہمارا بھائی اسے آباد کرے گا ہمارے لیے۔ ایسی! ٹھیک ہے نا؟ یہی ہونا چاہیے تھا نا؟“ وہ اس کا چہرہ انگلی سے اٹھا کر بولی۔

”ہاں اور تین سال یہ بند رہے گا۔“

”نہیں سفینہ پھوپھو اب ادھر رہیں گی۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی کرنی ہے اور میں اور تم بھی پھوپھو کے ساتھ رہیں گے۔ تمہاری رخصتی تک یعنی چار پانچ ماہ تک تم ادھر رہ سکتی ہو۔“ وہ ذرا سا ہنسی۔

”یہ کس کے فیصلے ہیں مجھ سے بالا ہی بالا۔“ وہ تنک کر بولی۔

”ہمارے بڑوں کے اور میں نے تمہاری نمائندگی کرتے ہوئے ہاں بھری ہے۔ ایسی! میں نے ٹھیک کیا ہے نا۔ تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے نا؟“ وہ معصوم شکل بنا کر بولی تو وہ چپ رہی۔

”ایسی! میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی، اگر تمہیں ان فیصلوں پر اعتراض ہے تو یقین کرو۔ میں تمہارے ساتھ اکیلی یہاں رہنے کو تیار ہوں۔“

”نہیں عبیرہ! اکیلا یہاں نہیں رہا جاسکتا۔ میں ساری رات ڈرتی رہی ہوں۔“ وہ فوراً بولی۔

”تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ان سب فیصلوں پر؟“ وہ جلدی سے بولی۔

”نہیں۔“

”گڈ! میں نے بھی سب سے یہی کہا تھا کہ ایسی! مان جائے گی۔ چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ولید بھائی ہمیں گیارہ بجے لینے آئیں گے۔“

”ولید اندر کیوں نہیں آیا؟“ اسے یاد آیا۔

”وہ تم سے ناراض ہیں۔ کل شام جو تمہارا رویہ ان کے ساتھ اس قدر خشک تھا۔“ وہ بولی۔

”اووہ! وہ ہنس پڑی۔“ وہ تو یونہی میں اسے چڑا رہی تھی۔

”ایسی! ولید بھائی اچھے ہیں نا؟ تم خوش ہونا۔“ عبیرہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں کیونکہ میں ولید کے مزاج کو سمجھتی ہوں اور ویسے بھی اب میں تاجی جی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ان کی خدمت کی عادت جو بڑ گئی ہے۔ چلو ناشتہ کر کے ہاسپٹل چلتے ہیں مجھے کل ہی جانا چاہیے تھا۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کل جاتیں تو عقل کیسے آتی۔ وہ تو آج آئی ہے۔“

”عبیرہ ہنس کر بولی تو وہ اسے گھورنے لگی۔“

”عبیرہ کی بچی!“ وہ یہی کہہ سکی۔

دونوں اٹھ کر اندر چلی گئیں اور اسے یقین تھا ان فیصلوں سے سب سے زیادہ ماما پاپا کی روحیں خوش ہوئی ہوں گی۔ غموں کو بھلا دینے میں ہی سکون ہے۔ خدا کے فیصلوں پر راضی ہونے سے کتنا سکون ملتا ہے۔ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا جو بکا پھلکا ہو کر جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

